



# مقالات

جلد اول

از  
پیر محمد کرم شاہ لازیہری  
(سجادہ نشین بہیرہ)

مرتبہ  
پروفیسر حافظ احمد بخش

ضیاء القرآن پبلی کیشنز  
۹ الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور

86520

690220

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

مقالات (جلد اول)	کتاب
از پیر محمد کرم شاہ صاحب الازہری	مرتبہ
پروفیسر حافظ احمد بخش (ایم۔ اے)	اشاعت اول
جنوری ۱۹۹۰ء	تعداد
ایک ہزار	قیمت
۷۵ روپے	مطبع
اے کے زیڈ پرنٹرز۔ لاہور	

## ترتیب

۷	انتساب
۸	عرض ناشر
۱۱	حضرت ضیاء الامت ایک انقلاب آفریں شخصیت
۸۹	اسوۂ حسنہ
۱۰۱	حضور نبی رحمت بحیثیت معلم اخلاق
۱۲۱	سرور کائنات کا نظام اخلاق
۱۲۵	اتباع سنت نبوی قرآن کریم کی روشنی میں
۱۶۵	قرآن کتاب انقلاب
۱۸۵	اسلام دین فطرت
۲۱۲	عدل و انصاف قرآن کی روشنی میں
۲۵۷	حضورؐ کا معاشی انقلاب
۲۷۹	اسلام کا سیاسی نظریہ اور بیعت صدیقی
۳۱۷	فاروق اعظم اور اہل بیت
۳۴۸	اسلام اور تصوف
۳۸۳	اسلام میں تصوف کا مقام
۳۹۹	خواجہ شمس العارفین اور ان کا عہد
۴۴۵	حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی



# انتساب

دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف  
کے اُن غیور اور پر عزم فضلاء کے نام  
جو

حضرت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری  
مدظلہ العالی کے خونِ جگر کا ثمرہ ہیں۔

# عرض نامہ

مقالات ضیاء الامت جلد اول کا پہلا ایڈیشن آج سے تقریباً چھ سال پہلے ۱۹۸۲ء میں مولانا محمد عبید اللہ صاحب اور ان کے رفقاء نے منڈی بہاؤ الدین سے شائع کیا۔ مختلف علمی و تحقیقی موضوعات پر حضرت جسٹس پیر محمد کرم شاہ صاحب الازہری کے مقالات کا یہ انتخاب علمی دنیا میں ایک گراں قدر اضافہ تھا جس کے سبب ملک کے طول و عرض میں اس کتاب کو بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔

کتاب کی اہمیت کے پیش نظر مرکزی دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف کی مجلس مشاورت نے فیصلہ کیا کہ جلد اول کا دوسرا ایڈیشن اور جلد دوم ہر دو کتب "ضیاء القرآن پبلی کیشنز" کی معرفت پورے اہتمام اور حسن طباعت کی جملہ رعایتوں کے ساتھ شائع ہونی چاہئیں۔ جس پر میں نے یہ ذمہ داری قبول کر لی۔ پوری کتابت نئے سرے سے کرائی گئی۔ اور کتاب کو دلاویز بنانے کے لیے جتنی کوشش ممکن تھی، میں نے سرانجام دی۔ چونکہ ادارہ کے وسائل اس دوران تفسیر ضیاء القرآن کی طباعت اور "جمال القرآن" کی اشاعت پر مرکوز رہے۔ اس لیے قارئین کو انتظار کے جانگس مراحل طے کرنا پڑے۔

امید ہے احباب معذرت قبول فرمائیں گے۔ اور جس طرح انہوں نے ضیاء القرآن  
پبلی کیشنز کی پہلی کاوشوں کو سراہا ہے اسے بھی قبول فرمائیں گے۔

پیرزادہ محمد حفیظ البرکات شاہ  
مینیجر ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور







حضرت سید الامت  
ایک انقلاب آفرین شخصیت  
پروفیسر عارف احمد شمس (ایم اے)





احیائے اسلام کے سلسلہ میں یوں تو بے شمار تحریکیں اس برصغیر پاک و ہند میں ابھریں اور اس کی ترویج و اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا، لیکن وہ فکری و روحانی انقلاب جس نے تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ وہ حضرت غوث العالمین بہار الحق والدین زکریا ملتانی اور سلسلہ چشتیہ کے مہر عالم تاب فرید الدین مسعود گنج شکر کی خانقاہ ہی تحریک کامرہون منت ہے۔ جہاں ایک طرف خلوتیان میکدہ اپنے سبوجہرتے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف جلو تیان مدرسہ کے کدو بھی خالی نہیں لوٹائے جاتے۔ یہ تحریک جس میں مدرسہ و خانقاہ ایک ہی سلسلہ کی دو حسین کڑیاں تھیں، کئی سو سال تک اپنی شان و شوکت اور اثر آفرینی کے سبب عالم اسلام کی توجہ کامرکز بنی رہی، یہاں تک کہ انگریزی استعمار نے جہاں اسلامی تمدن و ثقافت کے بعض دوسرے بنیادی عناصر کو نشانہ بنایا، وہاں یہ مقدس تحریک بھی ان کی منظم سازش سے نپچ سکی۔

مدرسہ اور خانقاہ کو ایک دوسرے کی ضد ثابت کرنے کے لیے زیر زمین سرگرمیاں جاری رہیں اور آہستہ آہستہ اپنا رنگ دکھاتی رہیں یہاں تک کہ بیسویں صدی عیسوی کے پانچویں دہے میں قوم کو انگریزی کی غلامی سے نجات تو مل گئی، لیکن اس کی نظر باقی یلغار برابر

جاری رہی۔

اسے حسن اتفاق کہا جائے یا ان اولیائے کاملین کی پر خلوص مساعی جمیلہ کا صلہ، اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کے مقدس مشن کو حیاتِ تازہ بخشنے کے لیے ایک ایسے مردِ کامل کا انتخاب فرمایا جو اگر ایک طرف حضرت غوث العالمین سے نسبی ششہ میں منسلک ہے تو دوسری طرف سلسلہ ارادت کے لحاظ سے خانوادہٴ چشت اہل بہشت سے مربوط۔

وہ مجمع بکریں... شخصیت جسے یہ سعادتِ عظمیٰ حاصل ہو رہی ہے وہ کون ہیں؟

وہ ہیں میری گفتگو کا عنوان

مفکرِ اسلام ضیاء الامت پیرِ محمد کریم شاہ الازہری

اس سے پہلے کہ میں اس فکری و اصلاحی تحریک کا مفصل جائزہ آپ کی خدمت میں پیش کروں میں چاہتا ہوں کہ حضرت ضیاء الامت کے خاندان اور حالاتِ زندگی کے بارے کچھ عرض کروں۔

خاندان

آپ کا سلسلہ نسب حضرت غوث العالمین بہار الحق والدین ابو محمد زکریا ملتانی سے جا ملتا ہے سلسلہ نسب یہ ہے:

پیر محمد کریم شاہ بن پیر محمد شاہ بن پیر امیر شاہ بن پیر شاہ بن شمس الدین بن عبداللہ شاہ بن محمد غوث ساکن بھیرہ بن غلام محمد حسین شاہ بن شیخ محمد بن شیخ محمود بن شیخ احمد بن شیخ نظام الدین بن شیخ شمس الدین لاہوری لقب کروری بن شیخ صدر الدین بادشاہ بن شہر اللہ صاحب سجادہ بن شیخ

یوسف بن شیخ عماد الدین بن شیخ رکن الدین سمرقندی بن صدر الدین حاجی  
 بن شیخ اسماعیل شہید بن شیخ الاسلام حضرت مولانا صدر الدین قسطل  
 عارف باللہ فرزند اکبر و خلیفہ الشیخ البکیر المنیر غوث العالمین شیخ الاسلام  
 بہار الدین زکریا الهاشمی الاسدی السہروردی الملتانی قدس سرہ العزیز۔  
 ”ابرکرم از گل محمدی“

### بھیرہ شریف میں آمد

حضرت غوث العالمین کے خاندان نے مرد زمانہ کے ساتھ ساتھ برصغیر پاک و ہند  
 میں مختلف مقامات پر حق کی شمعیں فروزاں رکھیں۔ ان مردان باصفا میں سے ایک مقتدر  
 شخصیت حضرت دیوان فتح شاہ صاحب لاہور سے بھیرہ منتقل ہوئے اور یہاں اس کے  
 رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع فرمایا۔ اس خاندان کی قدر و منزلت لوگوں کے دلوں میں ویسے  
 بھی کم نہ تھی بلکہ اس کی عزت و شہرت کا پرچم اس وقت انتہائی بلند یوں پر اُٹھا رہا تھا جب  
 حضرت پیر شاہ صاحب کے فرزند ارجمند حضرت پیر امیر شاہ صاحب ”شمس سیال“  
 کی تجلیات سے تیرہ و تار یک ماحول کو نور اسلام سے منور فرما رہے تھے، اللہ تعالیٰ  
 نے میدان فقر کے اس امیر کو تین فرزند عطا فرمائے:

① حضرت پیر محمد صدیق شاہ صاحب

② حضرت پیر محمد شاہ صاحب

③ حضرت پیر فتح شاہ صاحب

آپ نے اپنی نیابت کے لیے منجیلے صاحبزادے حضرت پیر محمد شاہ صاحب کو

منتخب فرمایا۔

## حضرت پیر محمد شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

اس مردِ مجاہد کا تعارف کرتے وقت فوراً حضرت علامہ اقبال کا شعر یاد آجاتا ہے

ہو حلقہٴ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

جہاں ایک طرف آپ کی قدآور شخصیت ”امیرِ جند اللہ“ کے روپ میں نظر آتی ہے

جو ایڈمنسٹریشن کی پوری صلاحیتوں سے آراستہ بھی ہے اور سطوتِ فاروقی کا مظہر اتم بھی ،

وہاں اللہ تعالیٰ نے آپ کو ظاہری حسن کی دولت سے بھی مالا مال فرمایا تھا۔ سرو کی مانند

رعناقد، چاند کی طرح روشن اور گول چہرہ جس پر ہمہ وقت ذکرِ الہی کے انوار برستے تھے۔

اور بقول شیخ عبدالغنی الزمرمی :

”میں نے حرمِ پاک میں لاکھوں آدمی دیکھے ہیں لیکن جو حسن و جمال میں

نے حضرت پیر محمد شاہ صاحبؒ بھیروی کے رُخِ انوار میں دیکھا ہے وہ

مجھے کہیں نظر نہیں آیا“

یوں تو آپ کے بے شمار کارنامے ملتِ اسلامیہ کے لیے باعثِ فخر ہیں، تحریک

پاکستان ہو یا جہادِ کشمیر۔ آپ ہمیشہ صفِ اول میں نظر آتے ہیں، لیکن وہ احسان جس کا امت

مسلمہ کبھی شکر یہ ادا نہیں کر سکتی، وہ ہے آپ کی خصوصی توجہ و تربیت کا نتیجہ!

”مفکرِ اسلام ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری کی شخصیت“

## ولادت باسعادت

آپ نساہاٹھی قریشی اور مسلکاً حنفی ہیں۔ ۲۱ رمضان المبارک ۱۳۳۶ھ بمطابق یکم جولائی ۱۹۱۸ء شب دو شنبہ بعد از نماز تراویح بھیرہ شریف میں آپ کی ولادت باسعادت ہوئی۔

نام  
پیر کھارا کوہستان نمک کے دامن میں ایک گاؤں ہے، جو حضرت پیر کرم شاہ المعروف ”ٹوپی والے“ کے فیض کی وجہ سے مرجع خلائق ہے۔

چونکہ اس جلیل القدر ہستی کے ساتھ آپ کے خانوادہ کی رشتہ داری بھی تھی، اس لیے آپ کے جد امجد حضرت پیر امیر شاہ صاحب نے انہی کی نسبت سے آپ کا نام محمد کرم شاہ رکھا۔

## کنیت

آپ کی کنیت ”ابوالحسنات“ آپ کے بڑے صاحبزادے محمد امین الحسنات شاہ جو پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد ان دنوں جامعہ عبدالعزیز مکہ مکرمہ میں زیر تعلیم ہیں، کے نام سے منسوب ہے۔

## تعلیم

آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی شہر بھیرہ ضلع سرگودھا کے اندر ہی حاصل کی ۱۹۳۶ء میں گورنمنٹ ہائی سکول بھیرہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنے والد محترم کے قائم کردہ ”دارالعلوم محمدیہ غوثیہ“ میں دینی تعلیم کا آغاز فرمایا۔ حضرت پیر محمد شاہ صاحب نے اس نجیب و سعید فرزند کی تعلیم کے لیے جو خصوصی انتظامات فرماتے، اس کی نظیر دور جدید میں مشکل سے ہی ملے گی۔ ابتداً مختلف علوم میں ماہر اساتذہ کی خدمات بھیرہ شریف



میں ” دارالعلوم محمدیہ غوثیہ “ میں ہی حاصل کی گئیں۔ مثلاً :

حضرت علامہ مولانا محمد قاسم صاحب

استاذ المناطقہ مولانا محمد دین صاحب بدھوی

استاذ المنقول و المعقول مولانا غلام محمّد صاحب ساکن پلاں ضلع میانوالی ،

کے علاوہ کئی اصحاب فن یہاں تشریف لاکر آپ کو پڑھاتے رہے۔ جو نہی کسی فن کی کوئی کتاب مکمل ہوتی، اس کے امتحان کے لیے اس فن کے قابل ترین استاد کی خدمات حاصل کی جاتیں۔

جب آپ نے علوم متداولہ کی تکمیل کر لی تو آپ کے والد معظم نے دورۂ حدیث کے لیے برصغیر پاک و ہند کی مختلف درس گاہوں کا جائزہ لیا اور ان لافانی ہستیوں کے متعلق معلومات حاصل کیں جو مخالف ہواؤں کے تند و تیز جھونکوں کے باوجود ملک کے اطراف و اکناف میں شمع اسلام روشن کئے درس حدیث دینے میں مشغول تھے نظر انتخاب عقل و عشق اور علم و طریقت کے حسین سنگم حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی قدس سرہ العزیز پر پڑھی۔

قابل ترین اساتذہ کی انتھک محنت اور آپ کے والد گرامی کی خصوصی توجہ سے آپ کی شخصیت کافی تک نکھر چکی تھی، لیکن حضرت صدر الافاضل کی آغوش تربیت نے صرف کا کام کیا۔ اور اس قطرۂ نیساں کو ایسا گوہر بنا ہوا کہ ایک خصوصی محفل میں خود ہی فرماتے ہیں :

” میں آج مطمئن ہوں کہ میرے پاس جو امانت تھی وہ میں نے موزوں فرد

تک پہنچا دی ہے۔“

اور کرم بالائے کرم یہ فرمایا کہ دستارِ فضیلت حضرت دیوان صاحب آل رسول اجمیری سے

بندھواتی سے خودی ہو علم سے محکم تو غیرت جبریل

اگر ہو عشق سے محکم تو صور اسرافیل (اقبال)

۱۹۴۵ء میں آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ اس اثنا

میں بے شک آپ علم و آگہی کا ایک بے پایاں خزانہ سمیٹ چکے تھے، لیکن آپ کے والد

معلم اس عقاب کو علم و معرفت کی جن بلندیوں پر مجبور وازدیکھنا چاہ رہے تھے، ابھی وہ منزل

نہیں آئی تھی۔ اس لیے آپ کو ۱۹۵۱ء میں مزید تحصیل علم کے لیے جامعہ ازہر (مصر)

بھیج دیا گیا۔

یہ وہ وقت تھا جب آپ کے والد محترم پیری کے ایام بسر فرما رہے تھے، لیکن اس

مرد مجاہد کی یہ ہمت اور دین و ملت کے ساتھ درد کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا

ہے کہ جب آپ نے اپنے لختِ جگر کو مصر کے لیے روانہ فرمایا تو انھیں مخاطب کرتے ہوئے

ارشاد فرماتے ہیں،

”میں زندگی کے اس مرحلہ میں آپ کو تحصیل علم کے لیے ملک سے دُور اتنی

لمبی مسافت پر روانہ کر رہا ہوں جب کہ آپ میرے لیے بہترین سہارا بن سکتے ہیں

لیکن میں اپنی ذاتی مجبوری پر دین کی خدمت کو ترجیح دیتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ

دین حنیف کی تعلیم مکمل کر کے آپ اس کو لوگوں تک صحیح طریقہ سے پہنچائیں“

جب حضرت ضیاء الامت کے قیامِ مصر کے دوران آپ کا مرض شدت اختیار کر

جاتا تو آپ اپنے ارادت مندوں کو فرماتے ہیں،

”اگر میں بیماری کے عالم میں داعیِ اجل کو لبیک بھی کہہ دوں تو میرے بیٹے

کو خبر نہ کرنا تاکہ وہ اطمینان اور کیسوئی سے اپنی تعلیم مکمل کر سکے۔  
یہ اس مجاہد ملت اور دین کا درد رکھنے والے والد کے جذبات تھے۔  
اگر ایک طرف آپ کے والد معظم نے آپ کے لیے اتنی قربانیاں دیں اور تعلیم کے  
لیے عمدہ سے عمدہ ترین انتظامات فرمائے، تو دوسری طرف حضرت ضیاء الامت علیہ السلام نے  
بھی محنت کا حق ادا کر دیا۔ خود ہی ارشاد فرماتے ہیں:

”میری زندگی میں بہت سی راتیں ایسی آئی ہیں کہ جب میں نماز عشا کے بعد  
مطالعہ میں مصروف ہوتا، کتابیں اپنے اسرار و رموز میرے سامنے منکشف کرتی  
جاتیں، اسی محویت کے عالم میں صبح کے مؤذن کی آواز مجھے رات کی تنگدانی  
کا احساس دلاتی۔“

ایک اور روایت کے مطابق حضرت ضیاء الامت کے تعلیمی دور میں دربار عالیہ پر  
ایک عجیب سی کیفیت دکھی جاتی، حضرت پیر محمد شاہ صاحب نماز عشا کے بعد اپنے بنگلہ  
میں نوافل ادا کرنے میں مشغول ہو جاتے۔ آپ کے تخت جگر مٹی کے تیل کا دیا جلانے مطابق  
مصروف ہو جاتے۔ پروانے جوق در جوق شمع پر گزنا شروع ہو جاتے، لیکن یہ پروانے اس  
سراپا احساس طالب علم کی طبیعت پر ناگواری کی بجائے مقابلہ کی حس کو ابھارنے کا سبب  
بنتے۔ اب عشق کا امتحان شروع ہو جاتا، کہ آیا اس ظاہری شمع کے پروانے ثابت قدمی  
کا مظاہرہ کرتے ہیں یا شمع علم کا پروانہ..... اور چشم دید گواہوں کا کہنا ہے کہ ظاہری شمع  
کے پروانے رات کے آخری حصہ میں رنچکے ہو جاتے، لیکن شمع علم کا یہ پروانہ ساری  
رات اسی محویت کے عالم میں گزار دیتا۔

حصول علم کا شوق اور محنت کا یہ جذبہ بیرون ملک جا کر اور زیادہ شدت اختیار کر

جاتا ہے۔ آپ دورانِ تعلیم اتنی جان سوزی کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ پورے چھ سال کا کورس ساڑھے تین سال کے عرصہ میں مکمل کر لیتے ہیں اور قیامِ ازہر کے دوران تعلیمی میدان میں وہ کردار پیش کرتے ہیں کہ اساتذہ و طلباء سبھی کی نظروں میں مقبول اور محترم بن جاتے ہیں۔ جامعہ میں تحقیقی سرگرمیوں کے سلسلہ میں اکثر اوقات مختلف موضوعات پر مناقشہ کی صورت بنتی، جس میں صرف اساتذہ ہی حصہ لے سکتے تھے، لیکن حضرت ضیاء الامت نے اپنی ذہانت اور قابلیت سے اساتذہ کے دلوں میں اتنا مقام پیدا کر لیا تھا کہ دورانِ مناقشہ آپ کو بھی اساتذہ کے دوش بدوش اس میں حصہ لینے کی اجازت دی جاتی اور اکثر اوقات آپ کی رائے کو اہمیت دی جاتی۔

آپ کے اساتذہ کرام نے ازراہِ قدر دانی آپ کو مختلف سٹریٹجیٹ عطا کئے جن میں سے تین کی اہمیت کے پیش نظر ان کا عربی متن اور اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے :

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الأستاذ محمد كريم شاه «الباكستاني» له تلميزا الى في مادة أصول الفقه  
في كلية الشريعة بالأزهر ، وما أنه عرفته حتى أحببته من كل قلبين لما  
وجدته فيه من حرص على البيت الرقيبي والأقبال على طلب العلم  
فضلا عما جبل عليه من خلقه كريم وأرب عظيم  
وأنت لغفور بطلمذته وأتمن له مستقبلا زاهرا وأرجو له جلت قدرته  
أنه ينفع به الإسلام والمسلمين الذين يباكستانه فحيا بل في العالم  
الإسلامي كله

محمد مصطفى سليم  
الأستاذ في كلية الشريعة  
الأزهر

11 سبتمبر 1952  
17 سبتمبر 1952

86520

~~86520~~

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الاستاذ محمد كرم شاه الباكستاني تلميذاً الى في  
 مارة اصول الفقه في كلية الشريعة بالازهر وما ان عرفته  
 حتى احبته من كل قلبي لها وجدته فيه من حرص  
 على البحث الدقيق والاقبال على طلب العلم فضلاً عما  
 جبل عليه من خلق كريم وادب عظيم واني لفخور  
 بتلمذته واتمنى له مستقبلاً زاهراً وارجو الله جلت  
 قدرته ان ينفع به الاسلام والمسلمين، وفي الباكستان  
 فحسب، بل في العالم الاسلامي كله.

محمد مصطفى شلبي

الاستاذ في كلية الشريعة بالازهر

١٩ - ذى القعدة ١٤٣٢ هـ

١٩ - يوليو ١٩٥٢ م

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

جامعہ ازہر کے کلیتہً الشریعہ میں استاذ محمد کرم شاہ پاکستانی علم  
اصول فقہ میں میرا شاگرد تھا جو نہی میری اس سے شناسائی ہوئی، میں دل کی  
گہرائیوں سے اس کے ساتھ محبت کرنے لگا، کیونکہ میں نے اس میں بحث  
دقیق کی حرص اور حصول علم کے لیے بے پناہ شوق پایا۔ مزید براں قدرت نے  
اس کی فطرت کو خلق کریم اور ادب عظیم کی خوبیوں سے آراستہ فرمایا ہے۔  
مجھے اس بات پر فخر و ناز ہے کہ یہ میرا شاگرد ہے۔ اور میں اس کے لیے ایک  
درخشاں مستقبل کی امید رکھتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اس کے  
وجود سے وہ اسلام کو اور ملت اسلامیہ کو نفع پہنچاتے نہ صرف پاکستان میں  
یہیں بلکہ سارے عالم اسلام میں۔

محمد مصطفیٰ اشلی

صدقني الروحي ، وتلميذها الزلمي الاستاذ سرور كرم شاه  
 لقد التقينا للمائة الرحمة الروحية ، التقينا يوم اشعرني بصدق العهد  
 برسيد الله ، رحمتك في الدفاع عنه عياضه ، والذود عنه حرمانه ، وكانت  
 لصلوة من بعد استدار الذهب اللقاء الروحي ، واستمرار لذلك النفس بوسعي  
 ساكن ، وما التقيتك ساعة الا اجمعت منك لعلو النفس وسحر اللامه  
 والاتجاه الى سعالى الامور والبدعه مسفاوز ، فقلت اشعرني كل لقاء  
 لجانة متجددة ، والمسرفين الروح البشافي الذي يتسامر عنه الدفقال

الارضيه رطلو علي  
 لقد اشعرني بانى انه الشرح مشرو الروح كما للشمس الشمس ، وفرد الحياة  
 كما للشمس حرازل ، وصباح الوجود ، كما للشمس الارضيه  
 ولقد اشعرني بانى انه اليوسم انه واجده لا تقطع وجهه بل باعده لوقطار  
 ولا اهدوف الاضمار ، فقلت كلا التقيتك رايت فيك اليوسم سراها سيرا ،  
 ورايت فيك اليوسم المرهد ، ورايت فيك الاول ، را اذ كنت زميلك عنى الالم  
 والخزه ؟

لقد اشعرني في المدة التي اقمته في مبر ، واللاه وانته نور عنى ، احسن  
 بانه قطعة من نفسى تزايلنى ، وكان اقتطع قطعة من روحى ، فاستر ملك به  
 رار لمرك بالتوفيق ، واضرع الى البرى اللان القدير انه شيبك بعد ريتك ، انه  
 عزيز عما اجمتت من غير ، را به كبل هيك لده نصيرا ، وشرعه ولبابه

سبح الشار ، كعب له عمار  
 لها لوقون ١٩٥٤ سنة زلفه لثقة سلم  
 البرافه ١٩٥٤ سنة بلبه سلم  
 سر ايزهون  
 استاذ شريفه الاسلاميه بجامعة القاهرة



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

صديقي الروحي وتلميذي الالهي الاتساء محمد كرم شانه  
لقد التقينا على مائدة الرحمن الروحية. التقينا  
يوم اشعرتني بنصرتك للحق في دين الله وحميتك في  
الدفاع عن حياضه والذود عن حرمانه وكانت  
الصلة من بعد امتداداً لذلك اللقاء الروحي واستمراراً  
لذلك المعنى الاسلامي السامي وما التقيت بك ساعة  
الا احسست منك بعلو النفس وسمو الخلق والاتجاه الى  
معالي الامور والبعد عن سفاسفها فكنت اشعر في كل لقاء  
بسعادة متجددة والمس فيك الروح الانساني الذي  
يتسامى عن الاثقال الارضية ويعلو عليها، لقد اشعرتني  
يا بني ان الشرق مشرق الروح كما هو مشرق الشمس ونور  
الحياة كما هو منبعث حاراتها ومصباح الوجود كما هو  
منار الارضين ولقد اشعرتني يا بني ان الاسلام امة  
واحدة لا تقطع وحدتها مابعدة الاقطار واختلاف  
الامصار فكنت كلما التقيت بك رأيت فيك الاسلام سراجاً  
منيراً ورأيت فيك الاسلام الموحد ورأيت فيك الامل  
واذهبت روغيتك عني الالم والحزن لقد اسعدتني

في المدة التي اقيمت فيها بصرى. والآن انت تودعنى فاحس  
 بان قطعه من نفسى تزايلنى وكانى اقتطع قطعة من روحى  
 فاستودعك الله وادعوك بالتوفيق و اضرع الى المولى  
 العلى القدير ان يثيبك بقدر نيتك وان يحزبك عما  
 احتسبت من خيرو ان يجعل فيك لدينه نصيرا و  
 لشرعه وليا، انه سيمع النداء مجيب الدعاء.

القاهرة فى ١٩ من ذى القعدة ١٣٤٣ هـ  
 الموافق ١٩ من يوليو ١٩٥٢ م  
 محمد ابوزهرة  
 استاذ الشريعة الاسلامية  
 بجامعة القاهرة

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

میرے روحانی دوست میرے زکی اور ذہین شاگرد والائے سادات محمد کرم شہا،  
 ہماری ملاقات خداوند رحمن کے روحانی دسترخوان پر ہوئی۔ ہم اس  
 روز ملے جب تو نے اللہ کے دین کی سر بلندی کے لیے حق کی نصرت اور دینی  
 اقدار کے دفاع کے لیے اپنی حمیت اور اس کی ناموس کی نگہداشت کے لیے  
 غیرت کا مجھے شعور دلایا۔ اس کے بعد یہ باہمی تعلق، اس روحانی ملاقات اور  
 بلند اسلامی مفہوم کا تسلسل تھا، جس لمحہ میں نے تجھ سے ملاقات کی میں نے  
 تجھ میں بلند نگاہی، رفعتِ کردار، اعلیٰ مقاصد کی طرف میلان اور بے مقصد  
 امور سے دوری کا احساس کیا۔ ہر ملاقات کے بعد میں ایک نئی سعادت کا  
 احساس کرتا تھا اور تجھ میں ایک انسانی روح کو پاتا تھا جو کہ ان ذہنی بوجھوں  
 سے بلند و بالا اور ارفع و اعلیٰ تھی۔ اور میرے بیٹے ابے شک تو نے مجھے یہ  
 شعور دلایا کہ مشرق جس طرح مطلع آفتاب ہے اسی طرح روح کے طلوع کا  
 افق بھی ہے۔ اور مشرق جس طرح حرارت کا سرچشمہ ہے اسی طرح زندگی کے  
 اجالے کا منبع بھی ہے اور جس طرح یہ زمین میں ایک روشنی کا مینار ہے، اسی طرح  
 عالم ہست و بود کا روشن چراغ ہے۔ اے میرے فرزند ارجمند! تو نے مجھے اس شعور  
 سے بہرور کیا کہ اسلام ایک امت ہے اور اس کی وحدت کو ملکوں کی دوری  
 اور شہروں کا اختلاف منقطع نہیں کر سکتا۔ اور میں جب بھی تجھ سے ملاقات کیا کرتا  
 تو مجھے تیری ذات میں اسلام ایک آفتاب کی طرح درخشاں نظر آتا۔ اور میں تجھ

میں وہ اسلام دیکھتا جو بکھرے دلوں کی شیرازہ بندی کرنے والا ہے اور مجھے  
تجھ میں روشن مستقبل کی امید نظر آتی اور ہر بار تیری ملاقات مجھ سے رنج و الم  
کو دور کرنے کا باعث بنتی اور جتنا عرصہ تو مصر میں اقامت پذیر رہا تو مجھے سعادت  
بخشا رہا اور آج جب کہ میں تجھے الوداع کہہ رہا ہوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا  
میرے نفس کا ایک حصہ مجھ سے جدا ہو رہا ہے اور گویا میری روح کا ایک ٹکڑا الگ  
ہو رہا ہے پس میں تجھ کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں اور تیرے لیے توفیق کی دعا  
کرتا ہوں اور اس عظمتوں والے اور قدرتوں والے مالک کے حضور عجز و انکساری  
سے التجا کرتا ہوں کہ وہ تیری نیت کے برابر تجھے اجر دے اور جس ثواب  
کی تو نے امید کی وہ بطور جزا تجھے عطا فرمائے، اور تجھے اپنے دین کا مددگار  
اور شریعت کا معاون بنائے، بے شک وہ التجا کو سننے والا اور دعا کو قبول  
کرنے والا ہے۔

محمد ابو زھرہ

القاهرة - الميزة - في العشرين من ذي القعدة سنة ١٣٧٣ هجرية  
العشرية من يوليو سنة ١٩٥٤ ميلادية

أى صديقي ومريري وصفيتي الاستاذ الأديب

والسيد السيد النسيب ، ولدي ، محمد كرم شاه

إله لكفانه على الأهل فزاد الأبناء ، ومع الصدوق البعد  
عنه للصدق ، ومع الخليل تسمى الثلاثة ، ومع النديم ألف الأديب  
النظام ، - فليس من الهمة فزاد الرايد للمريد ، ولا الصفتي له  
صافاه ، ولا المخاض له واقاه ، فقد صفتني بك يا بني صلتك لدارسة  
للأرب ، وضوء القول ، وفلسفة الاجتماع ، وساعت النفس ،  
وطرائف التريب ، - فكنت غلامك تدرسي لك وناقشاتي معك ،  
ومجاهدتي إياك في لغاتك الرياضه من أفاضل العلم ، - مثالا  
رفيعا للأدب المطبوع ، والذوق الإلماع ، واللؤمى للهوى ،  
وصاحب النفس الصافية ، ونموذج التربية الرفيعة ، عرف  
مع كل أولئك علم الإسلام الخفافه ، في عمرة على أصوله وفوائده ،  
ونزعة إلى الجهاد في سبيله ، لا تعرف الملل ولا تعبها الكلال .  
فلست أنسى ما هويت انفعالك مرارا من أهل ربي  
السلام والمحة ، وطالما كنت أستفرك ، فلا أرى من زيارتك إلا  
الحمار المحبوب في يادين أهل لعلم بيده رائد ومريد ، ولكني  
أجد غلامك ذلك منك النظرة النافذة ، والفكرة الصائبة ،  
والرأي السديد ، - تليق كل أولئك بما استحقها ، وفي أدب  
جمته ، يلمح صدرى ، ويطنه خاطرى على رجال ولهبوا أرواحهم لله

يجولونه فيما وراء البحار ، بنحاء شبه الوهاد والقفار ، سعياً وراء  
عبد الله المحسن ، وإفلاحة كلمة الله بعدد  
أمت تحت !!

لقد أبعثك على ظروف الحياة ، ومناعب كلافها ، وسأفة أهوالها  
وتبعات أعبائها ، فطوبى لمن سلم بما أَرَادَ اللهُ ، وتعدت  
إلى ديارك الحبيبة البنا وإليك ، فلتقعد غلاماً من أملاكك ووطنك الأغر  
تعلى فيه كلمة الله ، ونشئ هيدراً للفضيلة والهدى ونور المعرفة ،  
ذاكر مصر ، كنفانة لهم في أرضه ، وأصدقائك فيهما من رفاهه  
وأساتيد بذلوا معك جهد المقل محمد سعيد عظيم ، وسيد فخرنا كريم  
ولله الفضل عباداً تمام دراستك الجامعة بعد في دار ولد  
سقط في المنارة ، وإنا جميعاً لفي غنمك ، فلم تبعيد الراسل  
حبيباً ، ولم يعد عهداً بالمواسلات مفرجاً .

تعلى بركة الله رحمتك ، وفي رعاية لولي طعنك وإقامتك ،  
وفي ظلال الدؤوب المهاشمة الطاهرة تحياك ونضالك .  
متعلك الله به أصولك ، وأقر عينك بفرودك .  
وأثمرت شجرتك حتى تزكو وتينغ بفضل ربك كريم ، ومخاله  
بشركهم .

والسلام عليك وعرفنا الإسلام من وطنك ورحمة لهم  
وبركاته كما صدقك وصفتك ورائدك

أحمد زكي  
أستاذ الأدب العربي ، وفلسفة التربية والدينامي  
معاهد التربية المعاصرة .

ای صدیقی و مریدی وصی الاستاذ الادیب الحسیب النسیب

ولدی محمد کرم شاہ

ان ہان علی الاہل فراق الابناء و علی الصدیق البعد عن  
 الاصدقاء و علی الخلیل تشتیت الخلان و علی النذیر انقراض عقد  
 النذمان فلیس من الہین فراق الرائد للمرید و لا الصفی لمن  
 صافاه و لا المخلص لمن وافاه . فقد جمعتنی بک یا بنی صلہ  
 المدارس للادب و فنون القول و فلسفۃ الاجتماع و مباحث النفس  
 و طرائق التربیت فکنت خلال تدریسک و مناقشاتک معک و  
 مساجلاتک ایاک فی ہایتک الریاض من افانین العلم مثال  
 رفیع اللادب المطبوع و الذواقۃ اللامع و اللوذعی الموهوب صاحب  
 النفس الصافیة و نموذج التربیۃ الرفیعة یرفرف علی کل ،  
 اولیک علم الاسلام الخقاق فی غیرۃ علی اصولہ و مذاہبہ و  
 نزعة الی الجہاد فی سبیلہ لا تغرف اللہل و لا یعتربہا الکلال فلست  
 انسی ما حینیت انفعالک مراراً من اجل دین السلام و المحبۃ  
 و طالما کنت استفرک فلا ارئی من نظراتک الا الحیاء المحبوب فی  
 میادین اهل العلم بین رائد و مرید و لکنی اجد خلال ذلك منك  
 النظرة الناقذة و الفکرۃ الصائبۃ و الرای السدید تلقی کل اولئک علی  
 استحیاء غامرو فی ادب جم یثلج صدری و یطمئن خاطری علی رجال

وهبوا ارواحهم لله، يجولون فيما وراء البحار مجتازين الوهاد و  
 القفار سعياً وراء مجد الدين الحنيف واعلاء كلمة الله القدير.  
 يا بني لقد ابعثتك عنى ظروف الحياة ومتاعب اكلافها ومشاق  
 احوالها وتبعات اعبائها فكانه لا مناص من التسليم بما اراد  
 الله وعدت الى ديارك الحبيبه الينا واليك، فلتعد علماً من اعلام  
 وطنك الاغر تعلق فيه كلمة الله وتنشئ جيلاً على الفضيلة والجهد  
 ونور المعرفة ذاك مصر كنانة الله في ارضه واصدقائك فيها  
 من رفاق و اساتيد بذلوا معك جهد المقتن نحو مرید عظیم و  
 سيد غطريف كريم ولن يفصلك عن اتمام دراستك الجامعية  
 بعد في الدار ولا نشط في المزار وانا جميعاً الفى خدمتك فلم  
 يبعد التراسل حيباً ولم يعد احد بالموصلات غريباً. فعلى  
 بركة الله رحلتك وفي رعاية المولى ظعنك واقامتك وفي  
 ظلال الدوحة الهاشمية الطاهرة حياك.

متعك الله بين اصولك واقرب عينك بفروعك و  
 اثمرت شجرتك حتى تزكو وتينع بفضل رب كريم وخالق  
 بكر كريم

والسلام عليك وعلى معقل الاسلام من وطنك ورحمة الله وبركاته  
 صديقك وصفيك ورائدك

احمد زكي

استاذ الادب العربي، وفلسفة التربية والاجتماع



میرے پیارے دوست میرے ممتاز شاگرد والا سزا الادیب  
 اسید الحسیب النسیب، میرے فرزند و لبند محمد کرم شاہ!  
 اہل خانہ کے لیے اپنی اولاد کی جدائی، دوست کے لیے دوستوں سے دوری،  
 ایک محب کے لیے حلقہ احباب کا منتشر ہو جانا، ایک ہم نشین کے لیے ہم نشینی کے  
 رشتے کا ٹوٹ جانا آسان ہو، تو ہو لیکن ایک ارادت مند کے لیے اپنے رہبر  
 سے، ایک محب کے لیے اپنے محبوب سے، ایک مخلص کے لیے اپنے  
 وفاکش ساتھی سے جدا ہونا آسان بات نہیں۔

میرے فرزند! ادب، فنون گفتگو، فلسفہ، اجتماع، علم نفسیات کے  
 اہم مباحث اور فن تربیت کے طریقوں کی تدریس کے رشتہ نے مجھے تیرے ساتھ  
 ملنے کا موقع فراہم کیا۔ ان گونا گوں علوم کے گستانوں میں جب میں تدریس کے  
 وقت تیرے ساتھ بحث مباحثہ کیا کرتا اور ہم ایک دوسرے کے سامنے اپنے  
 دلائل پیش کرتے تو مجھے یوں معلوم ہوتا کہ تو ایک پیدائشی ادیب کی اعلیٰ و ارفع  
 مثال ہے۔ تو فصاحت و بلاغت کے نکات کا غیر معمولی ذوق رکھتا ہے۔  
 خداداد صلاحیتوں کا امین، پاکباز نفس کا مالک اور لبند تربیت کا ایک نادر نمونہ  
 ہے۔ اور ان تمام اخلاق حسنیہ پر اسلام کا لہرانے والا پرچم مجھے تجھ پر سایہ فلک نظر  
 آتا۔ اثنائے گفتگو مجھے محسوس ہوتا کہ تیرے دل میں دین کے اصولوں کے بارے

غیرت و حمیت کا ایک بے پایاں جذبہ ہے اور اس کے راستے میں جہاد کا شوق فراوان ہے، ایسا شوق جو اکٹا ہٹ کو نہیں جانتا، اور ایسا جذبہ جسے طویل جدوجہد درمندانہ نہیں کر سکتی۔

جب تک میں زندہ رہوں گا، میں تیرے ان انفعالات کو فراموش نہیں کر سکوں گا جو امن اور محبت کے دین کے بارے میں تجھ میں رونما ہوا کرتے۔ بسا اوقات میں تجھ سے چھیر چھاڑ کیا کرتا، لیکن اس وقت بھی تیری نگاہوں میں مجھے حیا کے بغیر کوئی چیز نظر نہ آتی۔ یہ حیا علم کے میدانوں میں استاد اور شاگرد کے درمیان از حد پسندیدہ صفت ہے۔

میں یوں محسوس کرتا کہ تیری نگاہ حقیقت شناس، تیرا فکر سائب اور تیری رائے صحیح ہے۔ بایں ہمہ تو اپنی رائے کا اظہار بڑے با حیا انداز سے کرتا، اور ادب کا دامن تیرے ہاتھ سے کبھی نہ چھوٹتا۔ ان نادر صفات کو دیکھ کر میرا سینہ ٹھنڈا ہوتا میرا دل مطمئن ہوتا کہ میرا ان لوگوں سے واسطہ ہے جنہوں نے اللہ کی رضا کے لیے اپنی جانیں وقف کر دی ہیں، اور اس کے دین کے علم کے حصول کے لیے سمندر پار سفر کی زحمت گوارا کر رہے ہیں۔ راستہ کے نشیب و فراز کو خاطر میں نہیں لاتے۔ انہیں صرف ایک ہی شوق ہے کہ اس دین حنیف کی شان اونچی ہو اور اللہ تعالیٰ کا حکم سر بلند ہو۔

اے میرے فرزند! زندگی کے حالات، مشکلات کے بوجھ، اور ذمہ داریوں کا بار گراں تجھے مجھ سے دور کر رہا ہے۔ اب میرے لیے کوئی

چارہ کار نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے سامنے تسلیم خم کر دوں۔ میری دعا ہے کہ تو اپنے وطن کی طرف جو ہمیں بھی بہت عزیز ہے، اور تجھے بھی بہت پیارا ہے اس شان سے لوٹے کہ تو اپنے روشن جبین وطن کے جھنڈوں میں سے ایک جھنڈا ہو، تاکہ وہاں تو اللہ کے نام کو بلند کرے اور ایک ایسی نسل تیار کرے، جو فضیلتِ حق اور نورِ معرفت سے آراستہ و پیراستہ ہو۔

اپنے وطن جا کر مصر کو بھی یاد رکھنا، جو اللہ کی زمین میں اللہ کا ترکش ہے اور اپنے ان مصری دوستوں کو بھی فراموش نہ کرنا، جو تیرے ہم سبق رہے ہیں یا تیرے اساتذہ جنہوں نے تیری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے مقدور بھر محنت اور کوشش کی۔

فرزند عزیز! یہ جدائی اور بعدِ مسافت تمہیں اپنی جامع تعلیم کو پایہ تکمیل تک پہنچانے سے باز نہ رکھے۔ ہم تیری ہر خدمت انجام دینے کے لیے حاضر ہیں، اگر سلسلہ مراسلت منقطع نہ ہو تو کوئی دُوری حائل نہیں ہوتی بخط و کتابت کے باعث انسان ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتا۔

پس میری دعا ہے کہ تیرا یہاں سے سفر بھی اللہ تعالیٰ کی برکت کے ساتھ ہو اور اپنے وطن میں تیری واپسی اور وہاں تیرا قیام بھی اللہ تعالیٰ کی پناہ میں ہو اور پاک ہاشمی خاندان کے سرسبز و شاداب شجر سایہ دار میں تیری جدوجہد کا سلسلہ جاری رہے۔

سے: آپ نے جامعہ ازبک کے علاوہ جامعہ قاہرہ میں بھی داخلے رکھا تھا۔

اللہ تعالیٰ تجھے اپنے والدین کے سایہ عاطفت سے بہرہ اندوز فرمائے  
 اور اپنی اولاد کے باعث تیری آنکھوں کو ٹھنڈا کرے۔ تیرا شجر حیات ثمر بار ہو۔  
 وہ پھل بڑھے اور نچتے ہو، اس رب کے فضل سے جو کریم ہے، اس خالق کی  
 مہربانی سے جو مہربان اور رحیم ہے، تجھ پر بھی اور تیرے وطن پر بھی جو اسلام کا  
 قلعہ ہے، سلامتی ہو، اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں۔

تمہارا دوست اور اسٹاذ

احمد ذکی

استاذ الادب العربی و فلسفہ التربیۃ والاجتماع

زمانہ طفولیت میں آپ کے والدین نے حضرت خواجہ ضیاء الدین صاحب سیالوی سے  
آپ کو بیعت کرایا۔ بعد ازاں شیخ الاسلام و المسلمین حضرت خواجہ محمد قمر الدین صاحب  
سیالوی رحمۃ اللہ علیہ نے تجدید بیعت فرما کر آپ کو خرقہ خلافت عطا فرمایا۔

قبلہ پیر صاحب پر جو شفقت و مہربانی حضرت خواجہ صاحب فرماتے ہیں، اس کا  
اندازہ حضور پیر سیال کے ان الفاظ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے، جو آپ نے آستانہ عالیہ  
سیال شریف میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے فرمائے:

”پیر محمد کرم شاہ میری آنکھوں کا نور ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ پیر سیال  
کے روضہ کا مینار ہے۔“

حضرت خواجہ پیر سیال کی اسی شفقت کا نتیجہ ہے کہ قبلہ پیر صاحب کے سامنے  
جب بھی شمس سیال کے خانوادے کا تذکرہ آتا ہے تو فرط ادب و احترام  
سے آپ کی گردن جھک جاتی ہے۔ پیر سیال کی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے آپ کی  
زیر ادا رت شائع ہونے والے ماہنامہ ”ضیائے حرم“ میں پیر سیال کے ملفوظات، آپ  
کے خاندان کے سوانحی خاکے اور تبلیغی مشن سے متعلق وقتاً فوقتاً خصوصی فیچر شائع ہوتے رہتے  
ہیں۔ اور خواجہ شمس العارفین کے صد سالہ عرس پاک کے موقع پر تو ادارہ ضیائے حرم  
نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے شمس العارفین نمبر شائع کر کے تاریخ  
کے صفحات پر اپنی ارادت و محبت کے ائمہ نقوش ثبت کر دیئے ہیں۔ اسی نیاز مندی  
اور جدوجہد کا نتیجہ ہے کہ حضور پیر سیال قبلہ پیر صاحب کو ایسے پیار بھرے القابات سے  
لوازتے ہیں جو ایک ارادت مند کے لیے سرمایہ زلیست ہوتے ہیں۔ اس کی عمدہ ترین

مثال تحریکِ نظامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں جیل سے رہا ہو کر سیال شریف پہنچنے پر حضور پیر سیال کے یہ الفاظ ہیں:

”مبارک ہو آپ نے آج سے سنتِ یوسفی بھی ادا کر لی ہے“

حضرت ضیاء الایمان کے دینِ ملت کے بارے میں احساسات

تکمیلِ علم کے بعد میں نے جب اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالی تو مجھے بڑا روح فرسا اور دلخراش منظر دکھائی دیا۔ میں نے دیکھا کہ اسلامی تمدن و ثقافت کے جو چراغ نور افشانی کر رہے ہیں، تہذیبِ مغرب کے تند و تیز جھونکے رفتہ رفتہ انہیں بجباتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ رنگین پھول جو گلشنِ اسلام میں کھل کھل کر نور و نکمت پر سارہے ہیں، مادیت کی بادِ صرا انہیں افسردہ اور پژمردہ کرتی چلی جا رہی ہے۔ اب تک مغرب کے سرمایہ داری نظام نے اسلامی چین کو جی بھر کر لوٹا اور اس مقدس نظام کے حسن و خوبی کے جو آثار کیپٹلزم کی لیغا سے بیچ گئے انہیں اب شوشلزم ملیا میٹ کر دینا چاہتا ہے اور مسلمانوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ جل جلالہ، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآنِ کریم کے متعلق جو غیر متزلزل عقیدہ راسخ تھا، اس کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینا چاہتا ہے۔

یہ تو بیرونی خطرات تھے جنہوں نے ملتِ اسلامیہ کو چاروں طرف سے زرخے میں لے لیا تھا۔ اگر اندرونی حالات تسلی بخش ہوتے، فکر و عمل کی وحدت برقرار ہوتی تو ان خطرات کا منہ پھیر دینا کوئی مشکل بات نہ تھی، لیکن داخلی طور پر حالات از حد تشویشناک تھے۔ ہمیں عقیدہ ختم نبوت کے منکر ہیں جو مجموعی طور پر امتِ مسلمہ کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں اور کہیں شمع رسالت کے اولین پروانوں پر جھبوٹے بہتان لگانے والا گروہِ ملتِ اسلامیہ کی فکری اور نظریاتی یک جہتی کو دہم برہم کر رہا ہے اور ایک ایسا

فرقہ بھی پر پزے نکال رہا ہے جس کے پیش نظر تقدس نبوت اور احترام رسالت کے عقیدہ سے مسلمانوں کو محروم کرنا ہے، ان کے سارے مذاکرے، ان کے سارے مواعظ، ان کی ساری تصنیفات اس ایک امر پر مرکوز ہو کر رہ گئی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے مقامِ رفیع سے نیچے اتار کر ایک عام انسان کے دوش بدوش کھڑا کر دیا جائے۔ ان کی اسی روش نے انکارِ سنت کو جنم دیا ہے وہ کسی کافر کو تو مسلمان کرنے کی ہمت نہیں رکھتے، البتہ شرکِ سازی کی مہم چلانے میں یہ بڑے بے باک ہیں۔ تمام وہ آیتیں جو مشرکین عرب کے حق میں نازل ہوئی تھیں ان کو غلامانِ مصطفیٰ علیہ الطیب التہیہ والتناہیٰ پر منطبق کرتے ہیں اور ہر اس خوش نصیب کو جسے عشقِ حبیب کبریٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی دولتِ سرمدی ارزالی ہوئی ہے، اس کو دائرہ اسلام سے خارج کرنا اپنے موحد ہونے کے لیے شرطِ اول قرار دیتے ہیں۔

یہ سارے فرقے امتِ محمدیہ علی صاحبہا افضل الصلوٰۃ والسلام کے سوادِ اعظم سے نکلے ہیں۔ فتنہ پردازوں نے اس رفیع الشان محل سے اینٹیں اکھاڑ اکھاڑ کر نئے گھرانے تعمیر کئے ہیں۔ یہ فتنہ پرداز عیار بھی ہیں اور منظم بھی۔ یہ بڑی چابکدستی سے بڑے بڑے عہدوں کو ہتھیانے میں مصروفِ کار ہیں۔ ملک کی صنعتوں پر چھا رہے ہیں تعلیمی اداروں میں اپنی اجارہ داری قائم کر رہے ہیں اور میدانِ صحافت میں تمام کلیدی مراکز پر انھوں نے اپنا تسلط جما لیا ہے، اور دوسری جانب اہلسنت، جن کے اکابر نے ظلمتِ کدہ ہند کے گوشہ گوشہ میں اسلام کی شمعیں فروزاں کیں جن کے ”اللہ اکبر“ کے نعرہٴ مستانہ سے صحرا، جنگل اور پہاڑ گونج اٹھے، جن کے غیور اور بہادر علماء و صلحاء نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں فیصلہ کن کردار ادا کیا جن کے بزرگوں نے تحریکِ پاکستان میں قائدِ اعظم

کے شانہ بشانہ کام کیا، ان کی حالت قابلِ رحم ہے صنعتیں ان کے قبضہ سے نکلتی جا رہی ہیں ان کے نوجوانوں پر اعلیٰ ملازمتوں کے دروازے اس ہوشیاری سے بند کیے جا رہے ہیں کہ اس محرومی کا کسی کو شعور تک نہیں۔ ان کے گنتی کے چند سکول اور کالج ہیں، وہ بھی قومی شعور سے بے بہرہ اور بے گانہ ہیں۔ ان کے دینی ادارے کسمپرسی کے عالم میں ہیں اور جمود نے ان کو ہر قسم کی تنگ و دو سے محروم کر دیا ہے اور میدانِ صحافت سے تو گویا کسی منظم سازش کے تحت انہیں نکال باہر کر دیا گیا ہو۔

اس عظیم نجیب اور حید سوادِ اعظم کا یہ حال دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو روتا اور یہ ہوشنگین حالات اور سنگین مسائل تھے جو مجھے چاروں طرف سے سر اٹھاتے نظر آتے ہیں تصور کر کے کانپ گیا کہ اگر یہ صورتِ حال کچھ عرصہ جاری رہی تو معاملہ ہمیشہ کے لیے تلیٹ ہو جائے گا۔ یہ سوادِ اعظم جس کا میں ایک ادنیٰ فرد ہوں، جس کی محبت میرے رگ و پے میں سمائی ہوئی ہے جس کے دینی عقائد پر میرا بختہ ایمان ہے۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ انھوں نے دینِ جزوی طور پر قبول نہیں کیا۔ بلکہ کلی طور پر قبول کیا ہے جن کے سینوں میں نورِ توحید و رخشائاں ہے۔ جن کے دلوں میں عشقِ محمدی کی شمع فروزاں ہے جن کی روح صحابہ کرام، اہل بیتِ عظام، اولیائے امت اور عماتے ربانیین کی الفت سے سرشار ہے وہ اگر خائب و محروم ہو کر زندہ رہنے پر مجبور ہو جائیں گے تو پھر کیا ہوگا؟ میں یہ تصور کر کے لرز جاتا تھا۔ مجھے یہ احساس کچھ کرنے پر مجبور کرتا۔ اگر میرا بس چلنا تو ایسا صور پھونکتا اور بار بار پھونکتا کہ سارے سونے والے سنی جاگ اٹھتے اور اگر کوئی سونا چاہتا تو میں اس کے لیے سونا ناممکن بنا دیتا۔ اگر میرے مقدور میں ہوتا تو میں ایسی دلدور چینی مارنا کہ پتھر دلوں میں شکاف ہو جائے اور احساسِ زیاں سے سب بے چین و بے قرار ہو جائے۔



طوفان بن کر آنا اور فتنہ و فساد کے شعلوں کو بھسم کر کے رکھ دینا۔ نسیم سحر بن کر چلتا۔ خوابیدہ  
 غنچوں کو جگانا، دل زلفہ عنادل کو گدگدانا اور انھیں حیاتِ آفریں نعموں پر مجبور کر دینا،  
 لیکن میں ایک ذرہ بے مقدار ایسا نہ کر سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ ملت کے ساتھ جو جو عشق  
 ہے اس عشق کی لاج کیسے رکھوں۔ میں نے خیال کیا کہ میں اکیلا کچھ نہیں کر سکتا۔ ان بگڑے  
 ہوئے حالات کو سوار نے کے لیے اس نا سازگار ماحول کو سازگار بنانے کے لیے مجھے  
 چند جانباز، غیرت مند، جفاکش اور باہمت ساتھیوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ایسے جو اُمرد  
 ساتھی جو باطل کی گوشمالی کرنے کی ہمت رکھتے ہوں۔ جن کا علم سمندر کی طرح بیکراں اور جن کی  
 سیرت مہرِ عالمناہ کی طرح روشن اور بے داغ ہو۔ جن کی عقابِ اُلوذنگاہ سے اس سائے  
 ایسی نظام میں بلبلِ مچ جاتے۔

جو تن آسان نہ ہوں بلکہ جفاکش ہوں، بے حس نہ ہوں، بلکہ پرلے درجے کے حساس  
 ہوں، ضمیرِ فردش نہ ہوں، بکا و مال نہ ہوں بلکہ مسندِ فقر و درویشی پر بیٹھ کر دولتِ قارون  
 پر تھوکتا بھی گوارا نہ کریں۔  
 (تخصیص از عصر حاضر اور ہماری ذمہ داریاں)

ان مندرجہ بالا احساسات کی روشنی میں آپ اس ہم پہلو شخصیت کے کردار کی جھلک  
 دیکھ سکتے ہیں، لیکن کیا سارے جذبات ہی تھے جو ابھرے اور سردا ہوں میں تحلیل ہو کر  
 رہ گئے؟

نہیں، بلکہ اس سرِ پائے عمل شخصیت نے اپنے جذبات کی عملی تصویر قوم کے سامنے پیش  
 کر کے یہ واضح کر دیا۔

صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر  
 جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز

# حضرت ضیاء الامت

## میدان عمل میں

اگرچہ برصغیر پاک و ہند میں انگریز کی آمد ہی سے اسلامی تمدن و ثقافت کے بارے  
 تشکیک کے جراثیم پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی وہ نقطہ تھا  
 ہے جہاں پہنچ کر امت مسلمہ کی زبوں حالی نے کچھ زیادہ ہی تشویشناک صورت اختیار کر لی  
 انگریز نے مسلمانوں کو بغاوت کا ذمہ دار قرار دے کر ان پر مظالم کی حد توڑ دی۔ ہزاروں  
 سید غلام کو تختہ دار پر کھینچ دیا گیا مختلف فنون پر مشتمل لاکھوں گیا۔ کتابیں سمندر میں غرق کر دی گئیں  
 تمام قابل ذکر درس گاہوں کا نام و نشان تک مٹا دیا گیا۔ جو تمسوزی بہت کمزور تھی۔  
 گئی تھی۔ وہ لارڈ میکالے کے نظام تعلیم کے ذریعہ پوری ہو گئی اور کالج کی طرف رجوع  
 کرنے والا مسلمان طالب علم اسلامی شعائر کو شکاک کی نظر سے دیکھنے لگا۔  
 ان مسلم کوشاں اقدامات نے پورے برصغیر کے اندر اسلامی وحدت کو سخت نقصان  
 پہنچایا۔ ان کا تلی وجود خطرے میں پڑ گیا اور وہ مستقبل سے انتہائی مایوس نظر آنے لگے۔  
 ان حالات میں مسلمان علمائے اپنی ذمہ داری محسوس کی اور مختلف سفارشات پر انفرادی  
 طور پر ایسے ادارے قائم کیے جہاں اسلامی روایات کے مطابق مسلمان طلباء کو زیادہ تعلیم سے  
 آراستہ کرنے کے لیے انتظامات کیے گئے۔

اسی سلسلہ الذہب کی ایک کڑی دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ بھی ہے جس کی بنیاد ۱۹۲۵ء میں غازی اسلام حضرت پیر محمد شاہ صاحب نے رکھی۔ آپ نے علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ مسلمان طلباء کے لیے دارالعلوم سے متصل ایک پرائمری سکول بھی قائم کیا جو آج تک محمدیہ غوثیہ پرائمری سکول کے نام سے کام کر رہا ہے۔

اگرچہ یہ دینی درس گاہ وقت کے تقاضوں کے مطابق اسلامی تعلیمات کے سلسلہ میں قابل قدر خدمات انجام دیتی رہی ہے تاہم انگریز کے استعماری ہتھکنڈے اس قسم کی دانش گاہوں کے پینے میں بہت بڑی رکاوٹ بنے رہے۔

۱۹۴۷ء میں اگرچہ ایک مملکت "اسلامی جمہوریہ پاکستان" کے نام سے وجود میں آئی لیکن حضرت قائد اعظم کو وقت نے مہلت نہ دی اور وہ اس سلسلہ میں کوئی مثبت اقدام کرنے سے قبل ہی اس دارفانی سے رحلت فرما گئے۔

بعد میں آنے والی قیادت میں اگرچہ بعض دردمند اصحاب بھی موجود تھے، لیکن علوم اسلامیہ کی ترویج کے سلسلہ میں کوئی ٹھوس قدم نہ اٹھایا جاسکا۔

یہ ۱۹۵۷ء کا سال ہے۔ قوم ایک طرف دس سالہ جشن آزادی پاکستان منا رہی ہے اور دوسری طرف جنگ آزادی میں شہید ہونے والے مجاہدین کا خون ذمی شعور افراد کو ذمہ داریوں کا احساس دل رہا ہے ان دل دردمند کے مالک اصحاب میں سے ایک حضرت ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ صاحب الازہری بھی ہیں۔ آپ بھی ملت اسلامیہ کو درپیش حالات کا جائزہ لے رہے ہیں اور اس سوچ میں منہمک کہ "امت" کی اس ڈگمگاتی ناؤ کو کیسے سہارا دیا جاسکتا ہے جو اپنے دامن میں ہزاروں فتنے سمیٹے ہوئے ہے۔

خداوند قدوس نے بروقت آپ کی رہنمائی فرمائی اور آپ نے مجاہدین جنگ آزادی

کے مبارک مشن کو حیاتِ تازہ عطا کرنے کے لیے علماء کا ایک ایسا گروہ تیار کرنے کا ارادہ فرمایا جو ہر قسم کے باطل نظریات کا طلسم توڑ کر رکھ دے کیونکہ شہدائے خون کا حقیقی صلہ و حقیقت اس نظریہ کا پرچار ہے جس کے لیے انھوں نے اپنی جانیں قربان کیں۔

حضرت علامہ فرماتے ہیں :-

میرے خاک و خون سے تو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا

صلہ شہید کیا ہے؟ تب و تابِ جاودانہ

چنانچہ اسی صد سالہ جشنِ جنگِ آزادی کے موقع پر آپ نے دارالعلوم محمدیہ غوثیہ کی نشاہ ثانیہ کا آغاز کیا جس کا نصاب اس بیچ پر مرتب کیا گیا کہ یہاں سے فارغ التحصیل علماء قدیم و جدید دونوں قسم کے علوم سے بہرہ ور ہوں تاکہ کسی ماحول میں بھی وہ احساسِ کمتری کا شکار نہ ہوں کیونکہ دورِ جدید میں اسلام کی لو کو مدہم کرنے کے لیے جو باطل نظریات جنم لے رہے ہیں۔ ان کا تعلق زیادہ تر سیاسی اور معاشی نظریات سے ہے۔ اس لیے حضرت ضیاء الامت نے دارالعلوم کا نصاب مرتب کرتے وقت اپنے طلباء کے لیے معاشیات اور سیاسیات کی تعلیم لازمی کر دی۔

دارالعلوم محمدیہ غوثیہ کے اندر طلباء کو درسِ نظامی کے ساتھ ساتھ فاضلِ عربی اور دورہ حدیث کے علاوہ بی۔ اے تک تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ درس گاہ اب اپنے شدید تقسیم سال پورے کر چکی ہے اور خدا کے فضل و کرم سے یہاں سے فارغ التحصیل علماء زندگی کے مختلف شعبوں میں کام کر رہے ہیں۔

— فوج کے اندر بطور خطیب و نائب خطیب کام کر رہے ہیں۔

— ملک کے اطراف و اکناف میں خطابت کے فرائض سر انجام دے رہے ہیں۔

نست ایہ مقالہ ۱۹۷۱ء میں لکھا گیا۔

مختلف کالجز میں بطور پروفیسر مصروف کاری ہیں۔

— بیرون ملک تبلیغی مشن میں مصروف ہیں۔ اور

— ہرمیدان میں کامیاب و کامران۔

دارالعلوم میں اس وقت موجود طلبہ کی تعداد تین صد سے زائد ہے جو ملک کے مختلف حصوں کشمیر، بہاولپور، ڈیرہ غازی خان، ملتان، کراچی، فیصل آباد، جہلم، راولپنڈی، میانوالی، سیالکوٹ، لاہور وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ طلبہ کے قیام و طعام کا انتظام دارالعلوم کے ذمہ ہے۔ طلبہ کو لائبریری کی طرف سے کتابیں بلا معاوضہ مہیا کی جاتی ہیں۔ طلبہ سے کسی قسم کی فیس نہیں لی جاتی جب کہ غریب طلبہ کو علاج معالجہ کی سہولیات کے علاوہ وظائف بھی دیتے جاتے ہیں۔

دارالعلوم کی موجودہ عمارت چالیس کمروں پر مشتمل ہے، جو طلبہ کی موجودہ تعداد کے لیے ناکافی ہے۔ قریب ہی ۵۲ کنال رقبہ کی اراضی خرید لی گئی ہے جس میں کم از کم پانچ صد طلبہ کے قیام کے لیے ہاسٹل کے علاوہ اساتذہ کے رہائشی کوارٹرز، کچن بلاک، ایک لائبریری ہال اور کھیلوں کے گراؤنڈ بنانے کا پروگرام ہے۔ عمارت کا نقشہ تیار ہو گیا ہے۔ اس عظیم منصوبے پر کام عنقریب شروع ہو جائے گا۔

اس وقت پندرہ اساتذہ جو مختلف مضامین میں مہارت نامہ رکھتے ہیں، تدریس کے فریض سرانجام دے رہے ہیں، جو صرف تعلیم کے اوقات میں ہی نہیں بلکہ زائد اوقات *Over Time* میں بھی طلبہ کے تعلیمی معیار کو بلند سے بلند تر کرنے کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ ان کو دارالعلوم کی طرف سے معقول مشاہرہ دیا جاتا ہے تاکہ وہ معاشی پریشانیوں سے بے نیاز ہو کر اپنے کام میں مصروف رہیں، لیکن خوش آئند بات یہ ہے کہ ان میں

سے کوئی بھی اپنے آپ کو ادارہ کا ملازم نہیں سمجھتا، بلکہ اس مقدس تحریک کا ایک کارکن۔ اور یہ بھی حضرت ضیاء الامت کے حسن سلوک اور خلوص کا ثمرہ ہے۔

اس گہوارۂ دانش کی کامیابی کی بنیادی وجہ حضرت ضیاء الامت کی ذاتی دلچسپی اور ادارہ کے ساتھ خصوصی لگن ہے۔ آپ کو حکومت کی طرف سے کئی بار مختلف عہدوں کی پیشکش کی گئی، لیکن آپ نے ہر بار یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ میں اپنے والد صاحب کے قائم کردہ دارالعلوم کے ذریعے ہی دین و ملت کی خدمت کرنا ضروری سمجھتا ہوں اور لطف کی بات یہ ہے کہ آپ نے اپنے خوابوں کی اس تعبیر کے لیے اپنا سب کچھ واؤپر لگا رکھا ہے۔

دارالعلوم کی موجودہ عمارت کا اکثر حصہ راقم الحروف کی موجودگی میں تیار ہوا ہے۔ جب بھی تعمیر کے سلسلہ میں لپائی یا لٹری وغیرہ ڈالنے کا وقت آتا تو حضرت ضیاء الامت خود اور آپ کے صاحبزادگان اپنے سروں پر نگاریاں اٹھائے مسجد نبوی والی سنت ادا کرتے نظر آتے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے سے بڑا کام اتنا جلدی انجام پذیر ہو جاتا کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے۔

## ذیلی برانچیں

مرکزی دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف چونکہ اس وقت اندرون ملک اور بیرونی سطح پر کافی ترقی حاصل کر چکا ہے، اس لیے داخلہ کے وقت مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے طلباء کی بھیر ہو جاتی ہے۔ عوام اہلسنت کی سہولت کے لیے حضرت ضیاء الامت نے ملک کے مختلف علاقوں میں دارالعلوم کی ذیلی برانچیں کھولنے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ اس پروگرام کے تحت اب مندرجہ ذیل برانچیں مرکزی دارالعلوم سے وابستہ ہو کر دین و ملت کے لیے اپنے دفاعی شرعی عدالت کی طرف سے رجم کو حد قرار نہ دینے کے بعد فاقی شرعی عدالت میں بطور جج شریک ہونے کا فیصلہ کیا۔

کی خدمت میں مصروف ہیں :

دارالعلوم محمدیہ غوثیہ سیالکوٹ چھاؤنی

دارالعلوم قمر الاسلام سلیمانہ، پنجاب کالونی، کراچی ۶

جامعہ رضویہ الوارالعلوم، ۲۴ ایچ واہ کینٹ

دارالعلوم حثیہ غوثیہ منڈی بہاؤ الدین

دارالعلوم ریاض المدینہ گوجرانوالہ

دارالعلوم ضیاء القرآن بوکن شریف، ضلع گجرات

دارالعلوم محمدیہ غوثیہ چک شہزاد اسلام آباد

دارالعلوم محمدیہ رضویہ پنڈ دادنخاں دارالعلوم قمرالعلوم، گجرات

## حضرت ضیاء الامت اور صحافت

قیام پاکستان کے بعد صحافت کے میدان میں بامقصد صحافت کی نمائندگی کچھ زیادہ ہی نشوونما تک تھی، جس کے بارے میں حضرت ضیاء الامت کے احساسات کا جائزہ لینے کے لیے آپ کا یہی فقرہ کافی ہے :

”میدان صحافت سے تو گویا کسی منظم سازش کے تحت اسلام کی حقیقی نمائندہ

قوتوں کو نکال باہر کر دیا گیا ہے“

جہاں احساس زیاں کی یہ کیفیت ہو وہاں رد عمل بھی اتنا ہی واقع ہونا چاہئے تھا۔ آپ نے واقعی اس کا مناسب حل تلاش کیا اور اس وقت جب کہ پوری پاکستانی قوم ایک کشمکش کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ دور ایوبی ختم ہو چکا تھا۔ سرمایہ داری کی چکی میں پس ہوئی قوم

شدتِ درد سے کراہ رہی تھی، اور نظر باقی طور پر ڈانواں ڈول۔ اشتراکیت کے سائے لمحہ لمحہ گہرے ہوتے چلے جا رہے تھے۔ محمد عربی (فداہ ابی دومی) کی غیور قوم کو اشتراکی عیسار روٹی، کپڑا اور مکان کا بھانسدے دے کر اس کے غیر متزلزل عقائد میں رنخنے ڈال رہے تھے کہ ضیاء الامت کی دُور رس نگاہوں نے ان سر پر منڈلاتے ہوئے خطرات کو بھانپ لیا اور میدان صحافت میں ایک ماہنامہ فقیرِ غیور اور عشقِ خود آگاہ کا نقیب بنا کر قوم کی نذر کیا، جسے اہل دل ”ضیائے حرم“ کے نام سے جانتے ہیں۔ ضیائے حرم نے واقعی ”فقیرِ غیور“ اور ”عشقِ خود آگاہ“ کا نقیب بن کر دکھایا اور سوشلزم کے امڈتے ہوئے سیلاب کے سامنے سد سکندری کا کام دیا۔ ضیائے حرم کو مطلع صحافت پر نمودار ہوتے تقریباً گیارہ سال کا عرصہ بیت چکا ہے۔ اس مدت میں اس مدت میں اس ماہنامہ نے پاکستانی قوم کو درپیش ہر قسم کے مسائل کا تجزیہ بڑے احسن انداز میں کیا ہے اور ہر میدان میں خواہ وہ معاشرتی ہو یا مذہبی، سیاسی ہو یا معاشی، اس نے اپنا مضبوط موقف پیش کیا ہے۔

ضیائے حرم کے سیاسی کردار کی جھلکیاں اگلے عنوان ”ضیاء الامت کا سیاسی کردار“ کے تحت آپ ملاحظہ کر سکیں گے۔ یہاں اتحادِ بین المسلمین، اسلحہ معاشرہ، اخلاقی اقدار کے احیاء اور اہل سنت کے فرائض منصبی کے بارے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔

### حضرت ضیاء الامت اور اتحادِ بین المسلمین

رزم گاہِ حیات میں کسی قوم کا اتحاد و اتفاق ہی اس کی سر بلندی اور فیروز مندی کا سبب ہوا کرتا ہے۔ اس قوم کو میدانِ کارزار میں روند ڈالا جاتا ہے، جو بے اتفاقی یا انتشار کا شکار ہو۔ اس کے افراد کی خوبیاں اور ندرت طرازیوں بے کار ہو کر رہ جاتی ہیں



وہ اپنے دشمنوں کی نگاہوں میں ہی نہیں خود اپنی نگاہوں میں ذلیل ہو جاتی ہے۔ احساس کمتری اس کو یوں گھیر لیتا ہے کہ اس کے نظریات، معتقدات اور اس کے درخشاں ماضی کو بڑی طرح مسخ کیا جاتا ہے، لیکن اس کی رگِ حمیت نہیں پھڑکتی۔ اس کے منہ خون میں جوشِ عمل پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے علمی، تحقیقی اور تخلیقی فخرِ روزگار کا نامے مٹ رہے ہوتے ہیں لیکن اسے احساس تک نہیں ہوتا۔ اور پھر کوئی اس کا بھی خواہ اس کی بے حسی پر اس کا یوں ماتم کرتا ہے سے

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احساسِ نیاں جاتا رہا

یہ نفاق و انتشار سیاسی نوعیت کا بھی ہو سکتا ہے اور فکری و اعتقادی بھی جہاں تک سیاسی جنٹیلمن یا شکرِ نجی کا تعلق ہے، اس کے چاک تو حسنِ تدبیر سے رفو ہو سکتے ہیں، لیکن فکری و اعتقادی پراگندگی اپنے اندر جو ہونا ک انجام لاتی ہے وہ قوموں کی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔

حضرت ضیاء الامت واقعات کے آئینے میں ان ہوشِ ربا حالات کو ملاحظہ کر رہے تھے چنانچہ اس کی خاطر عملی اقدام کرتے ہوئے ماہنامہ ضیاء سے حرمِ اکتوبر ۱۹۷۰ء میں فرماتے ہیں:

”ہر مسلمان اپنی ملت کی زبوں حالی پر اشکبار ہے۔ ہر دل اپنی موجودہ پستی پر خون کے آنسو بہا رہا ہے۔ ہر زبان شکوہ سنج ہے کہ ہم میں اتحاد نہیں، ہماری صفیں انتشار کا شکار ہیں غرضیکہ ہر شخص اپنی موجودہ صورت حال سے نالاں ہے اور اس کو بدل دینے کے لیے بے چین۔ اگر واقعی ہمارا احساس

مذاق نہیں، بلکہ اپنے اندر سنجیدگی اور متانت رکھتا ہے تو آؤ، سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں، کندھے کے ساتھ کندھا جوڑ کر قدم بڑھائیں۔ اپنی بدنظمی اور پراگندگی کو نظم و ضبط سے بدل دیں۔ ایک دوسرے کی عیب جوئی چھوڑ دیں۔ ایک دوسرے کے متعلق بدگمانیاں ترک کر دیں۔ ایک دوسرے سے کچھے کچھے نہ رہیں شکوکوں اور شکاکتوں کے دفتر تہہ کر دیں۔ بدگمانیوں کی عادت چھوڑ کر شیر و شکر ہو جائیں۔ فیاض ازل نے جس کسی کو جو صد حیات مرحمت فرمائی ہے، اسے دین متین کی سر بندگی کے لیے وقف کر دیں۔ ضیائے حرم کے صفحات کو اپنی تحقیقی اور تعمیری کاوشوں سے رشکِ صد طور بنا دیں۔ ان میں اپنی نگارشات کے موتی سجا کر اپنی قوم کے نونہالوں کی خدمت میں بطور ارمان پیش کریں۔ ہم ان عظمتوں کی نشاندہی کریں اور اپنے نوجوانوں کو ان رفعتوں کا پتہ بتائیں جو بندہ مومن کی میراث ہیں۔ دشتِ ظن و تخمین میں بھٹکنے والے آہو کو سوتے حرم لے چلیں۔ وہ عندلیبیں اور قمریاں جو کسی غلط فہمی کے باعث شاخِ مغیلاں پر آشیاں بند ہو چکی ہیں، انھیں بتائیں کہ تمہارے بغیر حرمِ اداس ہے، غنچے اداس ہیں، کلیاں اداس ہیں۔ آؤ! اپنے گلشن میں آؤ! اپنے روح پرور نعموں سے حرم کی فضا کو معمور کر دو۔ یہ ناپیمز اپنے ان بچپڑے ہوتے رفیقوں کو خصوصی طور پر دعوت دیتا ہے، جنہیں عقل سلیم، فہم رسا اور نظم و ضبط رقم کی انمول نعمتیں بخشی گئی ہیں، کہ وہ انہیں اور اس ماہنامہ کے دامن کو اپنے علم و حکمت کے موتیوں سے تابدار بنائیں۔

یہ تھی وہ دعوت جو آپ نے قوم کے ان افراد کے سامنے پیش کی جو دین و ملت کا

درد رکھتے ہیں اور آپ کی یہ دعوت آج بھی اسی طرح ہے۔ ضیائے حرم کے صفحات آج بھی فرقہ واریت کی قیود سے آزاد ہیں اور اس کی پالیسی ”خذ ما صفا ودع ما کدار“ آج بھی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ مجھ عمل ہے، لیکن ان ساری رواداریوں اور وسعت نظری کے باوجود حضرت ضبا الامت عفا ذہل سنت کی ترویج اور ان کے اظہار میں کسی مدہانت کے روادار نہیں اور بقول طالب ہاشمی۔

”حضرت موصوف حنفی مسلک کے ایک بلند پایہ عالم ہیں۔ انھوں نے ہر جگہ اپنے مسلک کی ترجمانی کی ہے۔ ان کے زاویہ نگاہ سے تو اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن ان کے خلوص اور اپنے مسلک سے سچی وفاداری میں مطلق کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔“

آپ نے ۱۹۴۰ء میں اپنی صحافتی زندگی کا آغاز فرمایا۔ اس وقت سے لے کر آج تک لادینی نظریات کے خلاف جب بھی قوم نے اتحاد کی ضرورت محسوس کی، حضرت ضیا الامت ان کوششوں میں کسی سے پیچھے نظر نہیں آتے اور اس سے تو کسی کو مجال انکار نہیں کہ تحریک ختم نبوت ۱۹۴۲ء اور تحریک نظام مصطفیٰ ۱۹۴۴ء میں ضیائے حرم نے صحافتی دنیا میں جو کردار پیش کیا، کوئی اور ماہنامہ اس کی نظیر لانے سے قاصر ہے۔ قوم اگرچہ مندرجہ بالا دو بڑی تحریکوں میں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئی لیکن یہ اتحاد دائمی اور پائیدار ثابت نہ ہو سکا۔ ہو سکتا ہے اس میں بیرونی سازشوں کا بھی اثر ہو، لیکن اس کا بنیادی سبب اتحاد کے لیے کسی ٹھوس بنیاد کا فقدان ہے۔

حضرت ضیا الامت مدظلہ العالی نے جب بار بار اس اتحاد کو قائم ہوتے اور ٹوٹتے دیکھا تو فروری ۱۹۶۶ء کے سرد لبرال کے عنوان کے تحت پائیدار اتحاد کے لیے اپنا

پانچ نکاتی فارمولا پیش فرمایا، جس کی تلخیص پیش خدمت ہے۔

① اتحاد کے داعی کو اپنی دعوت کی سچائی اور افادیت پر اتنا یقین رکھنا

ہونا چاہیے کہ اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات سے کسی طرح

ہراسان نہ ہو۔

② زیادتی کرنے والے فریق کو روکا جائے۔ جس کی حق تلفی ہو، اس کی

حق رسی کی جائے خواہ اس کا تعلق کسی جماعت یا مکتب فکر سے ہو یعنی

حقوق و فرائض کا پلا متوازن رہنا چاہیے۔

③ ہر ایک فریق کو اتنا وسیع الطرف ہونا چاہیے کہ وہ دوسرے

فریق کی بات سنے۔ اس میں دیانت داری سے غور و فکر کرے اور

جس چیز کو حق جانے اسے اپنالے۔

④ عظمت رسالت اور تقدس نبوت ہی دین کی بنیاد ہے۔ اگر کسی بھی

مکتب فکر کے لٹریچر میں کوئی ایسی عبارت ہو جس سے دین کی اس بنیاد پر

اشارہ یا صراحتہ حرف آتا ہو، اسے حذف کر دینا چاہیے، کیونکہ کوئی

بھی غیرت مند مسلمان ایسی صورت حال سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔

⑤ ایک دوسرے پر الزام تراشی کے وقت ہر مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے

افراد حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں اور فرزند ان اسلام پر شرک و کفر کے

فتوے لگانے سے بھی باز نہیں آتے، اس سلسلہ میں ایسے ٹھوس اقدامات

کرنے چاہئیں کہ اس قسم کی غیر محتاط زبانیں بند ہو جائیں۔

حضرت ضیاء الامت کے اس پانچ نکاتی پروگرام کو سامنے رکھ کر قوم ایک پلیٹ فارم

پر جمع ہو سکتی ہے، لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ذاتی مصلحتوں اور دین سے دُوری اور تنگ نظری نے ہمیشہ اس معاملہ کو سلجھانے کی بجائے زیادہ الجھایا ہے۔

### حضرت ضیاء الامت اور اہل سنت

اگرچہ یہ آپ کی انتہائی خواہش ہے کہ پوری ملت اسلامیہ ایک ہی وحدت میں مربوط ہو اور غیر اسلامی قوتیں جہاں بھی اسلام کے خلاف برسرِ پیکار ہیں، ان کا دندان شکن جواب دیا جاتے۔ لیکن گروہی تعصبات اور فکری انتشار نے صورتِ حال کو کچھ زیادہ ہی ابتر کر دیا ہے۔ اسی افراتفری کے عالم میں حضرت ضیاء الامت کے نزدیک اہل سنت کا اتحاد و اتفاق ہی موجودہ حوصلہ شکن حالات میں اصلاحِ احوال کا پیغامبر بن سکتا ہے، کیونکہ ان کے اندر رواداری اور وسعتِ نظری ہے۔ وہ اگر برسرِ اقتدار آئیں گے تو کسی اقلیت کے حقوق تلف نہیں کئے جائیں گے، بلکہ جس طرح پہلے کئی سو سال تک ان کی حکومت کے زیر سایہ ساری اقلیتیں امن و آشتی سے زندگی بسر کرتی رہی ہیں، ان سے اب بھی اسی سلوک کی توقع کی جاسکتی ہے۔

آپ فرمایا کرتے ہیں کہ اہل سنت کے اتحاد میں دین کا بھلا ہے کیونکہ اہل سنت ہی وہ خوش نصیب ہیں جنہوں نے دینِ جزوی طور پر نہیں، کلی طور پر قبول کیا ہے اہل سنت کے اتحاد میں ملت کا بھلا ہے، کیونکہ یہی وہ خوش نصیب ہیں جن کے اندر جذبہٴ جہاد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے، کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ شہادت حاصل کرنے کے بعد انسان مر کر مٹی نہیں ہو جاتا، بلکہ اسے نجاتِ ابدی مل جاتی ہے۔ اگر اہل سنت متحد ہو جائیں گے تو ملک کی نظریاتی اور علاقائی سرحدیں محفوظ ہو جائیں گی۔ ان ہی نیک جذبات کے ساتھ آپ اہل سنت کو

جھنجھوڑتے ہیں اور دعوت اتحاد دیتے ہوتے فرماتے ہیں:

آپ پاکستان کا سوادِ اعظم ہیں۔ آپ ملک کی آبادی کا تقریباً اسی فیصد ہیں۔ اسی نسبت سے پاکستان کی بقا، اس کے استحکام اور اس میں بسنے والے تمام افراد کی خوشحالی کی ذمہ داری بھی آپ پر عائد ہوتی ہے۔ پاکستان کے مستقبل کے ساتھ آپ کا مستقبل وابستہ ہے۔ کیا آپ اپنا فرض اجتماعی حیثیت سے ادا کر رہے ہیں؟ معاف کیجئے! ہرگز نہیں۔

ہماری غنیمتیں انتشار کا شکار ہیں۔ ہم آپس میں بلاوجہ کچھے کچھے رہتے ہیں۔ ہمارے اکابر میں اہل غرض کی نشاندہی بھی کی جاسکتی ہے۔ سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم میں اجتماعی شعور مفقود ہے۔ ہم اپنے ذاتی مفاد کے لیے تو ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ لیکن ملی سطح پر بہت کم سوچتے ہیں۔ ہماری انفرادی خدمات سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن ان میں ایک جہتی کا فقدان انہیں بے اثر بنا دیتا ہے۔ اس میں اہلسنت کے خواص و عام دونوں برابر کے شریک ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم اپنے جائز حقوق کی نگہداشت سے بھی قاصر ہیں۔ ہماری حق تلفیاں کی جاتی ہیں۔ لیکن ہم اس کا سدباب نہیں کر سکتے۔ عدوی اکثریت جب بد نظمی بے حس اور تہدیری کا شکار ہو جاتی ہے تو وہ مات لہما جاتی ہے اور اقلیتیں اپنی تنظیم کے باعث بازمی حیات لیتی ہیں۔

اے سنتِ مصطفوی کے پاس بانو! تمہارے وجود سے گلشنِ اسلام میں بہاریں ہیں۔ گلستانِ وجود میں تمہاری بستی ہی شمعِ محفل ہے۔ خدا را! اپنا فرض پہچانتے اور اپنی امانیت پر اپنی ملت کی عزت کو قربان نہ کیجئے۔ ان

شگین حالات میں اپنی بھرپور اجتماعی کوششوں سے ملک کے اندرونی و بیرونی دشمنوں کو خال میں ملائیے“ (سر دلبر ال اگست ۱۹۷۷ء)

اہل سنت کو اخلاقی اقدار کی پابندی اور اصلاح احوال کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرماتے ہیں :

”سب سے زیادہ ذمہ داری اہل سنت پر عائد ہوتی ہے۔ پاکستان میں ان کی غالب اکثریت ہے۔ اکثریت کے اگر حقوق ہوتے ہیں تو اس کے فرائض بھی اتنے ہی زیادہ ہوتے ہیں۔ اگر وہ سدھر جائیں گے، گناہوں سے نفرت کرنے لگیں گے، نیکیوں سے پیار کرنے لگیں گے، زندگی کے جس شعبہ سے وہ وابستہ ہوں وہاں راست بازی، دیانت داری اور جفاکشی کے چراغ روشن کرتے رہیں گے تو برائی کی قوتیں خود ہی معرکہ حیات میں ہتھیار ڈال دیں گی۔ گناہوں کو حسین پردوں میں چھپا کر فروغ دینے کا دھندا کرنے والے ہمیشہ کے لیے نامراد ہو جائیں گے نیکی کا نور پھیلے گا اور ملک کا گوشہ گوشہ دادی امین بن جائے گا۔ اپنے تشخص کو برقرار رکھنے میں وہ کسی مدہانت کے روادار نہیں ہوں گے۔ لیکن کسی پر زیادتی کسی کی دل شکنی، کسی کی حق تلفی، کسی کو اس کی آئینی مراعات سے محروم کر دینے کا وہ تصور تک بھی نہیں کریں گے اور جب ملک کا سواد اعظم متے خودی سے سرشار، بیدار فرض شناس اور عدل و انصاف کا علم بردار بن جائے گا تو ہر طرف ذہنی اور قلبی آسودگی، ہر طرف سچی اور پاسدار مسرتوں کو چاندنی پھیل جائے گی۔ وہ جماعتیں جن کی تعداد قلیل ہے، وہ اگر سنبھل اور سنور بھی جائیں تو اس سے ملک کا مقدر تو نہیں بدل جائیگا

لیکن شومی قسمت ملاحظہ ہو کہ اہل سنت جن پر اصلاح احوال کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہے۔ یہی انتشار اور ہرقسم کی خرابیوں کا شکار ہیں۔ ساری جماعتوں کی رونق ان کے دم قدم سے ہے، لیکن ان کا اپنا گھر سوتا پڑا ہے۔ لوگ ان کی مرمی سلوں منقش اور رنگدار اینٹوں اور مرصع دروازوں کو اکھیر اکھیر کر لے جا رہے ہیں۔ اور اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا رہے ہیں۔

اور

اہل سنت کو پیسے تو اس کا احساس تک نہیں، اور اگر ہے تو اتنا نحیف و نزار کہ سرو آہوں میں تحلیل ہو کر رہ جاتا ہے اور اگر آنسو بن کر ٹپکتا ہے تو طوفان بن کر اٹھتا نہیں۔ دامن کے کسی گوشہ میں گرتا ہے اور خشک ہو جاتا ہے۔

اونچی جس کی لہر نہیں ہے وہ کیسا دیا

موجیں جس کی تند نہیں ہیں وہ کیسا طوفان

دسمبر ۱۹۷۷ء

## حضرت ضیاء الامت اور مشائخ عظام

حضرت ضیاء الامت چونکہ بذات خود مشائخ کرام کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھیں بھلا کب گوارا تھا کہ دوسرے تمام طبقے تو اپنی ذمہ داریاں پہچانیں۔ اور مشائخ کرام اپنی ناو طوفان کے تھپیڑوں کے حوالے کر دیں۔ آپ نے اپنا فرض منصبی سمجھا کہ انھیں بھی اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلایا جائے لیکن ان کے رویہ کا جائزہ لیتے ہوئے ادب کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ فرماتے ہیں:



”اگر میرے کرم فرما مجھ سے برہم نہ ہوں تو حدیث دل زباں پر لاؤں۔ اور زخم جگر سے پردہ اٹھاؤں۔ نہیں! نہیں!..... ان کی برہمی کا خطرہ مول لیتے ہوتے بھی بصد ادب و نیاز عرض کروں گا۔“

موجودہ صورت حال کی ساری نہیں تو بیشتر ذمہ داری پیر صاحبان پر عائد ہوتی ہے، جو اہل سنت کے کشورِ دل کے سلطان ہیں۔ جو ہماری عقیدتوں کا مرکز ہیں۔ جو ہمارے عشق و مستی کا عنوان ہیں۔ جن کے اشارہ ابرو پر ہر نیک دل سنی دل و جان قربان کرنے کے لیے تیار ہے۔ یہ تسلیم کہ انھوں نے پاکستان کے حصول میں قابل فخر حصہ لیا ہے، لیکن پاکستان کو اسلامی سلطنت بنانے کے لیے جس مسلسل جدوجہد کی ضرورت تھی، غیر اسلامی تحریکوں کو ختم کرنے کے لیے عملی اور فکری میدان میں جس جہاد کی ضرورت تھی اس کی طرف انھوں نے توجہ نہیں دی۔ اہل سنت کو منظم اور متحد کرنے کی اہمیت کا انھوں نے اندازہ نہیں لگایا۔ اور امت کا سوادِ اعظم ایک شکرِ جزار کی بجائے بھیسڑوں کا گلہ بن کر رہ گیا ہے۔ ہمارے مستقبل کا مورخ ان سے پوچھ سکتا ہے۔

رشتہ الفت میں جب ان کو پرو سکتا تھا تو

پھر پریشاں کیوں ترمی تسبیح کے دانے رہے

ہمارے مشائخ کرام کی بے پرواہی اور لاتعلقی سے اہل سنت کو نقصانِ عظیم

پہنچا ہے اور پہنچ رہا ہے، لیکن اب بھی اگر ادائے فرض کا احساس بیدار

ہو جائے تو اس کی تلافی چنداں مشکل نہیں۔ ہر شیخ کا اپنا حلقہٴ ارادت ہے

جو اپنے شیخ پر پورا اعتماد رکھتا ہے، اگر پاکستان کے مشائخ کرام سے صرف چند جن کا علم و فضل، جن کا تقویٰ اور لٹہیت، جن کی ایمانی بصیرت اور فراست ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے، جن کا ماضی ماہتاب و آفتاب سے تابندہ تر ہے، باہم متحد ہو جائیں تو پاکستان کے چاروں صوبوں کے سنی نظام مصطفیٰ کے تحفظ کے لیے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں گے۔ دینی، اخلاقی معاشرتی معاشی اور سیاسی میدانوں میں جو خرابیاں ملت کی رسوائی کا باعث بنی ہوئی ہیں۔ ان کا قلع قمع ہو سکتا ہے۔ ہر سنی کے دل میں اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے کام صرف اتنا ہے کہ اس میں اٹھنے والی شوخ و شنگ موبوں کو منظم کر دیا جائے۔ اگر ہمارے مشائخ یہ فرض ادا کریں تو بخدا ہم باطل کے ہر شکر کو ہزیمت دے سکتے ہیں۔ لا دینیت کی تحریکیں خود بخود حروف غلط کی طرح مت جائیں گے۔ برائی اور گناہوں کا نام و نشان تک نہ رہے گا۔ سارا پاکستان صحن حرم کی طرح مصطفیٰ و محلی اور اس کی فضائیں معطر و معنبر بن جائیں گی۔

ناموس ازل را تو ایمنی، تو ایسنی

دارائے جہاں را تو یساری، تو ایسنی

بندۂ خاکی! تو زمانی، تو ایسنی

معمار حرم! باز بتعمیر جہاں نیز از خواب گراں خواہ گراں خواہ گراں نیز

لیکن اگر مشائخ کرام نے اس وقت کی پکار کی طرف توجہ نہ دی اور حالات

کارخ اپنی ہمت مردانہ سے موڑ نہ دیا تو پھر ان کے نیاز مند بسند حسرت و یاس

یہ کہنے میں سچے ہوں گے سے

شوق بے پروا گیا، فنکرنک پچا گیا  
تیری محفل میں نہ دیوانے نہ فرزانے رہے  
خیر تو ساقی سہی سیکن پلانے گا کہے  
اب وہ میکش رہے باقی نہ منخانے رہے  
رو رہی ہے آج اک ٹوٹی ہوئی مینا سے  
کل تک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے

(سر دلبراں دسمبر ۱۹۶۷ء)

اوپر والی سطور کو بار بار پڑھیے اور اندازہ لگائیے کہ ادائے فرض کے احساس نے کس  
درجہ آپ کو حدیثِ دل زبان پر لانے کے لیے مجبور کر دیا اور ہر ہر لفظ سے ٹپکتا ہوا خلوص  
احساس زیاں کی کتنی بھرپور ترجمانی کر رہا ہے۔

یہ تو ادائے فرض پر ابھارا جا رہا تھا اور اب دیکھیے! اہل سنت کے تمام رہنماؤں  
کو اپنے حقوق کے حصول کے لیے کس طرح جھنجھوڑا جا رہا ہے۔ فرماتے ہیں:  
”آخر یہ فقیرِ فقیرِ فقیرِ مشائخِ کرام، پیرانِ عظام اور علمائے ربانیین کی  
خدمت میں بصد ادب ملتمس ہے کہ حالات کے تیور آپ کے سامنے ہیں  
سوادِ اعظم کے معتقدات کو مسخ کیا جا رہا ہے۔ ان کی گھریلو زندگی کے تقدس  
کو پامال کرنے کے لیے مشورے ہو رہے ہیں۔ ان کی خانگی سکون کو برباد کیا  
جا رہا ہے۔ ان کی آئندہ نسلوں کو بگاڑا جا رہا ہے۔“

یہ ”ان کے“ اور ”ان کی“ کے لفظ تو میں نے پاس ادب کے لیے

لکھے ہیں۔ آپ ان کی جگہ ”آپ کے“ اور ”آپ کی“ بھی پڑھ سکتے ہیں، پھر بھی آپ اپنی شیرازہ بندی کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ جب طوفان آئے گا تو آپ کے مریدوں کے ساتھ آپ کی خانقاہیں اور حرم سراہیں بھی محفوظ نہیں رہیں گی۔ اگر آپ دین اور سیاست کو الگ الگ سمجھتے ہیں، اگر آپ اس تشلیت پر برہم نہیں ہوتے کہ ”اسلام ہمارا دین ہے“ جمہوریت ہماری سیاست ہے۔ اور ”سوشلزم ہماری معیشت ہے“ تو بے شک سیاست کے میدان میں قدم رنجہ نہ فرمائیے لیکن کم از کم دین کو تو بچا دیجیے، ان ہاتھوں کو تو کپڑے لہجے جو شریعت بریضا کے خدو خال کو مسخ کرنا چاہتے ہیں۔ کم از کم ان قزاقوں کا راستہ تو بہادری کے ساتھ روکتے جو آپ کے معتقدین کی عصمت و ناموس پر دن و ہاڑے ڈاکے ڈالنے کی سازشوں میں مصروف ہیں۔ عیسائیوں کے حقوق ہیں، جھنگیوں کے حقوق ہیں، پارسیوں کے حقوق ہیں، قادیانیوں کے حقوق ہیں کیونکہ یہ پاکستان میں بسنے والی اقلیتیں ہیں، آئین، قانون اور اخلاق ان کے حقوق کی ضمانت دیتے ہیں۔ اسے سوادِ اعظم! تم ہی ایسے ہو جن کے کوئی حقوق نہیں، جس طرح کوئی چاہے ان کا حلیہ بگاڑتا رہے۔“

(سرولبر ان سلسلہ جنوری)

ان مسندِ جہ بالا چند عنوانات کے تحت آپ نے حضرت ضیاء الامت کے میدانِ صحافت میں جاندار کردار کی ایک جھلمک ملاحظہ فرمائی اور ملتِ اسلامیہ کے ساتھ آپ کے خلوصِ محبت اور لگن کا جائزہ لیا۔

## حضرت ضیاء الامت کا سیاسی کردار

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں انسانیت کی پوری رہنمائی کرتا ہے۔ جو لوگ اسلام کی سر بلندی کے لیے مصروف کار ہوتے ہیں یا جو اپنی زندگی کے ہر پہلو کو اسی سانچے میں ڈھالے ہوئے ہوتے ہیں وہ ذاتی یا گروہی مفادات سے بالاتر ہو کر ہر معاملے کو اسلام کی عینک سے ہی ملاحظہ کرتے ہیں۔ حضرت ضیاء الامت مدظلہ العالی کی زندگی جس طرح ہر میدان میں اسلام کی بالادستی کی آئینہ دار ہے، اسی طرح سیاسی میدان بھی آپ ”تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان“ کے قرآنی احکام پر مکمل عمل فرماتے ہیں۔ آپ نے سیاست کو نہ پیشہ بنایا اور نہ ہی ذاتی مفاد کا ذریعہ۔ بلکہ اپنے سیاسی کردار کو ہر اس آلائش سے پاک رکھا جو دور حاضر میں سیاستدانوں یا سیاسی کارکنوں کا وطیرہ بن چکا ہے۔ آپ ملک کی ایک ممتاز سیاسی جماعت کے مرکزی نائب صدر اول کے عہدہ پر فائز رہے۔ اور اس کے ایک کارکن کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے، لیکن آپ کا بڑے سے بڑا مخالف بھی آپ کے کردار پر کسی قسم کا اعتراض نہیں کر سکتا۔ آپ کی مخالفت اور حمایت میں ذاتی اغراض و مقاصد کا قطعاً کوئی دخل نہیں، بلکہ خدا اور اس کے حبیب مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا اور خوشنودی ہی آپ کا نصب العین ہے اور اسی مقصد کے حصول کے لیے آپ تحریری اور تقریری سیاسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ سیاست میں ملکی مفادات اور پاکستان کے استحکام کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ بڑی جرأت اور پامردی سے اعلیٰ کلمۃ الحق کا فریضہ بلا خوف و خطر ادا کر رہے ہیں۔

اپنے مخالفین کی اچھائیوں اور اپنوں کی کمزوریوں کے اعتراف میں انھوں نے کبھی  
 بخل سے کام نہیں لیا۔ اور نہ ہی حق کو مصلحت اور مفادات کے پردے میں چھپانے کی  
 کبھی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا سیاسی کردار قابلِ تعریف اور تمام تر  
 آلودگیوں سے پاک و صاف رہا۔ اس سلسلہ میں آپ کی تحریروں اور تقریروں کے لچپند  
 اقتباسات یقیناً مفید رہیں گے۔ ملاحظہ کیجئے :

ماہنامہ دنیا نے حرمِ جولائی ۱۹۷۵ء کے سردلبراً میں پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ  
 حنیف رامے کے رویہ پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”ہمارے وزیرِ اعلیٰ بھی بڑے مزے کے آدمی ہیں۔ آیتیں بھی پڑھتے ہیں  
 اور اشتراکیت کے گن بھی گاتے ہیں اور اس کو اپنی دانشورمی کا کمال بھی خیال  
 کرتے ہیں۔ حق و باطل کی یہ آمیزش معلوم نہیں ہمارے وزیرِ اعلیٰ کے لیے کس  
 طرح قابلِ قبول ہے۔ ان کے نام میں ”حنیف“ اور ”رامے“ کا جو بے ربط  
 جوڑ ہے، شاید اس کا اثر ہو۔ بہر حال ہم ان کی خدمت میں عرض کر دینا ضروری  
 سمجھتے ہیں کہ پاکستان کے لیے کسی سوشلسٹ یا کمیونسٹ نے کوئی قربانی نہیں  
 دی۔ اس گلشن کی آبیاری فرزند ان توحید نے اپنے خونِ ناب سے کی ہے۔  
 اس کا حصول اور اس کی بقا علامانِ مصطفیٰ علیہ الطیب التیہ و اجمل الثناء کی  
 مخلصانہ سرفروشیوں کی مہربانِ منت ہے۔ اگر پاکستان کی مانگ میں شہیدوں  
 کے خون کی سرخی دمک نہ رہی ہوتی، اگر یتیموں اور یتیموں کے آنسوؤں کے  
 موتیوں کا جھومر اس کی پیشانی کو مزین نہ کر رہا ہوتا، تو شاید کوئی اس مذموم  
 ارادے میں کامیاب ہو جاتا، لیکن جہاں شہیدوں کے خون کی چمک چشم

مہر و ماہ کو تیرہ کر رہی ہو وہاں انسانیت و کردار کشی کی سرانڈ میں لسی ہوئی اشتراکیت سے پاکستان کی مانگ کو ملوث کرنا کون عقلمند گوارا کر لے گا۔ ہمارے وزیرِ اعلیٰ اس غلط فہمی سے جتنا جلد چھٹکارا حاصل کر لیں گے اتنا ہی ان کے لیے مفید ہوگا۔

سارے کمیونسٹ سن لیں اور ہمارے وزیرِ اعلیٰ بھی، اگر وہ خدا نخواستہ کمیونسٹ ہیں تو وہ بھی سن لیں کہ پاکستان نے اسلام کی آغوش میں جنم لیا ہے۔ اسلام کی آغوش میں پروان چڑھا ہے۔ اور جب تک یہ زندہ رہے گا اس کی فضاؤں میں صرف اسلام کا پرچم ہی لہرا سکتا ہے۔“

شمارہ دسمبر ۱۹۷۵ء میں رقم طراز ہیں؛

”پیپلز پارٹی کے لچھن صاف بتا رہے تھے کہ کھلنڈرے بے فکروں کا یہ طائفہ لٹیا ڈبو کر رہے گا۔ ان میں نہ حالات کا مزاج پہچاننے کی صلاحیت ہے اور نہ حالات سے نبرد آزما ہونے کی اہلیت ہے۔ تعمیری جدوجہد کے لیے جس متانت اور سنجیدگی کی ضرورت ہے، یہ طائفہ اس سے یکسر بے بہرہ ہے۔ اُبڑے ہوئے چمن کو پھر بہار آسٹنا کرنا مدار یوں کے بس کا روگ نہیں اگر کسی کو اس پارٹی کے بارے میں غلط فہمی تھی بھی تو وہ اس رات دور ہو گئی جس رات لاڈکانہ میں جشنِ عیش و نشاط منایا گیا۔ شراب کے خم کے خم لٹھکائے گئے اور ملک کا عوامی صدر اپنے حواریوں کے ساتھ دنیا بھر کے سفراء کی آنکھوں کے سامنے رنگ رلیاں منانے میں مصروف ہو گیا۔“

(سر ڈیبرا۔ دسمبر ۱۹۷۵ء)

## اظہارِ وجوہِ کانولس

جب مندرجہ بالا ”سر ڈبلراں“ جس کا ایک اقتباس ہدیہ قارئین کیا گیا ہے، حکومت کے اہل کاروں کی نظر سے گزرا تو انھیں اپنا قصہ اقتدار لرزتا ہوا دکھائی دیا، جس کے نتیجے میں ضیاء الامت کے نام اظہارِ وجوہِ کانولس جاری کیا گیا۔ تاریخ پیشی کے موقع پر آپ عدالت میں پہنچے، کچھ دیر انتظار کے بعد منعلقہ افسر کے کیس میں اپنے موقف کی وضاحت کے لیے آپ کو بلایا گیا۔

افسر : آپ نے اپنے ادارہ میں صدرِ پاکستان پر الزام تراشی کی ہے، کیوں؟  
ضیاء الامت : میں نے الزام تراشی نہیں کی بلکہ ایک حقیقت قوم کے سامنے پیش کی ہے۔

افسر : آپ پاکستان کے عملاً کی صف اول میں شمار ہوتے ہیں۔ کیا یہ شرعی لحاظ سے جائز ہے کہ بغیر دیکھے خواہ مخواہ کسی کے بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار کیا جائے۔ کیا ان جرائم کے آپ عینی شاہد ہیں جن کا تذکرہ آپ نے اپنی تحریر میں کیا ہے۔

ضیاء الامت : ہر چیز کا ثبوت صرف عینی شہادت پر ہی منحصر نہیں، بنا دست ہی بیانات ایسی ہیں جن کا بغیر عینی مشاہدہ کے بھی علم قطعی ہوتا ہے۔

افسر : یہ کیسے ممکن ہے؟

ضیاء الامت : لندن شہر میں نے دیکھا نہیں۔ اس کی آبادی میں نے کبھی نہیں لیکن کیا میرا

لسہ : اس وقت آپ ابھی لندن نہیں گئے تھے۔



اسے نہ دیکھنا میرے نزدیک اس کے وجود کی نفی کو مستلزم ہے؛ کیا یہ میں کہہ سکتا ہوں چونکہ میں نے لندن نہیں دیکھا، اس لیے اس کا وجود ہی نہیں۔

افسر : بہر حال آپ ہمارے لیے محترم ہیں۔ حکومتی حلقوں میں آپ کے سرڈلبرگ کی وجہ سے کافی ہراس ہے۔ آپ محتاط پالیسی اختیار کریں۔

ضیاء الامت : میں جس چیز کو حقیق سمجھوں گا، اس کا اظہار بہر حال کروں گا۔

افسر : اگر آپ اس طرز عمل سے باز نہ آتے تو آپ کے ماہنامہ کا ڈیکلریشن منسوخ کر دیا جائیگا۔

ضیاء الامت : جس دن میں اظہارِ حقیق نہ کر سکا، اس روز میں خود بخود یہ ماہنامہ بند کر دوں گا۔

تحریک نظامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۱۹۷۷ء کے سلسلہ میں جس دن عدالت نے آپ کو چار ماہ قید با مشقت کی سزا سنائی، عدالت کے سامنے کھڑے ملاقاتیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”بہمیں جیل میں کوئی تکلیف نہیں اور اگر خدا نخواستہ کوئی ایسی صورت حال پیش آ بھی جائے تو محبت کی راہ میں کانٹے پھولوں سے بھی زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ کی رحمت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ ہماری دعاؤں کی پذیرائی ہونے والی ہے۔ اپنے جذبات کو سرد نہ ہونے دینا، کامیابی انشا اللہ جلد ہی آپ کے قدم چومے گی“

آپ نے فرمایا :

”تحریک میں صرف وہی لوگ شامل نہیں جو جیلوں میں ہیں، بلکہ جیلوں سے باہر جو لوگ اس جدوجہد میں مصروف ہیں، ان کا بھی اتنا ہی حصہ ہے۔“

اب بھٹو صاحب کہتے ہیں :

”میں اپنے آپ کو دھاندلی کروانے والے وزیرِ اعظم کے نام سے

یاد نہیں کروانا چاہتا۔“

میں اسے کہتا ہوں، تاریخ وہ نہیں جو تیری یا تیرے گماشتوں کی خواہش ہوگی۔

بلکہ تاریخ تو غیر جانب دار حقیقتوں کا نام ہے جس نے تیرے ماتھے پر سیاہی کا بدنام داغ لگا دیا ہے۔ میں تجھے مشورہ دیتا ہوں کہ اس سے زیادہ تم اپنے آپ کو قوم کا قاتل بننے کے لقب سے مشہور ہونے سے باز آ جاؤ۔

نو تاریخ کا واقعہ تاریخ انسانیت کا بدترین سانحہ ہے۔ تم اسمبلی ہال میں بیٹھے نام نہان نمائندگان کو خطاب کر رہے تھے۔ تیری فیڈرل سکیورٹی فورس اور ظالم پولیس کے افراد قوم کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے سروں سے عزت کی چادریں اتار رہے تھے۔ ان پر گولیاں چلائی جا رہی تھیں۔ اور ان کے سینوں کو سنگینوں سے چھلنی کیا جا رہا تھا۔“

آپ نے فرمایا :

”اے بھٹو! ہم تو اس نقصان کی تلافی بھی ساری عمر نہیں کر سکتے جو تو نے

پچھلے چھ سالوں میں پاکستانی قوم کو پہنچایا ہے۔ چہ جائیکہ ہم تجھے ایک بار پھر

اپنے اوپر مسلط کر لیں۔ یہاں سارے بشرِ حسن اور شیخ رشید نہیں بستے جن

کے ضمیر مردہ ہو چکے ہیں اور جن میں غیرت کی روتی تک بھی باقی نہیں بلکہ یہاں

”کرم شاہ“ اور اس جیسے ہزاروں دین و ملت کا درد رکھنے والے لوگ

موجود ہیں۔“

آپ نے سامعین سے استفسار فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا :

”پاکستان بنانے میں بھٹو کا کوئی حصہ نہیں۔ اور ہم اسے اس بات کی اجازت بھی نہیں دیتے کہ جس گلشن کو ہم نے اپنے خون ناپ سے سینچا ہے، اسے ویران کرنے کے لیے ہم تیرے حوالے کر دیں۔“

آپ نے ارشاد فرمایا:

”جب بھٹو برسرِ اقتدار آیا تھا، ہم نے اس وقت بھی پیچ پیچ کر کہا تھا کہ قومیں اپنی تقدیر مداروں کے حوالے نہیں کیا کرتیں، لیکن قوم نے نادانستہ طور پر یہ عظیم غلطی کی اب وقت ہے، اس بدنام داغ کو اپنی قوم کے وجود سے دھو ڈالیں۔ یہ تحریک اس وقت تک جاری رہے گی، جب تک کہ ہم پیلر پارٹی کی ارتحی نکال کر اس کی راکھ کو گنگا کے پانی میں نہ بہا دیں۔ پاکستان کا بچہ بچہ اس سرزمین پاک کی عظمت و ناموس پر قربان ہونے کے لیے تیار ہے۔“

آپ نے فرمایا:

”میں اقتدار کی بات نہیں کرتا۔ اقتصادی بد حالی کی بات نہیں کرتا بلکہ سوال ان اخلاقی قدروں کی تزیل کا ہے، جن پر ملت کی عظمت کا دار و مدار ہے۔“

آپ نے مزید فرمایا:

”بھٹو کے مقدر میں انتحابی دھاندلیوں کے بارے میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے، اسے اب کوئی طاقت نہیں مٹا سکتی؛ قد جف القلم ایہ

لہ، قلم تقدیر نے اس پر مہر ثبت کر دی ہے۔

آپ نے ایک اچھے اور صاحب بصیرت سیاستدان کی حیثیت سے جو پیشگوئیاں کیں، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ درست ثابت ہوئیں۔ ملک کے بہترین خیر خواہ اور محب وطن سیاستدان کی طرح آپ ہمیشہ اتحاد و اتفاق اور باہمی یگانگت پر زور دیتے رہے ہیں تاکہ پاکستان کے تمام مسلمان مل کر اسلام کی سر بلندی اور پاکستان کے استحکام کے لیے مفید خدمات انجام دے سکیں اور پاک سر زمین اسلام کے نور سے منور و روشن ہو جائے۔ جہاں شخص امن و سکون کی زندگی بسر کر سکے۔

## تصنیفات

کسی نظریہ حیات کو بقا و دوام صرف اس وقت تک نصیب رہتا ہے جب تک وہ بنی نوع انسان کے لیے فیض رساں اور نفع بخش رہے۔ چونکہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس کی بقا خود رب قدوس نے اپنے ذمہ کر لے رکھی ہے۔ اس لیے وہ ہر زمانہ میں ایسی جلیل القدر ہستیاں پیدا فرماتا ہے جو اس وقت کے تقاضوں کے مطابق اسلامی تعلیمات کو مدون کرتی ہیں۔ بے شک برصغیر پاک و ہند میں اردو زبان میں اسلامی لٹریچر کا ایک بیش بہا خزانہ موجود تھا، لیکن عصری تقاضوں نے جہاں ایک طرف لوگوں کو سہل پسند بنا دیا ہے تو دوسری طرف مادیت کی طغیاری اور روحانیت کے فقدان نے عقل عیار کو سو بھیس عطا کر رکھے ہیں۔ حضرت ضیا الامت کی باریک بین اور دور رس نگاہوں نے حالات کے بدلتے ہوئے رخ کار وقت جائزہ لیا اور سب سے پہلے منکرین سنت کے رد میں اپنی معرکہ الآراء کتاب "سنت خیر الامم" قوم کے ان نوجوانوں کی خدمت میں پیش کی جو غلام احمد پرویز جیسے نام نہاد مصلح اور تجدید پسند کے دام ہمہ رنگ زمین میں

گرفتار ہوتے چلے جا رہے تھے۔ حضرت ضیاء الامت کا یہ نظریہ میدانِ عمل میں بالکل سوتا  
فی صدیح صحیح ہے :

”پیاسے کو اپنی پیاس بھجانے کے لیے مشروب کی ضرورت ہوتی ہے  
اگر آپ اُسے ٹھنڈا اور صاف پانی میسر نہیں کر سکتے تو وہ گدلا پانی پی کر گزارہ  
کر لے گا“

غلام احمد پرویز کے مکدر جوہر سے اپنی مذہبی تشتمل کامی کامد اوہمی کرنے والوں کو جب  
”سنت خیر الانام“ جیسا میٹھا اور شیریں چشمہ دستیاب ہوا تو اس کی تحریروں کی طرف کسی  
نے دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ ایک وقت تھا جب ”فتنہ انکارِ سنت“ انتہائی برعت کے  
ساتھ بڑھا ہوا دکھائی دے رہا تھا، لیکن حضرت ضیاء الامت کی اس نمکت تصنیف کے  
بعد ڈھونڈے سے بھی اس کا نام نہیں ملتا۔

سرورِ علم پاتا ہے جو پی لے ایک جام ان سے  
زمانہ سیکھتا ہے سنت خیر الانام ان سے

(سیدِ خضر چشتی)

سنت خیر الانام حضرت پیر صاحب قبلہ کے بہارِ آفریں قلم اور گوہرِ بارک ملک کا شاہکار  
ہے۔ اگرچہ یہ کتاب انھوں نے اس وقت لکھی تھی جب وہ ۱۳۴۳ھ میں جامعہ ازہر،  
مصر میں زیرِ تعلیم تھے لیکن زورِ بیاں، اسلوبِ نگارش اور طرزِ استدلال کے لحاظ سے  
اس کو کسی تامل کے بغیر نہایت اونچے درجے کی علمی کتابوں میں رکھا جاسکتا ہے۔ ہر صحیح  
العقیدہ مسلمان کا نظریہ ہے :

مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

گر بہ او ز سیدی تمام بولہبی است (اقبال)

یہ کتاب اسی عقیدہ کی ایمان افروز تشریح اور تفسیر ہے۔ فاضل مصنف نے اس کتاب کو بڑی محنت اور تحقیق و تفحص کے ساتھ قلمبند کیا ہے اور قرآن حکیم کے علاوہ تفسیر، حدیث رجال، حدیث، فقہ و اصول فقہ، سیرت و تاریخ اور لغت کی انٹائیس بند پارہ کتب سے استفادہ کیا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔

فاضل مصنف کا انداز نگارش نہایت عالمانہ لیکن بے حد شگفتہ ہے۔ طرزِ بیاں نہایت شستہ اور دلنشین، دلائل بڑے واضح اور محکم ہیں۔ دراست و رواست اور عقل و نقل ہر اعتبار سے یہ کتاب لاجواب ہے۔ اس میں منکرین حدیث کے انکار و دلائل کے بخینے ادھیڑ کر رکھ دیئے گئے ہیں۔ اس کو پڑھ کر ایمان تازہ ہو جاتا ہے اور یہ عقیدہ پختہ سے پختہ تر ہو جاتا ہے کہ اطاعتِ رسول کے بغیر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ (طالب ہاشمی)

## ضیاء القرآن

حضرت ضیاء الامت مدظلہ العالی نے انیس سال کی طویل مدت میں پینتیس سو صفحات پر مشتمل قرآن کریم کی تفسیر پانچ جلدوں میں مکمل فرمائی ہے، جس کو اردو زبان میں عہد حاضر کی بلند ترین تفسیر کہا جاسکتا ہے تفسیر ضیاء القرآن کیا ہے؟ اس کی خصوصیات کیا ہیں؟ اس بارے میں اظہار خیال کے لیے ایک طویل کتاب درکار ہے۔ میرے پیش نظر اس وقت چونکہ صاحب تفسیر کا تعارف ہے۔ اس لیے اس میدان میں آپ کے تبحر علمی کا اندازہ

لگانے کے لیے اجمالی طور پر اس کا جائزہ ہدیہ قارئین کروں گا۔

## ترجمہ کے اوصاف حضرت ضیاء الامت کی زبانی

”جو تراجم میری نظر سے گزرے ہیں وہ عموماً دو قسم کے ہیں۔ ایک قسم تحت اللفظ تراجم کی ہے، لیکن ان میں وہ زور بیاں مفقود ہے جو قرآن کریم کا طرہ امتیاز بلکہ روح رواں ہے۔ دوسری قسم با محاورہ تراجم کی ہے ان میں وقت یہ ہے کہ لفظ کہیں ہوتا ہے اور اس کا ترجمہ دو سطر پہلے یا دو سطر بعد درج ہوتا ہے، اور مطالعہ کرنے والا یہ معلوم نہیں کر سکتا کہ میں جو نیچے لکھا ہوا ترجمہ پڑھ رہا ہوں، اس کا تعلق کس کلمہ یا جملہ سے ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ان دونوں طرزوں کو اس طرح یکجا کر دوں کہ کلام کا تسلسل اور روانی بھی برقرار رہے اور زور بیاں میں بھی حتی الامکان فرق نہ آئے اور ہر کلمہ کا ترجمہ بھی اس کے نیچے مرقوم ہو۔“

قرآن پاک عربی زبان میں نازل ہوا۔ عربی کا اپنا ادب ہے۔ اس کی فصاحت و بلاغت کا اپنا معیار ہے۔ قواعد اشتقاق نے تو اس کے اندر اتنی وسعت پیدا کر دی ہے کہ دنیا کی کوئی ترقی یافتہ زبان بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

عربی زبان میں ایک ایک لفظ کے لیے سینکڑوں مترادف الفاظ ہیں لیکن قرآن حکیم کا یہ اعجاز ہے کہ حکمت الہیہ نے جو لفظ جہاں سمودیا ہے۔ اس کو بٹایا نہیں جاسکتا اور نہ ہی اس کی جگہ کوئی مترادف لفظ لایا جاسکتا ہے۔

جہاں کہیں بھی کوئی لغوی، نحوی یا صرفی الجھن اور پھپھکی نظر آئی میں نے  
کوشش کی ہے کہ آئمہ فن کے مستند حوالوں اور اقوال سے اس کا حل پیش  
کر دوں تاکہ کوئی خلش باقی نہ رہے۔“

① جب میں نے ترجمہ شروع کیا، تو بعض مقامات پر دوسرے مترجمین سے  
میرا اختلاف ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ انفاحہ میں ارشاد فرمایا: ”رب العلمین“  
اس کا ترجمہ اکثر حضرات نے ”پالنے والا“ اور ”مالک“ وغیرہ کے الفاظ سے  
کیا ہے، لیکن حقیقت لفظ ”رب“ مصدر ہے۔ اس کا معنی ہے ”تربیت“  
اور تربیت عربی میں کہتے ہیں: تبلیغ الشیء الی کمالہ بحسب استعدادہ  
الذلی شیئاً فشیئاً (کسی چیز کو اس کی ازلی استعداد اور فطری صلاحیت کے  
مطابق آہستہ آہستہ مرتبہ کمال تک پہنچانا،

اس لغوی مفہوم کو مد نظر رکھتے ہوئے اب لفظ ”رب“ کا ترجمہ کریں تو  
”پالنے والا“ یا ”مالک“ نہیں بلکہ ترجمہ ہو گا: ”مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے“  
تمام جہانوں کا: (خطاب جس میں ہوٹل، کراچی)

② تفسیر ضیاء القرآن کے ترجمہ کے اوصاف اور اس کی ایک مثال آپ نے حضرت  
ضیاء الامت کی زبانی ملاحظہ فرمائی اس کی تائید میں چند مثالیں اور ملاحظہ فرمائیے:  
(۱) سورہ الحجرات میں اللہ تبارک و تعالیٰ صحابہ کرامؓ کی صفات بیان فرمانے کے  
بعد ارشاد فرماتا ہے: اولئک ہم الراشدون ط

عام مترجمین نے اس کا ترجمہ ”وہی ہدایت پانے والے ہیں“ وغیرہ کے الفاظ سے  
کیا ہے، لیکن حضرت ضیاء الامت کی فکر سا لفظ ”راشد“ کی گہرائیوں تک جا پہنچی۔



اور اس لفظ کا مادہ اشتقاق تلاش کرنے کے بعد اسی کی روشنی میں اس کا ترجمہ کیا۔ قرطبی کے حوالے سے فرماتے ہیں:

الرشد: الاستقامة على طريق الحق مع تصلب فيه من

الرشدة وهي الصفة

”یعنی رشد، جاوہ حق پر ایسی ثابت قدمی کو کہتے ہیں جس میں تصلب اور سختگی ہو،

تذبذب کا وہاں نشان تک نہ ہو۔ یہ رشده سے مشتق ہے، جس کا معنی ہے:

چٹان“

اب اس لفظی تحقیق کے بعد اولئك هم الراشدون کا ترجمہ حضرت ضیاء الامت

کی زبانی ملاحظہ کیجئے۔ فرماتے ہیں:

”یہی لوگ راہِ حق پر ثابت قدم ہیں“

یعنی جس طرح چٹان اپنی جگہ سے نہیں ہلتی، اسی طرح یہ لوگ بھی راہِ ہدایت سے دور

نہیں ہوتے۔

اب، انا فتحنا لك فتحا مبينا ليغفر لك الله ما تقدم من

ذنبا وما تاخر-

سورہ فتح کی دوسری آیت کا ترجمہ کرتے وقت بعض مترجمین نے مقامِ نبوت کا لحاظ

تک نہیں رکھا۔ اور بعض صالح فکر مترجمین نے تقدسِ نبوت اور عصمتِ رسالت کے

اجتماعی عقیدہ کے پیش نظر اس آیت طیبہ کے اندر مذکور لفظ ”ذنب“ کی نسبت ذاتِ

پاک محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے ”امت“ کی طرف کی ہے۔

اور بعض نے ”ذنب“ کو خلافِ اولیٰ کے معنی میں لیا ہے۔ علاوہ ازیں چند تاویلات

اور بھی گئی ہیں، لیکن کلام کے سیاق و سباق کو پیش نظر رکھا جائے تو ان میں سے کوئی مفہوم بھی یہاں چسپاں نہیں ہوتا۔

فتح مبین کی غرض و غایت یا اس کا نتیجہ اور انجام مغفرت بتایا گیا ہے، لیکن فتح اور مغفرت میں کوئی مناسبت نہیں اس لیے حضرت ضیاء الامت نے اس مقام پر مزید غور و فکر کی ضرورت محسوس کی۔ اور کم و بیش ایک ماہ کی مسلسل تحقیق و تجسس کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہنچے :

لفظ ”ذنب“ بذات خود اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے۔ اس کا معنی صرف گناہ نہیں بلکہ قرآن کریم کے اندر یہ الزام کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

وَلِيَهُمْ عَلَى ذَنْبٍ فَخَافَ أَنْ يَقْتُلُوهُ ۝

ترجمہ: اور ان کی طرف سے مجھ پر الزام قتل ہے۔ میں خوف محسوس کرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔

اس لغوی تحقیق کے بعد آپ نے اس آیت کا جو ترجمہ فرمایا ہے وہ یہ ہے :

”یقیناً ہم نے آپ کو شاندار فتح عطا فرمائی ہے تاکہ دور فرما دے آپ کے لیے اللہ تعالیٰ جو الزامات آپ پر (ہجرت سے) پہلے لگائے گئے تھے اور جو (ہجرت کے) بعد لگائے گئے“

وہ الزامات کیا تھے؟ ان کی فہرست آپ نے حوالہ جات کے ساتھ درج فرمائی ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں، ضیاء القرآن، جلد چہارم)

اس لفظی تحقیق اور پھر ترجمہ میں سیاق و سباق کے ربط نے صاحب تفسیر کو باقی مترجمین

مفسرین سے ممتاز مقام عطا فرما دیا ہے۔

ترجمہ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے حضرت ضیا الامت نے ارشاد فرمایا تھا :  
 ”میں نے کوشش کی ہے کہ دونوں قسم کے تراجم تحت اللفظ اور بامحاورہ  
 کو یکجا کروں۔“

اس میں آپ کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اگر آپ اس کا بالتفصیل جائزہ لینا  
 چاہیں تو ضیاء القرآن کے صفحات ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ اس مقام پر میں صرف چند اہل الرائے  
 حضرات کی نگارشات قلمبند کروں گا۔

”اس تفسیر کی سب سے بڑی خوبی ترجمہ قرآن ہے۔ ترجمہ کا یہ انداز بے مثل  
 اور بے نظیر ہے اور قرآن پاک کی ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ کو سمجھنے کے  
 لیے نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس باب میں حق تعالیٰ نے  
 خود حضرت پیر صاحب کی راہنمائی فرمائی ہے اور انھیں ایسا عمدہ اور رواں دواں  
 ترجمہ کرنے کی توفیق ارزانی فرمائی۔ یہ ترجمہ فی الحقیقت بامحاورہ اور تحت اللفظ  
 تراجم کا حسین امتزاج ہے۔“ (طالب ہاشمی)

”میں نے بذاتِ خود امام اہل سنت مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے ترجمہ  
 قرآن کو انگریزی میں ڈھالتے ہوئے ضیاء القرآن کے ترجمہ کو بڑے غور سے  
 پڑھا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک ایسا ترجمہ ہے جو سلیس اور بامحاورہ ہونے  
 کے ساتھ ساتھ منشاۃ الہی اور عظمتِ رسالت کا آئینہ دار ہے۔“

(شاہ فرید الحق)

تفسیر ضیاء القرآن کے ترجمہ کے بارے میں مذکورہ آراء کو ملاحظہ فرمانے کے بعد اب

آئیے تفسیر کے بارے میں بھی کچھ باتیں کر لیں۔

”اردو زبان میں اس وقت قرآن کریم کی بہت سی تفسیریں لکھی جا چکی ہیں اور ان میں سے بعض تفسیریں علم و بصیرت کا کیش بہا سرمایہ ہیں۔ زیر نظر تفسیر اس عظیم علمی سرمایہ میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ اس کا مطالعہ نہ صرف قرآنی حقائق و معارف کے نئے نئے پہلوؤں سے آگاہ کرتا ہے بلکہ فاضل مفسر کی وقت نظر، خیر خواہی، امت اور سوزِ دروں کا ثبوت بھی وہاں کرتا ہے۔ قرآن کریم کی ایمان افروز تفسیر وہی لکھ سکتا ہے جس کا کتاب الہی پر ایمان و ایقان عشق کے درجہ تک پہنچا ہوا ہو۔“

تفسیر کا انداز بیان نہایت دلنشین اور اثر انگیز ہے اور اس کو پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ علم و حکمت کی ایک جوئے رواں ہے جو مسلسل بہہ رہی ہے اور ہر شخص اس سے بقدر ظرف استفادہ کر سکتا ہے :-

(غالب ہاشمی)

”ضیاء الامت حضرت علامہ پیر محمد کرم شاہ صاحب نے ضیاء القرآن تصنیف فرما کر نوجوان نس نسوں کا طلباء پر احسان عظیم فرمایا ہے۔ اس سے قبل ہمیں الفاظ قرآن کی لغوی اور صرفی و نحوی تحقیق کے لیے مفردات امام غیب القاموس، لسان العرب اور المحيط بیسی ضخیم کتب لغت کی درجہ گرانی زبان پڑنی تھی، لیکن مسنف ضیاء القرآن نے ان الفاظ کی تحقیق کر کے اور تفسیر کے ساتھ ان کی فہرست کا اضافہ کر کے ہم طلباء کے لیے آسانی فرمادی ہے۔ لفظی تحقیق کے علاوہ ترجمہ اور تفسیر پڑھنے کے بعد انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ تفسیر

عمل و عشق کا حسین امتزاج ہے۔ انہی خصوصیات سے متاثر ہو کر ہم نے  
ضیاء القرآن کو کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کی لائبریری کے لیے  
منظور کروالیا ہے اور جن طلباء نے بھی اس کا مطالعہ کیا ہے، وہ بے حد متاثر  
ہوئے ہیں۔“

محمد شریف سیالوی

”قرآن کریم ایک ایسی کتاب ہے جس میں ایک طرف تو خدا تعالیٰ کی  
وحدانیت کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت معلوم  
ہوتی ہے۔ دور حاضر کے بعض مفسرین نے عظمت رسالت کو ملحوظ نہیں رکھا  
لیکن تفسیر ضیاء القرآن کا یہ طرہ امتیاز ہے کہ اس میں جہاں دلائل توحید پر بڑی  
واضح بحثیں ملتی ہیں وہاں عظمت رسالت بھی اپنی رعنائی کے ساتھ موجود ہے۔  
درحقیقت یہ وہ تفسیر ہے جس سے صاحب قرآن کی عظمت واضح ہوتی ہے۔  
پیر صاحب قابل صد مبارکباد ہیں کہ انھوں نے صاحب قرآن کی شخصیت کو اجاگر  
کرنے کے لیے خود اپنی شخصیت کو اس میں گم کر دیا ہے۔“

شاہ فرید الحق

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ضیاء الامت نے اپنی قیمتی زندگی کا ایک طویل عرصہ  
قرآن کریم کی خدمت میں صرف کر کے امت مسلمہ کے لیے ایک بیش بہا خزانہ جمع کر دیا۔  
ہر قسم کے مسائل خواہ معاشرتی ہوں یا سیاسی، اقتصادی ہوں یا اخلاقی، ان پر سیر حاصل  
بحث کی ہے اور خصوصی طور پر وہ مسائل جو ملت اسلامیہ کے مختلف طبقات کے درمیان  
وجہ نزاع بنے ہوئے ہیں، ان کے بارے میں مختلف مقامات پر ایسے مثبت اور مدلل

مقالات سپرد قلم کئے ہیں کہ ظن و تشکیک کے غبار سے آلودہ اذہان ان کو پڑھنے کے بعد آسانی کے ساتھ اپنے فکر کی راہ متعین کر سکیں گے۔ حوالہ کے طور پر ملاحظہ کیجئے :

سورہ الاحقاف، آیت نمبر ۹، مسئلہ علم غیب

سورہ مریم، آیت نمبر ۱۱۰، مسئلہ نور

سورہ بنی اسرائیل، آیت نمبر ۱، واقعہ معراج

سورہ النحل، آیت نمبر ۱۵، وما اهل به لغير الله

سورہ الاحزاب، آیت نمبر ۲۵، مسئلہ حاضر و ناظر

سورہ الروم، آیت نمبر ۱، سماع موتی کی مدلل تحقیق

تفسیر ضیاء القرآن کی ایک اور خصوصیت جو میں نے ضیاء القرآن کا ایک ادنیٰ طالب علم ہونے

کی حیثیت سے محسوس کی ہے وہ یہ ہے :

بے شک سارا قرآن کریم نعتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن اکثر

مفسرین نے چند مخصوص آیات کے تحت ہی کمالاتِ نبوت کا تذکرہ کیا ہے، جب کہ تفسیر

ضیاء القرآن کا یہ طرہ امتیاز ہے کہ صاحب تفسیر نے متعدد ایسے مقامات پر نعتِ حبیبِ کبریا

صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلو نکالا ہے جہاں اکثر مفسرین اس طرف توجہ دیتے بغیر گزر

گئے ہیں۔

مثلاً سورہ الاخلاص میں تقریباً تمام مفسرین نے دلائلِ توحید کے انبار لگا دیئے ہیں

اور اس سلسلہ میں بڑی واضح اور مبسوط بحثیں رقم فرمائی ہیں۔ لیکن صاحب ضیاء القرآن نے

لفظ ”قل“ کی تشریح کرتے ہوئے ”عظمتِ رسالت“ کو توحید کی سب سے بڑی دلیل

کے طور پر پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

”بسا اوقات کمال بھی حجاب بن جایا کرتا ہے۔ کمالات بھی بے شمار  
 ہیں اور ان سے پیدا ہونے والے حجابات بھی انگنت ہیں، کہیں قوت،  
 کہیں علم، کہیں دولت، کہیں اقتدار و حکومت اور کہیں حسنگی فتوحات کے  
 نقاب حق کے روئے زیبا کو مستور کر دیتے ہیں۔ ان حجابات کو وہی اٹھا  
 سکتا ہے، ان نقابوں کو وہی الٹ سکتا ہے جو خود جملہ کمالات سے یوں  
 متصف ہو کہ اس کی نظیر پیش نہ کی جاسکے۔“

اے حبیب! ہم نے آپ کو تمام کمالات کا پیکر رعنا بنا کر بھیجا ہے  
 اٹھیے اور اپنی صدائے دلنواز سے سخت و پندار کے ان بتوں کو ریزہ ریزہ  
 کر دیجئے۔ فرعون نے ملک مصر کی حکمرانی سے اپنا دماغی توازن کھو دیا تھا۔  
 اور خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔ تجھے تو میں نے وہ سلطانی عطا فرمائی ہے کہ تیری  
 انگلی کے اشارے سے چاند و ٹٹڑے ہو جاتا ہے۔ اس بے مثال سلطانی  
 کے باوجود اگر تو یہ کہے کہ لا الہ الا اللہ، تو کسی حکمران کی یہ مجال نہیں ہوگی کہ  
 وہ اپنی خدائی کا اعلان کر سکے۔ ہم نے تجھے وہ شان رفیع عطا فرمائی ہے کہ سب  
 نبی، سب رسول اس کی جلالتِ شان کو دیکھ کر سزجیب ہیں۔ جب تو یہ کہے گا  
 لا الہ الا اللہ کہ میں بائیں ہمہ کمال خدا نہیں بلکہ بندہ ہوں تو کسی کو یہ حق نہ  
 پہنچے گا کہ وہ کسی نبی یا رسول کو خدا یقین کرے۔ تیرے علم کا بحر بے پیرا کنار  
 کان و ما یکون کو محیط ہے۔ تیری نگاہ رسا اسرار و معارف کی گہرائیوں  
 تک پہنچی ہوئی ہے۔ اس علم بے پایاں کے باوجود اگر تو یہ کہے گا کہ میں خدا  
 نہیں بلکہ اس کا بندہ ہوں، جب تیری زبان سے لا الہ الا اللہ

کا اعلان ہوگا تو کسی علامہ دہر اور فاضل اجل کو جرأت نہ ہوگی کہ اپنی خدائی کا دم بھر سکے۔

آپ کے جد امجد میرے خلیل نے لوہے کی گرز سے اپنی قوم کے صنم کدے میں سجے ہوئے بتوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اے فرزندِ خلیل! اٹھئے اور قل ہو اللہ احد کی کسار شکن ضرب سے افکار و نظریات کے بت کدوں کو پاش پاش کر دیجئے تاکہ اس کے بعد کوئی سلیم الفطرت انسان یہ کہنے کی جرأت نہ کر سکے کہ تیرے خدا کے بغیر بھی کوئی اور خدا ہے۔ تیرے رب کے بغیر بھی اس جہاں کا کوئی اور رب ہے۔ تیرے عزتوں والے، شانوں والے، قوتوں والے، حکمت والے، ہمہ بین اور ہمہ دان پروردگار کے سوا کوئی اور بھی خدا ہے۔ تیرے لبوں سے حق کی صدا نکلے گی، تو زمین کی وسعتیں، فضا کی پہنائیاں، آسمان کی رفعتیں، عرش کی بندیاں اس صدائے حق سے گونجنے لگیں گی :-

لطف کی بات یہ ہے کہ جب صاحب تفسیر نعت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بحث چلائے ہیں تو ایک وارفتگی کی کیفیت چھلکتی نظر آتی ہے۔ لیکن کوئی بڑے سے بڑا نقاد یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ یہ محض عقیدت اور مبالغہ ہے، بلکہ فاضل مصنف اس کی تائید میں لفظی تحقیق اور عقلی نقلی دلائل کا اتنا حسین گلدستہ پیش کرتے ہیں کہ قاری داد دینے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اس موضوع پر ایک طویل ترین کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ مقالہ کے اختصار کے پیش نظر یہاں میں صرف چند آیات کی طرف بطور استشہاد اشارہ کرنے پر اکتفا کروں گا۔



تفصیل کے لیے آپ ضیاء القرآن کی طرف رجوع فرما سکتے ہیں۔ وہ آیات مندرجہ ذیل ہیں:

انا فتحناك فتحاً مبيناً، ليغفر لك الله ما تقدم من ذنبك

وما تاخر

طه ما انزلنا عليك القرآن لتشقى

وما ارسلناك الا رحمة للعلمين

ووجدك ضالاً فهدى

انا اعطيتك الكوثر

والنجم اذا هوى

سبحان الذي اسرى بعبدہ.....

### حضرت ضیاء الامت، صاحب طرز ادیب

کوئی نظریہ حیات خواہ کتنا ہی دلکش اور بنی نوع انسان کے لیے کتنا ہی مفید کیوں نہ ہو، اس وقت تک لوگوں کے دلوں میں جگہ نہیں پاسکتا جب تک کہ اس کو دلاویز پیرا نہیں پیش نہ کیا جائے۔ اگر اس کا اظہار سطحی اور عامیانه انداز میں کیا جاتے، تو اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسا کہ خوبصورت شہزادے کو پوریا کا پھٹا پرانا لباس پہنا دیا گیا ہو۔

حضرت ضیاء الامت اس معاملے میں بھی خاصے حساس واقع ہوئے ہیں۔ آپ نے شب و روز کی محنت اور عرق ریزی سے دنیا سے ادب میں اتنا کمال پیدا کر لیا ہے کہ بلاشبہ انھیں صاحب طرز ادیبوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ اردو ادب میں بے شک ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان اور شورشس کشمیری کی خدمات کو فراموش نہیں کیا

جاسکتا، لیکن حضرت ضیا الامت کی تصانیف کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات بلا خوف  
 تردید کہی جاسکتی ہے کہ بامقصد اور جاندار تحریر میں آپ اردو ادب کے صفِ اول  
 کے ادیبوں سے بھی چند قدم آگے نکل گئے ہیں۔ آپ کا ہر ہر لفظ ایک واضح پیغام ہے،  
 ہر ہر فقرہ سینہ میں نہاں درد کا ترجمان ہے اور جب آپ شدتِ احساس سے مغلوب  
 ہو جاتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ قافلہ ملت کو جگانے کے لیے صدائے جرس  
 کو ہی کافی نہیں سمجھتے بلکہ اس کا دامن پکڑ کر اس کو جھنجھوڑتے نظر آتے ہیں "عصر حاضر  
 اور ہماری ذمہ داریاں" کے اندر لکھتے ہیں :

"میں یہ تصور کر کے لرز جاتا تھا۔ مجھے یہ احساس کچھ کرنے پر مجبور کرتا تھا۔

اگر میرا بس چلتا تو ایسا صور پھونکتا کہ سارے سونے والے سنی  
 جاگ اٹھتے۔ اور اگر کوئی سونا چاہتا تو اس کے لیے سونا ناممکن بنا دیتا، اگر میرے  
 مقدر میں ہوتا تو میں ایسی دل دوزخ مارا کہ تپڑوں میں شگاف ہو جاتے اور  
 احساس زیاں سے سب بے چین و بے قرار ہو جاتے، طوفان بن کر آتا،  
 اور فتنہ و فساد کے شعلوں کو بھسم کر کے رکھ دیتا۔ نسیم سحر بن کر چلتا، خوابیدہ  
 غنچوں کو جگاتا، دل گرفتہ عناد کو گدگداتا اور انہیں حیاتِ آفریں نعموں پر مجبور  
 کر دیتا۔

ضیائے حرم کے "فاروقِ اعظم نمبر" میں لکھتے ہیں :

"ہمارے نوجوان جس ڈگر پر چل رہے ہیں، کیا ہم انہیں چلنے دیں؟ اس

نوٹ سے کہ وہ رجم و براہِ فریفت نہ ہو جائیں، انہیں خودکشی کے رستے سے

نہ روکیں؟

نہیں، میرے دوستو! ہم ایسا نہیں کر سکتے۔

یہ بلوریں جامِ جس میں زہرِ قاتل گھول دیا گیا ہے اور جسے تم فرطِ شوق سے اپنے لبوں کے قریب لے جا رہے ہو، ہم دیکھیں اور مہربان رہیں؟

نہیں، میرے دوستو! ہم ایسا نہیں کر سکتے۔

ریشم کے رنگین تاگوں سے بنا ہوا یہ نظرِ فریبِ جاں جس کی طرف تم لپکتے جا رہے ہو، ہم جانیں بھی اور خاموش رہیں؟

نہیں، میرے دوستو! ہم ایسا نہیں کر سکتے، ضیائے حرمِ ایسا نہیں کر سکتا۔

گلفشانی تحریر کا معجزہ دیکھنا ہو تو ان سطور کو پڑھیے:

خیابانِ ہستی اجڑا پڑا تھا، خزاں کی چیر دستیوں سے گلوں کی نکہت

افشانیوں اور عنادل کی نغمہ ریزیوں کی یاد تک بھی گلہ تہ طاق نسیاں بن چکی

تھی، روشنیس ویراں تھیں اور آبِ جوتیں خشک، جہاں کبھی سبزۂ نو و میدہ

جنت نگاہ ہوا کرتا تھا وہاں خاک اڑ رہی تھی۔ یاس و قنوط کی ایک ہمہ گیر

کیفیت طاری تھی کہ فاران کی چوٹیوں سے ایک گھنگھور گھٹا اٹھی، جس کا ہر

قطرہ بہا آفریں اور جس کا ہر چھینٹا فردوسِ بداماں تھا، یہ گھٹا برسی اور خوب

دل کھول کر برسی، یہاں تک کہ گلزارِ عالم میں پھر آثارِ حیات نمودار ہونے لگے۔

انسانیت کے پڑمردہ چہرہ پر پھر شباب و قوت کی سرستیاں ظہور پذیر ہونے

لگیں۔ خود داری و عزتِ نفس، شجاعت و ایثار کے افسردہ درختوں کی عریاں

شاخوں کو از سر نو خلعتِ برگ و بار عطا ہوئی۔ قمریوں نے پھر عفتِ قلب و نظر

کا نغمہ چھیڑا۔ تو ہمت اور عقائدِ باطلہ کے قفس کی تسلیاں ایک ایک کر کے ٹوٹیں اور ہائے بشریت کو توحید کی مقدس و مطہر رفعتوں سے پھر دعوتِ پرواز آنے لگی۔ دنیا والوں نے اس شوخ و شنگ اور خیرات و برکات سے بھر پور گھٹا کو مُحَسَّنًا (بہت ہی تعریف کیا گیا) صلے اللہ علیہ وسلم کے دلنواز نام سے پکارا۔ اور عالمِ بالا کے مکینوں نے اسے احمد اپنے رب کا سب سے زیادہ ثنا خواں، کہا۔ لیکن حقیقت کی دلفریبیوں سے نقاب اس وقت اٹھا جب اس کے خالق و پروردگار نے اسے اپنی کائنات سے یوں روشناس کرایا:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ

(سنت خیر الانام ص ۲۴)

اور بے ساختگی تحریر کا یہ انداز کتنا دلکش ہے!

”نہ سعدی کی شوخی، نہ جامی کا سوز، نہ غزالی کا ذوق و وجدان، نہ شمس و کاورد عشق نہ رومی کی شرف نگاہی، نہ اقبال کی اولسے دلبرانہ اور انداز قلندرانہ یہ سہرا نقص اور مدحت سید الانبیاء علیہ الطیب التیجیۃ و الثناریں زبان کھولے تو کیسے؟“

وادمی امیں کا یہ نخل بند اور اس پر ہوش زبا تجلیات کا جھرمٹ یہ بحرِ کرم اور اس کی بے پناہ فیاضیاں، یہ مہر عالم افروز اور اس کی نور افشاں کرنیں، یہ مرقع حسن ازل اور اس کی عالمگیر دلربائیاں، فَاَطِرَ السَّمَوَاتِ وَ الْأَرْضِ کا یہ شابکار جمیل جو اپنی شان بندگی میں بے مثال اور اپنی شان محبوبی میں

بے نظیر جس نے زندگی کو رموزِ زندگی سے آگاہ کر دیا، جس نے انسان کو انسانیت کی خلعتِ زیبا سے نوازا، ایسے محبوبِ دلربا کی تعریف اور یہ دل باختہ قلم، اس جمالِ حقیقی کا بیاں اور یہ کج معج زباں، اس پیکرِ جود و سخا کی شہادت اور یہ شکستہ دل بڑا کٹھن مرحلہ ہے۔

لیکن اگر اس آئینہ حق نما کی توصیف نہ کریں تو کس کی کریں؟ اس سراپاِ زیبائی کا تذکارِ حسن نہ ہو تو کیا ہو؟ اللہ رب العزت کے محبوب بندے کے عشق میں گیت نہ گائیں تو کس کے گائیں؟ اس محسنِ کریم کی شناسی میں زباں زمر مہ سنج نہ ہو تو پھر اس کا مصرف کیا ہے؟ اگر قلم اس کی مدحت میں نغمہ سرا نہ ہو تو آخر وہ کیا کرے؟ عقل اگر اس کی عظمتوں کو خراجِ عقیدت پیش نہ کرے تو کس کی عقیدت کا دم بھرے؟ دل اگر اس کے عشق کا دیپ روشن نہ کرے اور اس کے درد اور سوزِ فراق میں نہ جلے تو اس کی ضرورت کیا ہے؟

(ضیائے حرم میلاد النبی نمبر)

میں نے ان مندرجہ بالا سطور میں اس ہمہ پہلو شخصیت کے نظریات اور افکار کی ایک ٹکلی سی جھلک پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میرا طائرِ تخیل اپنی تمام تر بلند پروازی کے باوجود بھی ان رفعتوں کی نشاندہی نہیں کر سکا، جہاں میرے ممدوح کا عقابِ ہمت پرکشا ہے۔ آپ کی سیرت، آپ کا کردار میرے حیطہ الفاظ سے وراد الوری ہے، لیکن

ایک نکتہ میرے پاس بے شمیر کی مانند

بزنہ و صیقل زدہ و روشن و براق

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے  
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں میں آفاق

(اقبال)

تمت بالخیبر

حافظ احمد بخش (ایم۔ اے)

ایم۔ او۔ ایل، (گولڈ میڈلسٹ)

استاذ معاشیات و سیاسیات،

دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بحیرہ شریف

جولائی ۱۹۸۰ء

بمقام ریسٹ ہاؤس سوڈھی جے والی

وادئی سون سکیسر

نوٹ: یہ مقالہ مندرجہ تاریخ کے مطابق اختتام پذیر ہوا ۱۹۸۲ء میں بوقت اشاعت چند ضروری

ترمیمات کی گئیں۔



اُسوۂ حسنہ



یہ مفت الہ شام ہمہ درد کے تحت بحضرت

ضیاء الامت

نے فلیٹرز ہوٹل لاہور میں پڑھا۔







اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے جن برگزیدہ بندوں کو شرف نبوت سے سرفراز فرماتا ہے، انہیں یہ مقدس اور اہم ذمہ داری سونپتا ہے کہ وہ انسانوں کی اصلاح کر کے انہیں اصلاح داریں کی سعادت سے بہرہ ور کریں۔

غور طلب امر یہ ہے کہ اصلاح سے کیا مراد ہے؟ ایک مفلوک الحال انسان کی خالی جھولی کو اگر آپ لعل و گہر سے بھر دیتے ہیں تو آپ نے اس کی مفلوک حالی کا توراہ کر دیا۔ لیکن یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ آپ نے اس کی اصلاح بھی کر دی ہو سکتا ہے وہ شخص جو غربت کی حالت میں بے سہارا، مرنجاں مرنج قسم کا تھا، اب وہ دولت کے نشتر سے محمور ہو کر فتنہ و فساد کی آگ بھڑکانے لگے۔ ایک شخص جس کے پاس سر چھپانے کے لیے چھوٹی پڑا تک نہیں، فٹ پاتھ پڑا موٹم کی پیرہ دستیوں کا ہدف بنا رہا ہو، اگر آپ اس کی باعزت رہائش کا انتہام فرما دیتے ہیں اور باد و باران کی بے رحمیوں سے اس کو نجات میں جاتی ہے، تو اس کا یہ معنی یہ گز نہیں کہ آپ نے اس کی اصلاح بھی کر دی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ وہاں بزمِ عیش و طرب آراستہ کرے اور فسق و فجور کے اندھیروں میں اپنے ساتھیوں سمیت غرق ہو جاتے۔

اصلاح کی ایک ہی صورت ہے کہ انسان کے پہلو میں دھڑکنے والا دل سنور جائے۔ جس شخص کا دل سنور جاتا ہے، غربت اور فاقہ کشی اس کے شرف انسانیت کو داغدار نہیں کر سکتی اور دولت کی فراوانی اسے مغرور و متکبر نہیں بنا سکتی۔ اگر وہ بوریائشیں درویش ہے تب بھی کوئی سلطان وقت اس کی عزت نفس کو خرید نہیں سکتا۔ اور اگر وہ سر پر آرائے سلطنت ہے تب بھی اس سے کوئی ایسی نازیبا حرکت سرزد نہیں ہو سکتی جس کے باعث جبین حیا پر شکن پڑے یا عدل و احسان کی نازک اقدار کو کوئی ٹھیس پہنچے۔ ایسے شخص کا علم جہالت کی تاریکیوں سے برسہا برس بچا رہتا ہے۔ اس کی دولت مایوسیوں اور محرومیوں کے گھپ اندھیروں میں خوشی و شادمانی کا چراغ روشن کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ اس کا جاہ و جلال ضعیفوں کی پناہ اور زیر دستوں کی دستگیری کرنا ہوا نظر آتا ہے۔ اصلاح یافتہ انسان کو آپ کسی قسم کے حالات سے دوچار کر دیں، اختیار و اقتدار کے اعلیٰ ترین منصب پر آپ اسے فائز کر دیں وہ سراپا خیر ہوگا۔ وہ پیکر نور ہوگا، اس کے ظل طہافت میں جو آئے گا، اسے سکون و قرار نصیب ہوگا وہ جدھر سے گزرے گا، فرحت و انبساط کے خزانے ٹٹاتا چلا جائے گا۔

اقلم علم و حکمت کے تاجدار، تفسیحات انسانی کے رازداں، سرور کون و مکاں صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں اسی حقیقت کو بیان فرمایا ہے :

ان فی الجسد لمضغۃ	ترجمہ بے شک جسم میں ایک پارہ
ان صلحت صلح	گوشت ہے اگر وہ درست ہو جائے
الجسد کله و ان	تو سارا جسم درست ہو جاتا ہے اور اگر
فسدت فسد الجسد	بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے کان

کُلُّهُ اِلَّا وَهِيَ الْقَلْبُ - کھول کر سن لو وہ پارہ گوشت دل ہے

لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اصلاحِ قلب کا عمل کیسے پایاں پذیر ہو۔ دل کے نگر میں اصلاح کا نور کیسے فروزاں ہو۔ دل کا قلعہ بڑا مستحکم ہے اس کی فصیل ٹہی مشبوط اور اونچی ہے کوئی منجھتی ابھی تک ایسی نہیں جو اپنی سنگباری سے اس کی دیواروں میں شکاف ڈال سکے۔ کوئی سکندر، کوئی سیرز، کوئی پنولین، کوئی ہٹلر اب تک ایسا پیدا نہیں ہوا جو دل کی دنیا میں اپنی فتح یابی کا ڈنکا بجا سکے۔

صرف باتیں خواہ وہ کتنی سچی ہوں، ان کی فصاحت و بلاغت کا معیار خواہ کتنا ہی بند ہو، باتیں کرنے والے کا لہجہ کتنا سلجھا ہوا ہو، یہ باتیں کانوں سے گرا کر واپس آجاتی ہیں۔ دل کے کان ایسی باتوں کو سننا اور قبول کرنا گوارا نہیں کرتے جب تک قابل کے قول کی تصدیق اس کا عمل نہ کرے، عمل میں جتنا حسن و جمال ہوگا جتنا سوز و گداز ہوگا، اور جتنی للہیت ہوگی کشور دل میں اس کی فتوحات کا دائرہ اسی قدر وسیع ہوگا۔

جب دنیائے انسانیت میں ہر سو گمراہی کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ظلمات بعضہا فوق بعض، کا دل خراش منظر قیامت ڈھار ہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے دریاے رحمت میں جوش آیا اور اس نے نوع انسانی کی ہدایت کے لیے قرآن حکیم جیسا صحیفہ رشد و ہدایت نازل فرمایا، لیکن یوں نہیں ہوا کہ جبریل اس کتاب میں کو بارگاہ ایزدی سے لے آیا ہو اور جبریل اپنی قبیس کی کسی چوٹی پر رکھ دیا ہو، تاکہ اہل مکہ اس کو پڑھ کر گمراہی کی دلدل سے باہر نکل آئیں اور شاہراہ ہدایت پر گامزن ہو جائیں، بلکہ اس دعوتِ حق کو لوگوں کے سامنے پیش کرنے سے پہلے اس دعوت کے داعی کا اہتمام فرمایا گیا۔ من کی دنیا میں حق

کا پرچم لہرانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب مکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے آنکوش لطف و کرم میں لے کر پروان چڑھایا، ان کی تادیب و تربیت کا اہتمام کیا۔ ارشاد ربانی ہے :

لَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَى - اے حبیب! تیرے رب نے تجھے یتیم پایا تو اس نے تجھے اپنے آنکوش کرم میں لے لیا۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا ہے : فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا، تو ہماری آنکھوں میں بتا ہے تو ہر وقت ہماری نگاہوں کے سامنے ہے، تیری جلو تیں اور خلوتیں، تیرے نالہ ہاتے شب کا گزار، تیری دعاؤں کا سوز، تیرے دل درد مند کی بے قراریاں، تیرے دن بھر کی مصروفیات سب ہی کا ہم مشاہدہ بھی کر رہے ہیں اور نگرانی بھی فرما رہے ہیں اور کبھی اسی حقیقت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا :

أَدَّبَنِي رَبِّي فَأَحْسَنَ  
تَأْدِيبِي

میرے پروردگار نے مجھے ادب سکھایا  
اور ادب سکھانے میں کمال کر دیا۔

اس خصوصی تعلیم و تربیت اور تزکیہ و تجلیہ کے بعد نبی ہاشم کے اس یتیم کو صاحب کتاب بنا کر سارے عالم کی رہنمائی کے لیے مبعوث فرمایا۔ ارشاد ربانی ہے :

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ، یعنی پیغام حق جاننا چاہو، تو قرآن کریم کا بغور مطالعہ کرو، اور ان تعلیمات کی دلربائیوں کو محسوس پیکر میں جلوہ فگن دیکھنے کے آرزو مند ہو تو میرے محبوب کی زندگی کے شب و روز میں مشاہدہ کرو جس سچائی کا بیان فرقان حمید کی آیات و کلمات کر رہے ہیں۔ تم اس کا زندہ نمونہ ذات پاک مصطفیٰ علیہ التحیۃ و التنازہ میں ملاحظہ کرو گے۔ کتاب میں جو کچھ پڑھو گے یہاں ہو ہو اس کو دیکھو لو گے۔ سر مو

بھی تفاوت نہیں پاؤ گے۔

فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَى  
مِنْ فُطُورٍ ثُمَّ ارْجِعِ  
الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ  
إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَ  
هُوَ حَسِيرٌ

غور سے دیکھو، کیا یہاں تمہیں کوئی شکاف  
نظر آ رہا ہے۔ ایک بار نہیں بار بار دیکھو  
تمہاری نگاہیں تکتے تکتے درماذہ ہو کر  
لوٹ جائیں گی، لیکن تمہیں وہاں کوئی  
نقص یا خامی دکھائی نہیں دے گی۔

اسی لیے جب ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کسی نے  
حضور کے خلق کے بارے میں استفسار کیا، تو حضرت صدیقہ نے فرمایا: كَانَ خُلُقُهُ  
الْقُرْآنَ، یعنی حضور کا خلق بعینہ قرآن تھا، اتنا جامع اور مختصر جو اب صدیق اکبر رضی  
کی لحدت جگر جنابہ صدیقہ ہی دے سکتی ہیں۔

گزشتہ آیات پر ایک مرتبہ پھر غور فرمائیے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: لَقَدْ  
كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ، اس کا لفظی ترجمہ ہے: بے شک  
تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کے رسول کی زندگی میں اسوۂ حسنہ ہے۔

اُسوۂ کا معنی ہے: نمونہ۔ یہاں صرف اُسوۂ نہیں فرمایا، بلکہ اس کو ایک  
صفت سے موصوف کیا۔ عربی لغت میں متعدد الفاظ ہیں جو اُسوہ کی صفت بن سکتے ہیں  
مثلاً، اُسوۂ كَامِلَةٌ، اُسوۂ سَاهِيَةٌ، بھی کہا جاسکتا تھا، لیکن علیہ وعلیہم السلام نے  
اپنے رسول کے اُسوۂ کی توصیف کے لیے جو وصف منتخب فرمایا، وہ حَسَنَةٌ ہے  
اور حَسَنَةٌ کا معنی ہے، ذَاتُ حُسْنٍ یعنی حسن و جمال والا۔ اس طرح اس حقیقت کو  
واضح کیا کہ میرے حبیب کا عمل نام نوعیت کا نمونہ نہیں، بلکہ ایسا نمونہ ہے جس میں حُسْنِ

جس میں جمال ہے جس کی رعنائیوں اور زیبائیوں کے سامنے دلوں کے قفل ٹوٹ کر  
 گرتے چلے جاتے ہیں، جس کی اداؤں کے تاؤ سے مخالفت کی پٹانیں گھیل جاتی ہیں۔  
 اس تعبیر میں حکمت یہ ہے کہ دل صرف سلطان حسن کا حلقہ بگوش اور ہما جگزار ہوتا ہے  
 اس کا سر پندار فقط محبوب کی دلفریب اداؤں کے سامنے جھکنا جانتا ہے اور سیرت  
 مصطفویٰ میں حسن اپنی تمام جلوہ سامانیوں، اپنی ساری زیبائیوں اور رعنائیوں کے  
 ساتھ سمٹ کر آ گیا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ حسن کے ان گنت روپ ہیں۔  
 رُخِ رِیَا، قَامِتِ بَالَا، چِثْمِ غَزَالِیْنِ کے علاوہ راست بازی، ثابت قدمی، شجاعت،  
 سخاوت یہ سب حسن کے جلوے ہیں، جو یہاں اپنے پورے شباب پر دکھائی دیتے  
 ہیں۔ حسن کی کسی ادا کا کوئی دلدادہ ہو اور اس کے کسی روپ کا کوئی قدر دان ہو، جب  
 بارگاہِ جمالِ مصطفویٰ میں باریاب ہوتا ہے تو از خود رفتہ ہو کر یہ نعرہ بلند کرتا ہے

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر

ہوش و نردشکار کر قلب و نظر شکار کر

اسی کو پہ میں آ کر دل کی دنیا بدل جاتی ہے، خوب و زشت کا معیار بدل جاتا ہے  
 سود و زیاں کا تصور بدل جاتا ہے پھر دعوتِ حق نہاں خانہ دل میں جاگزیں ہو جاتی ہے  
 اور انسان بڑے ذوق و شوق سے یوں گنگناتے لگتا ہے مے

أَتَانِي هَوَاهَا قَبْلَ أَنْ أَعْرِفَ الْهَوَى

فَصَادَفَ قَلْبًا خَالِيًا قَدَّمَكْنَا

ترجمہ: اس کی محبت آئی اور اس وقت آئی جب مجھے محبت کا مفہوم ہی معلوم نہ تھا

اس نے میرے دل کو خالی پایا اور اس پر اپنا تسلط جما لیا۔

یہی وجہ ہے کہ بارگاہِ مصطفیٰ سے فیض یاب ہونے والوں میں ہمیں عربی بھی ملتے ہیں اور عجمی بھی، کریم اور شجاع بھی ہیں ملتے ہیں اور ضعیف و ناتواں بھی، دولت مند بھی ملتے ہیں اور فقیر و نادار بھی۔ جس کسی میں حسن کے کسی پہلو کے لیے کشش ہوتی ہے وہ یہاں آکر تسلیم خم کر دیتا ہے۔ نگاہِ حقیقت شناس، حضور کے صحابہ کرام کی سیرت کے آئینوں میں جمالِ یار کا عکس جمیل عیاں دکھتی ہے، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیڑھے فیض سے سیراب ہونے والوں میں نبوت کا رنگ جھلکتا ہوا صاف نظر آتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ نمونہ جتنا خوب صورت اور دلکش ہے اسی قدر وسیع اور کشادہ بھی ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے لیے اس میں پروگرام نہ ہو۔ انسانیت کا کوئی رنگ ایسا نہیں جس کے لیے اس میں تریاق نہ ہو۔ نہ درتہ ظلمتوں کو کافور کرنا اس کا خاصہ ہے۔ اس کی برکت سے آلائشیں دور ہوتی ہیں، روح کو پاکیزگی اور دل کو طہارت نصیب ہوتی ہے۔ سیرت و کردار میں وہ استواری اور ثبات نمایاں ہوتا ہے، جسے پھر کوئی زلزلہ اپنی جگہ سے جنبش نہیں دے سکتا۔ عبادات، معاملات، تہذیب و تمدن، معاشیات و معاشرت الغرض کوئی میدان ہو، اسوۂ حسنہ کا ابر رحمت ان پر سایہ فگن ہوتا ہے۔ اور اپنی رم جہم سے موت کی نیند سوئی ہوئی صلاحیتوں کو بیدار کرتا ہے۔ ان کی نشوونما کرتا ہے اور زندگی کے دامن کو سوز و نشاط سے لبریز کر دیتا ہے۔

میرے لیے یہ تو ممکن نہیں کہ اس مختصر صحبت میں میں حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے تمام پہلوؤں کا اختصار کے ساتھ ہی تذکرہ کر سکوں۔ البتہ اس گلشنِ حکمت کے ایک دو گلہائے رنگین پیش خدمت کرنے کی سعادت ضرور حاصل کروں گا۔ یہ واقعات ہیں تو بالکل سادہ، لیکن ان کی تاثیر سے عرب کے گنوارِ صحرائیںوں کے



دل کی دنیا میں ایک تلاطم برپا ہو گیا۔ اور ان میں ایک عظیم انقلاب رونما ہوا۔  
 نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ سفر سے واپس تشریف لارہے تھے۔  
 راستہ میں پڑا ہوا مختلف حضرات کو مختلف ذمہ داریاں سونپ دی گئیں۔ کوئی نیمے نصب  
 کر رہا ہے کوئی سواری کے جانوروں کے چارہ کا انتظام کر رہا ہے۔ کوئی پانی بھر کر لا  
 رہا ہے۔ کوئی اٹا گوندھ رہا ہے۔ سب اپنے اپنے کام میں لگے ہوتے ہیں حضور چپکے  
 سے وہاں سے اٹھ کر کہیں چلے جاتے ہیں۔ صحابہ کرام کچھ دیر بعد حضور کو اپنے درمیان  
 نہ پا کر بے چین ہو جاتے ہیں۔ متجسس نگاہیں چار سو تلاش حبیب میں سرگرداں ہیں،  
 جیسے جیسے تاخیر ہوتی جاتی ہے، بے چینی اور اضطراب بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک  
 کہ صحابہ کرام کو دور سے ایک نورانی پسیر نظر آتا ہے اور جب قریب ہوتے ہیں تو یہ  
 دیکھ کر حیران و ششدر رہ جاتے ہیں کہ ان کا آقا و مرشد جنگل سے لکڑیاں چن کر ان  
 کا گٹھ بنا کر اپنے سر پر اٹھائے ہوئے لا رہا ہے۔ صحابہ کرام عرض کرتے ہیں: یا  
 رَسُولَ اللَّهِ! (صلی اللہ علیہ وسلم) حضور نے یہ زحمت کیوں گوارا کی؟ ہم غلام اس  
 خدمت کے لیے کیا کافی نہ تھے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بڑی سادگی سے فرماتے ہیں۔  
 ”تم سب کام کر رہے تھے، میں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ خود معتبر بن کر

بیٹھا رہوں۔“

صحابہ کرام جو اس نورانی منظر کو دیکھ کر پہلے ہی مسحور ہو چکے تھے۔ یہ بے تکلفانہ جواب  
 سن کر ان کے ایمان و یقین کو نئے بال و پر نصیب ہو گئے۔

میدان خندق کا یہ واقعہ کسے معلوم نہیں کہ اگر صحابہ کرام خندق کھودنے میں  
 مصروف ہیں، تو ان کا نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہاتھ میں کدال لیے کبھی پھیرلی

زمین کو کھود رہا ہے اور کبھی مٹی سے بھری ہوئی ٹوکری اپنے سر پامین و سعادت سر پر اٹھائے باہر پھینک رہا ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عملی زندگی کی یہی دل فریبیاں تھیں جنہوں نے عرب کے بدوؤں کو اسلام کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ آج بھی اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ اسلام کی دعوت کو پذیرائی نصیب ہو اور یہ پیغام حق دلوں کی دنیا میں ہل چل پیدا کر دے تو اس کی صرف یہی صورت ہے کہ قرآن کی تعلیمات کے حسین خدو خال کو سیرت مصطفویٰ کے شفاف آئینہ میں لوگوں کو دکھایا جائے تاکہ جمالِ حق کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور اس کی فطرت کے آگے سر تسلیم خم کر دیں۔ جب تک ہم حضور کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کو لوگوں کے سامنے اجاگر نہیں کریں گے۔ ہم نہ اپنے فریضہ تبلیغ سے عمدہ برا ہو سکتے ہیں اور نہ اپنی بات کو لوگوں سے منوا سکتے ہیں، نوعِ انسانی کو دینِ اسلام کی جس قدر آج ضرورت ہے اتنی شاید پہلے کبھی نہ تھی۔ ترقی یافتہ قومیں اپنے تمدن اور ثقافت سے مایوس ہو چکی ہیں۔ انھیں ضرورت ہے کہ وہ اسلام کے چشمہ شریں سے اپنی بیاس بچھائیں، اس لیے ہر وہ شخص جس کے دل میں انسانیت کے لیے درد ہے، جو اپنے بھائیوں کی ضلالت و گمراہی پر ہیچ و تاب کھاتا رہتا ہے جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور دعوت کے کامل و مکمل ہونے کا یقین محکم ہے، اس کا یہ خوشگوار فریضہ ہے کہ ان اندھیروں میں بھٹکنے والی مخلوق کی راہنمائی کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو بڑے مدلل اور دلکش انداز میں پیش کرے۔



حضور نبی کریم ﷺ

بحیثیت

معلم اخلاق



۱۱ فروری ۱۹۶۹ء کو نیو کیمپس (پنجاب یونیورسٹی لاہور) میں منعقد ہونے والی عظیم الشان "بین الاقوامی سیرت کانفرنس" میں پڑھا جانے والا ایک اہم مقالہ





الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على حبيبه محمد  
خاتم الانبياء والمرسلين الذي ارسل الى كافة الناس  
بشيرا ونذيرا وعلى اله واصحابه ومن تبعه الى يوم  
الدين. اما بعد! فقال الله تعالى يا ايها النبي انا ارسلتك  
شاهدا ومبشرا ونذيرا وداعيا الى الله باذنه وسراجا  
منيرا

صدر محترم اور معزز خواتین و حضرات!

جس شب برصغیر کے طول و عرض میں بسنے والے فرزند ان اسلام کو بارگاہ رب  
ذوالجلال سے پاک تان کا انعام مرحمت ہوا تھا، وہ رمضان المبارک کی ستائیسویں رات  
تھی یعنی نزول قرآن کی سعادتوں اور برکتوں سے معمور رات جسے لیلۃ القدر کے نام سے  
یا دیکھا جاتا ہے اور جس صبح کو تخلیق پاک تان کے مقصد حلیل کی تکمیل ہو رہی ہے، وہ  
۱۲ ربیع الاول کی صبح سعید ہے، یعنی صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے

میلادِ پاک کی صبحِ ارجمند۔

یہ محض اتفاق نہیں بلکہ تقدیروں کے خالق اور شئونِ کائنات کے رب کا فیصلہ ہے کہ دو گراں قدر انعام ان مبارک ساعتوں میں بخشے جائیں۔ اس فیصلہ میں بڑی حکمتیں ہیں جو اہل دل کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں اور یہ بھی علیم و حکیم خدا کی تقسیم ہے کہ تخلیقِ پاکستان کا اعزاز قائدِ اعظم کو بخشا اور مقاصدِ پاکستان کی تکمیل یعنی نظامِ مصطفیٰ علیہ السلام والنجیۃ والشارع کے نفاذ کے اعلان کی سعادت جناب جنرل محمد ضیا الحق کو نصیب ہوئی۔

ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝

مجھے فرمایا گیا کہ میں ”نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام بحیثیت معلم اخلاق“ کے عنوان پر بارگاہِ حسن و جمال اور عظمت و کمال میں اپنے دل نیاز مند کی طرف سے عقیدت و محبت کے چند پھول پیش کروں۔ میرے لیے یہ بہت بڑا شرف ہے جنہوں نے مجھے یہ موقع بخشا ہے، میں ان کے لیے سراپا نیاس ہوں۔

خواتین و حضرات! یہ جہان رنگ و بوجہ گاہِ حیات ہے۔ زندگی کی بوتلوں رنگینیوں کے باعث یہ جہاں آباد ہے۔ گونباتاتی اور حیوانی زندگی میں بھی رنگینیوں کے بڑے دکش اور دلربا مینا بازار سجے ہوئے ہیں، لیکن انسانی زندگی میں جو رعنائیاں اور ندرت آفرینیاں ہیں۔ یہاں تخلیقی قوتوں کے جو سمندر موجزن ہیں۔ وہ کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتے۔ یہ انسان ہی ہے جس کو خلعت و جوہر بخشنے کے بعد اس کے خالق نے فرمایا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝

اس قدرت و طاقت والے نے عرش و فرش، کائنات کی لامتناہی وسعتوں کو

لفظ کُن سے پیدا کیا، لیکن آدمِ خاکی کی آفرینش کا ذکر کیا تو فرمایا :

خَلَقْتُهُ بِيدَيَّ

میں نے اسے اپنی قدرت کے دونوں

ہاتھوں سے پیدا کیا۔

علم اور عمل، فکر اور تخلیق، تدبیر اور تعمیر کی جو بے پناہ صلاحیتیں اس پیکرِ خاکی میں ودیعت فرمائیں، ان کا تذکرہ نَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي کے معنی خیر الفاظ سے کیا۔ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حکمت، علم اور قدرت کا یہ شاہکار سب سے الگ تھلک انفرادی زندگی بسر کرے، خلاق عالم کو یہ گوارا نہ ہوا۔ اگر وہ عزتِ اختیار کرنا تو وہ بے پایاں صلاحیتیں بے مصرف ہو جاتیں۔ اس چشمہٴ حیاں سے کوئی تشنہ لب اگر سیراب نہ ہوتا تو اس کے حیاتِ بخش اثرات کا کسے علم ہوتا۔ ان صفات کے ودیعت فرمانے والے کے حضور فرطِ عقیدت سے جبینِ نیاز کون جھکاتا۔ حکمتِ الہی کا تقاضا تھا کہ انسان اجتماعی اور معاشرتی زندگی بسر کرے اور اپنے فکر و نظر کے چراغ روشن کر کے شبستانِ وجود کو منور بھی کرے، وہ ماں باپ کا بیٹا بھی ہو اور اپنے بیٹے بیٹیوں کا باپ بھی۔ اس کے خاندان کے افراد اس کے لیے تقویت کا باعث ہوں، ضرورت کے وقت وہ ان کا سہارا بنے، حتیٰ کہ اس کے تعلقات کا حلقہ سارے ملک اور ساری قوم کو اپنے احاطہ میں لے لے۔ ان معاشرتی تعلقات کے باعث حقوق و فرائض کا معرض وجود میں آنا ناگزیر ہے۔ معاشرہ کا ہر فرد جب تک اپنے فرائض پوری ذمہ داری سے ادا نہیں کرے گا، نیز جب تک اسے اپنے حقوق کی بازیابی کا یقین نہ ہوگا، اس وقت تک صحت مند معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا۔ اس لیے حقوق و فرائض میں اعتدال اور توازن برقرار رکھنا اہم اور بنیادی ضرورت ہے۔ اس کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو قانون کی



طاقت سے اس توازن کو برقرار رکھا جائے، اور جو شخص بھی اس توازن کو بگاڑنے کا مرتکب ہو اس کی سرکوبی کر دی جائے۔ اور یا اس کی اخلاقی قوتوں کو بیدار کیا جائے۔ اور ایسے خطوط پر ان کی نشوونما کر دی جائے کہ پھر ہر قسم کے حالات میں وہ راہِ اعتدال پر ثابت قدمی سے چلتا رہے۔ قانون کی عملداری انسانی زندگی کے سرف چند گوشوں پر ہے، انسانی زندگی کے بہت سے ایسے گوشے ہیں، جہاں قانون کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ نیز ہر کام اگر قانون کے زور سے کرایا جائے تو خلوص و ایثار اور محبت و پیار کے غنچے کھل کر پھول نہیں بن سکیں گے۔ اسلام نے حقوق و فرائض میں توازن پیدا کرنے اور پھر اسے برقرار رکھنے کے لیے اور معاشرہ کو ہر قسم کی بے راہروی سے بچانے کے لیے اخلاقی تربیت پر اسی لیے بہت زیادہ توجہ دی ہے۔

اس سے قبل کہ میں ”حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام بحیثیت معلم اخلاق“ کے عنوان پر اظہار خیال کروں، مناسب سمجھتا ہوں کہ لفظ خلق کی تشریح کر دوں تاکہ کسی قسم کا ابہام نہ رہے۔ علامہ ابن منظور، لغت کی مشہور کتاب ”لسان العرب“ میں لکھتے ہیں:

الْخُلُقُ وَالْخُلُقُ، السَّجِيَّةُ	ترجمہ: یعنی خلق اور خلق کا معنی فطرت
وَهُوَ الدَّيْنُ وَالطَّبْعُ وَ	اور طبیعت ہے۔ انسان کی باطنی
السَّجِيَّةُ وَحَقِيقَتُهُ أَنَّهُ	صورت کو بعد اس کے اوصاف اور
لِصُورَةِ الْإِنْسَانِ الْبَاطِنَةِ وَ	مخصوص معانی کو خلق کہتے ہیں جس
هِيَ نَفْسُهُ وَأَوْصَافُهَا وَمَعَانِيهَا	طرح اس کی ظاہری شکل و صورت کو
الْمَخْتَصَّةُ بِمَنْزِلَةِ الْخُلُقِ	خلق کہا جاتا ہے۔ (لسان العرب)

لِصُورَةِ الظَّاهِرَةِ وَ أَوْصَافِهَا (لسان العرب)  
وَمَعَانِيهَا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ جو دانش ایمانی اور دانش برہانی دونوں سے مالا مال ہیں، جو حکمت و فلسفہ کے علاوہ نفسیاتِ انسانی کے بھی ماہر ہیں، خلق کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فَالْخُلُقُ عِبَارَةٌ عَنْ هَيْئَةٍ	ترجمہ: یعنی خلق نفس کی اس راسخ کیفیت
فِي النَّفْسِ رَاسِخَةٌ، عَنْهَا	کا نام ہے جس کے باعث اعمال
تَصْدُرُ الْأَفْعَالُ بِسَهْوَةٍ	بڑی سہولت اور آسانی سے صادر
وَيُسْرٍ مِنْ غَيْرِ حَاجَةٍ إِلَى	ہوتے ہیں۔ ان کے ظاہر کرنے کے لیے
فِكْرٍ وَ دُرُوبَةٍ۔	سوچ و بچار کے تکلف کی ضرورت محسوس
(احیاء العلوم)	نہیں ہوتی۔

اس تشریح سے معلوم ہوا کہ وہ اعمال جو کسی سے اتفاقاً صادر ہوتے ہیں یا کسی وقتی جذبہ اور عارضی جوش سے ان کا ظہور ہوتا ہے وہ خواہ کتنے ہی اعلیٰ اور عمدہ ہوں انھیں خلق نہیں کہا جائے گا۔

خلق کا اطلاق انھیں خصال و عادات پر ہوگا جو پختہ ہوں، جن کی بڑی قلب و روح میں بہت گہری ہوں، انھیں غیر متزلزل اور پختہ صفات پر کامیاب زندگی کا محل تعمیر کیا سکتا ہے۔ انہی پر اعتماد کرتے ہوئے قومی ترقی اور اصلاح کے منصوبے بنائے جاتے ہیں اور ان پر عمل کیا جاسکتا ہے کسی تنگ میں آکر اگر کوئی شخص غریبوں اور محتاجوں کی امداد کے لیے اپنے خزانوں کے منہ کھول دے، تو ہم اسے سخی نہیں کہیں گے

جو شخص کسی وقتی بوش کے تحت اپنے دشمن پر حملہ کر کے اسے مار گرائے، اسے ہم شجاع نہیں کہیں گے، اس سے یہ توقع عبث ہے کہ جب بھی اسے میدانِ جہاد میں سرکف آنے کی دعوت دی جائے گی تو وہ اسے قبول کر لے گا۔

اس لیے نیک اور عمدہ افعال کو پیدا کرنا پھر ان کو اس طرح بچتہ اور استوار کرنا کہ ان سے مطلوبہ اعمال کا ظہور اس طرح بے تکلفی سے ہو، جس طرح چیتھ سے پانی ابلتا ہے یا آنکھ اپنے گرد و پیش کو دیکھتی ہے یا کان آواز سنتے ہیں۔ یہ کیفیت افراد و اقوام کی صحت مند ترقی کے لیے جس قدر اہم اور ضروری ہے، اسی قدر مشکل اور کٹھن بھی ہے۔ اس کٹھن اور خطرناک مہم کو سر کرنے کے لیے حکماء اور فلاسفہ نے بڑی کوششیں کیں، لیکن ان کے باہمی اختلافات اور ان کی نظریاتی کش مکش نے ان کی محنت کو بے ثمر کر دیا ہے۔ وہ یہ طے نہ کر سکے کہ خیر و شر کا معیار کیا ہے؟ ایسی نور اور اس کے ساتھی لذت و الم کو خیر و شر کا معیار ثابت کرنے میں اپنی ذہنی قابلیتیں کھپاتے رہے، ان کے معتقدات کے معبد میں مدتوں، لذت کے صنم کی پرستش بڑی دھوم دھام سے ہوتی رہی۔ زینو، جو ایک مستقل مکتبہ فکر (مدرسہ رواقیہ) کا مؤسس تھا۔ اس نے اس کے برعکس نفس کشی، اور لذت سے کلی اجتناب کو خیر کا سرچشمہ قرار دیا۔ افلاطون استاد ہے، اور ارسطو شاگرد۔ اقلیم دانش و حکمت کے دونوں تاجور ہیں۔ دونوں کی عبقریت شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ دونوں کا زمانہ بھی ایک ہے، لیکن یہ دونوں بھی متفقہ طور پر فیصلہ نہ کر سکے کہ خیر و شر کا معیار کیا ہے؟ استاد مثل علیا اور غیر محسوس جہاں کے طوائف میں سرگرداں ہے اور اس کا شاگرد ارسطو عالم محسوسات سے باہر قدم رکھنا پسند نہیں کرتا۔ یہ ذہنی خلقشار صرف اس زمانہ کی خصوصیت نہیں، جب کہ حکمت و فلسفہ اپنے

ابتدائی مراحل میں تھے، بلکہ آج بھی جب کہ فکر انسانی کی پتھار سے خلا میں کہرام برپا ہے، بے یقینی کی وہی کیفیت ہے۔ ہر برٹ سپنسر، جان لوک اور ہیگل وغیرہ جن فلسفیوں نے علم اخلاق کے موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان کی گنجشک تحریریں پڑھ کر آپ کا سر چکرانے لگے گا۔ انھوں نے روحوں کو اضطراب، دلوں کو بے چینی اور عقلوں کو بے یقینی کے سوا کچھ نہیں دیا۔ انھوں نے کسی ایسی راہ کی نشاندہی نہیں کی جو مسافر کو منزل تک پہنچا دے۔ البتہ انھوں نے آبلہ پاراہروں کے راستہ میں تشکیک کے کانٹے بڑی کثرت سے بکھیرے ہیں یقین کی ٹٹھاتی ہوئی شمع جس کی مدھم لو میں اُفتاں و خیزاں وہ سوئے منزل رواں تھے، وہ بھی بجھ گئی۔ ترجمان حقیقت حضرت اقبال نے کیا خوب فرمایا ہے۔

ہیگل کا صدف گہر سے خالی  
 ہے اس کا طلسم سب خیالی  
 انجام خورد ہے بے حضور  
 ہے فلسفہ زندگی سے دور  
 افکار کے نغمہ ہائے بے صورت  
 ہیں ذوق عمل کے واسطے موت

ان کو اپنا راہبر بنانے والوں پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ جب پردہ اٹھتا ہے، اور وہ اپنے ممدوح کو اس کے صحیح روپ میں دیکھتے ہیں، وہ فضائل، وہ خصائل حمیدہ وہ اخلاق عالیہ جن کی تعریف میں اس نے سدھا ورق سیاہ کئے تھے، اس کی عملی زندگی میں توازن کا نام و نشان تک نہیں، بلکہ وہ تو زائل کی دلدل میں کمر تک

دھنا ہوا ہے۔

ان کے علاوہ دوسرا گروہ جس نے اپنی قوم کے اخلاق کو درست کرنے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں، وہ انبیاء کرام کا گروہ تھا۔ ان کی باتیں سادہ اور واضح تھیں۔ ان کی تعلیمات میں الجھاؤ اور التباس نہیں تھا۔ ان کے ہاں سچیدہ علمی اصطلاحات کی بھرمار نہیں تھی، بلکہ ان کے ارشادات عام فہم اور دلوں میں گھر کر جانے والے تھے۔ انھوں نے خیر و شر کا معیار لذت و الہم، نفس پرستی یا نفس کشی کو قرار نہیں دیا، انھوں نے اخلاقِ حسنہ کی غرض و غایت بیان کرنے کے لیے سعادت، مسرت، قوت، غلبہ کے مبہم الفاظ استعمال نہیں کیے، تاکہ ان کا شارح حسبِ منشا ان کو معانی کا لباس پہنا سکتا ہے، بلکہ اس کدو کاوش اور جدوجہد کی غرض و غایت رضائے الہی کو قرار دے کر ان تمام فکری الجھنوں کو ختم کر دیا۔

اس سے بھی زیادہ جس پیر نے گروہ انبیاء کی تعلیمات کو قبول عام بخشا اور ان کے لیے دلوں کے دریچے کھول دیئے۔ وہ ان نفوسِ قدسیہ کے قول و عمل کی ہم آہنگی اور یکسانیت تھی۔ وہ دوسروں کو جس کام کے کرنے کا حکم دیتے تھے، پہلے خود اس پر کاربند ہوتے۔ مزید یہ کہ ان کے یہ اعمال کسی ذاتی غرض اور منفعت سے وابستہ نہ تھے ان کے اقوال کی دل نشینی، ان کے اعمال کا بانگین اور ان کے خلوص کی مہاک نے ان لوگوں کی کایا پلٹ دی، جن کو ان کی صحبت کا فیضان نصیب ہوا۔

لیکن انبیاء سابقین کا دائرہ کار محدود تھا۔ ان کی بعثت کا مقصد کسی ایک قوم کی یا کسی ایک ملک کے باشندوں کی اصلاح تھا اور وہ بھی محدود وقت تک کے لیے۔ بارگاہِ الہی سے یہ شرف اور یہ اعزاز فقط عبد مکرم، رسول معظم

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو از رانی ہوا کہ آپ کی رسالت ہر اسود و احمر عربی و عجمی  
شرقی و غربی کے لیے تھی۔ ارشاد الہی ہے :

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً  
لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا

اے حبیب مکرم! ہم نے آپ کو تمام  
اولاد آدم کی طرف بشیر و نذیر بنا کر مبعوث

فرمایا ہے۔

آپ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں۔ آپ کا آفتاب نبوت تا قیامت نور افشانی کے لیے  
طلوع ہوا ہے۔

اصلاح اخلاق کا فریضہ جو ہر نبی نے اپنے مقام اور حیثیت کے مطابق انجام دیا۔  
اس مقصد کی تکمیل کے لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے آپ کو وقف فرما دیا ہے۔  
ارشاد ہے :

بُعِثْتُ لِرَافِعَتِكُمْ مَكَارِمَ  
الْأَخْلَاقِ -

مجھے اس لیے مبعوث کیا گیا ہے کہ میں  
مکارم اخلاق کو پانچ تکمیل تک پہنچا

دوں۔

تکمیل اخلاق کا یہ فریضہ حضور سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جس حُسن و خوبی سے  
انجام دیا۔ اس کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل امور پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

① اخلاقی تعلیم کی جامعیت

② انداز تعلیم

③ معلم کی شخصیت

سابقہ انبیاء کرام کی تعلیمات جو ہم تک پہنچی ہیں۔ ان سے صرف زندگی کے چند

گوشتوں میں رہنمائی ملتی ہے۔ حضرت ایوب علیہ السلام ہمیں مصائب و امراض میں صبر و استقامت کی ایک چٹان نظر آتے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹے کے فراق میں آنسوؤں کی لڑیاں پروئے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں شدت اور سختی کا عنصر غالب ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوہِ زیتون پر کھڑے اپنے سامعین کو عفو و درگزر اور رحمت و شفقت کی تلقین کرتے سناٹی دیتے ہیں۔ زندگی کے ایسے گوشے بھی ہیں، جہاں ان نفوسِ قدسہ نے بھی قدم نہیں رکھا اور ایسے نفوش بھی نہیں چھوڑے جن سے آنے والی نسلیں اپنی منزل کا سراغ لگا سکیں! اللہ تعالیٰ نے زندگی کے تمام مجبور و متروک گوشوں کو نورِ ہدایت سے منور کرنے کے لیے اپنے حبیبِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمت للعالمین کی خلعتِ زیبا عطا فرما کر اپنی مخلوق کی چارہ گری کے لیے مبعوث فرمایا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ پر اگر سرسری نظر ڈالی جائے تو ہمیں جہاں زندگی کی بوقلمونیوں کا ایک حسین و جمیل مرقع نظر آتا ہے۔ وہاں جنگ کی شعلہ سامانیاں بھی ہیں اور صلح کی رافت و رحمت بھی۔ دشمن نفرت کے انگارے بھی برساتے ہیں اور عقیدت مند اپنی محبت و مودت کے رنگین پھول بھی بچھا کر رہے ہوتے ہیں۔ ہم نے محبوبِ خدا کو حلقہ یاراں میں دیکھا ہے اور حملہ آوروں کے نزعہ میں بھی ہم نے ان کی کاروباری مصروفیتوں کا بھی مطالعہ کیا ہے اور غارِ حرا کی خلوتوں میں ان کے سو روگداز کا جائزہ بھی لیا ہے، ہم نے انھیں وطن سے بظاہر انہٹائی بے بسی اور بے کسی میں ہجرت کرتے بھی دیکھا ہے اور پھر چند سال بعد اسی شہر میں فاتحانہ انداز میں داخل ہونے کا منظر بھی ملاحظہ کیا ہے اپنے اہل و عیال کے ساتھ ان کا برتاؤ کا ریکارڈ بھی ہمارے سامنے ہے اور اپنے

جان نثار اور وفا شعار ساتھیوں سے حسن سلوک کی تفصیلات بھی ہمارے پیش نظر ہیں الغرض زندگی کے وسیع و عریض میدان کا کوئی کونا ایسا نہیں جہاں حبیب کبریا نے اپنے اسوہ حسنہ کے حسین و جمیل نقوش نہ چھوڑے ہوں۔ یہ جامعیت، یہ ہمہ گیری اسوہ محمدی کے بغیر کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والا ہر آدمی اس آبِ زلال سے اپنی پیاس بجھا سکتا ہے۔ اس دارالشفاء میں انسانیت کے ظاہری و باطنی، سیاسی و معاشی و سماجی اور اخلاقی ہر قسم کے ناقابل علاج لوگوں کے لیے اکسیر موجود ہے۔ خاتم الانبیاء کو بارگاہِ الہی سے جو کتابِ منیر مرحمت ہوئی، اس کے مندرجہ ذیل مقامات کا ہی اگر آپ مطالعہ کریں تو آپ کو حضورؐ کا لایا ہوا نظامِ اخلاق اپنی تمام تر رعنائیوں اور زیبائیوں کے ساتھ جلوہ فگن ملے گا۔ سورہ بقرہ کی آیات ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸ سورہ المؤمنوں کی ابتدائی آیات سورہ الفرقان کی آیات ۶۳ تا ۷۴۔

### انذارِ تعلیم

مذکورہ بالا آیات میں اخلاقِ حسنہ کی اہمیت اور افادیت کو جس انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ اس سے کوئی سلیم الطبع متاثر نہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حضورؐ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات جن میں اخلاقِ حسنہ کو اپنانے کی تلقین کی گئی ہے۔ وہ بھی بڑے دلنشین اور روح پرور ہیں۔ چند نمونے ملاحظہ فرمائیے:

رَوِّكَ اَنَّمَاتِ عَلَيْهِ التَّحِيَّاتِ وَالتَّبْلِيغَاتِ نَمَاةٍ مِّنْ اَكْثَرِ بِرِّدَعَا مَا نَكَا كَرْتِي ۚ

اللّٰهُمَّ اِهْدِنِي لِاَحْسَنِ

اَلْاَخْلَاقِ لَا يَهْدِي

اے اللہ! بہترین اخلاق کی طرف تو

میری راہنمائی فرما۔ تیرے سوا بہترین



وَ حَسْبُهَا إِلَّا أَنْتَ وَ  
 اخلاق کی طرف کوئی راہنمائی نہیں کر سکتا  
 اَصْرَفَ عَنِّي سَيِّئَاتِهَا  
 اور بُرے اخلاق کو مجھ سے دور کر دے  
 لَا يَصْرِفُ عَنِّي سَيِّئَاتِهَا  
 کیونکہ تو ہی بُرے اخلاق کو مجھ سے  
 إِلَّا أَنْتَ (مسلم شریف) دور کر سکتا ہے۔

یہ اس پاک ہستی کی دعا ہے جس کے اخلاقِ حسنہ کی گواہی عالم الغیب و الشہادۃ نے  
 یوں دی ہے: وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ ط یہ اس بیکرِ خصائل حمیدہ کی دعا ہے  
 جس کا دامن ہر قسم کی نازیبا حرکات کے داغ سے پاک ہے۔ ایسی ہستی جب عجز و نیاز  
 سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ التجا کرتی ہوگی تو خود سوچئے، صحابہ کرام کے دلوں پر اخلاقِ  
 حسنہ کی اہمیت کے نقوش کس طرح ثبت ہوں گے۔

اہل ایمان کے نزدیک ایمان سے بڑھ کر کوئی قیمتی دولت نہیں بھنور صلے اللہ  
 علیہ وسلم نے اپنے ماتنے والوں کو جب ارشاد فرمایا ہوگا تو اخلاقِ کریمہ کی اہمیت ان  
 کی نگاہوں میں بڑھ گئی ہوگی۔ ارشادِ نبوی ہے:

أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ  
 جس شخص کا خلق بہترین ہوگا۔ تمام  
 إِيْمَانًا أَحْسَنَهُمْ  
 مومنوں سے اس کا ایمان اعلیٰ اور اکمل  
 خُلُقًا۔ ہوگا۔

ہر نیک دل انسان عبادتِ الہی میں لذت و سرور محسوس کرتا ہے اور اس کا  
 حی چاہتا ہے کہ یادِ الہی کی شمع فروزاں رہے اور وہ بصد جان اس پر قربان ہوتا رہے،  
 ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص کثرتِ عبادت پر ناز کرنے لگے اور اخلاقِ حسنہ کی اہمیت  
 اس کی نگاہوں میں کم ہو جائے۔ اس انتشار سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ کے  
 محبوب نے تنبیہ فرمادی:

انسان اپنے اخلاق کے باعث اس  
درجہ پر فائز ہو جاتا ہے جو رات بھر  
ذکر الہی میں کھڑے رہنے والے اور  
عمر بھر روزہ رکھنے والے کو نصیب ہوتا ہے  
إِنَّ الرَّجُلَ لَيَسُدُّ رِزْقَهُ  
بِحُسْنِ عُلُقِهِ دَرَجَةً قَائِمِ  
اللَّيْلِ وَصَائِمِ النَّهَارِ -  
(ابوداؤد)

کون بندہ ہے جس کے دل میں اپنے پروردگار کی رضا اور محبت کی تمنا چٹکیاں

نہ لے رہی ہو۔ اس کا طریقہ بتا دیا:

اللہ تعالیٰ کے بندوں میں اس کے  
نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہوتا  
ہے جس کے اخلاق پسندیدہ ہیں۔  
أَحَبُّ عِبَادِ اللَّهِ إِلَيَّ  
اللَّهُ أَحْسَنُهُمْ أَخْلَاقًا  
(طبرانی)

اسی طرح ہر بندہ مومن کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے ہادی و مرشد صلی اللہ  
علیہ وسلم کی اس پر نگاہ لطف و کرم ہو اور قیامت کے روز اسے اپنے آقا کے قرب  
میں جگہ ملے، چنانچہ اپنے مشافقانِ جمال کو یہ فرما کر بشارت دی۔

تم میں سے مجھے سب سے زیادہ پیارا  
اور آخرت میں سب سے زیادہ میرے  
قریب وہ شخص ہوگا جو خوش خلق ہے  
اور تم میں سے سب سے زیادہ پسندیدہ  
اور بروز قیامت مجھ سے دور وہ  
شخص ہوگا جو بد خلق ہے۔  
إِنَّ أَحَبَّكُمْ إِلَيَّ وَأَقْرَبَكُمْ  
مِنِّي فِي الْآخِرَةِ مُجَالِسِ  
مَحَابَّتِكُمْ أَخْلَاقًا وَإِنَّ أَيْعَضَكُمْ  
إِلَيَّ وَأَبْعَدَكُمْ مِنِّي  
مَسَاوِيكُمْ أَخْلَاقًا -

بے شمار ارشادات نبوت میں سے یہ چند اقوال پیش خدمت کیے ہیں اخلاق حسنہ

کو اپنانے کی تڑپ پیدا کرنے کے لیے اس سے زیادہ مؤثر اور دلنشین اسلوب کوئی کہاں سے لائے گا۔

## جن چیزوں کو اخلاقِ حسنہ کہا گیا ہے وہ کیا ہیں؟

انسانی معاشرہ کافر و ہوتے ہوئے معاشرہ کے دوسرے افراد کے بوجھتوق اس پر واجب ہیں، ان کو خُسن و خوبی سے انجام دینا ہی حسنِ خلق کہلاتا ہے، ماں باپ، بیوی بچے، پڑوسی، یتیم، بیوہ، سائل، بیمار، مسافر، مجاہد سب کے ساتھ مروت و احسان کرنے کی تاکید ارشاداتِ نبوت میں موجود ہے۔ یہ تعلیم اتنی جامع اور ہمگیر ہے کہ انسان تو انسان، حیوانات و نباتات بھی اس میں داخل ہیں۔ شیردار جانوروں کو تلف کرنے، پھلدار درختوں کو کاٹنے، لہلہاتے ہوئے کھیتوں کو ویران کرنے، بستے ہوئے گھرانوں کو اجاڑنے، ان سب چیزوں سے منع کر دیا گیا ہے۔ اسلوبِ مخاطب اتنا شیریں ہے کہ اس کی مٹھاس اور لذت سب روح کی گہرائیوں میں سرایت کر جاتی ہے۔ بخاری شریف میں ایک فاحشہ عورت کا تذکرہ ہے جس کے عمر بھر کے گناہوں کو اللہ تعالیٰ نے اس لیے معاف فرما دیا کہ اس نے پیاس سے تڑپتے ہوئے ایک کتے کو پانی پلا دیا تھا۔ بیوہ عورتوں، مسکین لوگوں کی خدمت کو جہاد فی سبیل اللہ کا درجہ دیا گیا ہے۔ بخاری شریف میں ہے:

السَّاعِي عَلَى الرَّمْلَةِ وَ  
 الْمَسْكِينِ كَالْمَجَاهِدِ فِي  
 سَبِيلِ اللَّهِ وَكَالذَّمِي  
 بیوہ اور غریبوں کے لیے دوڑ و صوب  
 کرنے والا خدا کی راہ میں جہاد کرنے  
 والے کی طرح ہے اور اس عابد کی

يَصُومُ النَّهَارَ وَ يَقُومُ  
مانند ہے، جو دن بھر روزہ رکھتا ہے  
اللَّيْلِ۔ اور رات بھر نماز پڑھتا ہے۔

یتیم کی حفاظت اور کفالت کے شوق کو یوں مہمیز لگائی ہے :  
أَنَا وَكَافِلُ الْيَتِيمِ  
کہ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا  
فِي الْجَنَّةِ هَكَذَا۔ جنت میں یوں ساتھ ہوں گے جس طرح  
ہاتھ کی یہ دو انگلیاں۔

بے شک معلم اخلاق کی تعلیمات ہمہ گیر اور عالمگیر ہیں اور اس کا اسلوب بیباں بھی  
دلنشیں اور لذیذ ہے۔ لیکن معلم کریم کی شخصیت جو دلربائیاں اور رعنائیاں ہیں۔ وہ  
قلب و نظر کو مسحور کر رہی ہیں۔ اس کی ایک جھلک دیکھ کر دل دیوانہ اور روح سرشار  
ہو جاتی ہے۔ ان کی ذات والاصفات میں جو بانگین اور نکھار ہے۔ اس نے ان کی  
دعوت کو چارچاند لگا دیئے ہیں۔ کوئی بات نہیں فرمائی جس پر خود عمل کر کے نہ دکھایا  
ہو۔ لوگوں کو سچ بولنے اور امانت میں دیانت کو ملحوظ رکھنے کی تاکید کی تو درخواست  
گفتاری اور امانت داری کا وہ بلند معیار پیش کیا کہ خون کے پیاسے بھی صادق اور  
امین کہنے پر مجبور ہو گئے۔ لوگوں کو وعدہ پورا کرنے کی تلقین کی، تو خود اس پر یوں کاربند  
ہوتے کہ دشمن بھی عیش عیش کراٹھے۔ آپ کو معلوم ہے، جب قیصر روم نے ابوسفیان  
کو اپنے دربار میں طلب کیا تا کہ حضور کے اخلاق و کردار کے بارے میں دریافت کرے  
ابوسفیان اس وقت اسلام اور رسول اسلام کا بدترین دشمن تھا، لیکن اس کو بھی مجبوراً  
یہ کہنا پڑا کہ آپ کے اخلاق بڑے بلند ہیں۔ وہ قول کے پکے اور بات کے سچے ہیں۔  
عرب کے بد و اور اجڈ لوگ حضور کے اخلاق کریمانہ کو دیکھ کر حضور کے

گردیدہ ہو گئے تھے مسجد نبویؐ کی تعمیر کا وقت آتا ہے صحابہ کرامؓ اس کی بنیادیں کھڑے ہیں پتھر اور گارا اٹھا اٹھا کر لارہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا حبیب بھی ان کے ساتھ کام میں برابر کا شریک ہے۔ غزوہ احزاب کے موقع پر حبیب عرب کے سارے مشرک قبائل نے مدینہ طیبہ پر دھاوا بول دیا۔ اسلام کے اس مرکز کے دفاع کے لیے خندق کھودنے کا منصوبہ طے ہوا۔ صحابہ کرامؓ کی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ میں کدال لیے خود بھی خندق کھودنے میں مصروف ہیں گیسوتے عنبریں پر مٹی گر رہی ہے روئے زیبا پر گرد پڑ رہی ہے۔ اس روح پرور منظر کو دیکھ کر مجاہدین اسلام پر کیف و مستی کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور وہ بے خودی کے عالم میں یہ شعر پڑھتے ہیں۔

نَحْنُ الَّذِينَ بَايَعُوا مُحَمَّدًا

عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيَْنَا أَبَدًا

ترجمہ: ہم وہ جاں فروش ہیں جنہوں نے محمد مصطفیٰ کے دست مبارک پر تادم واپس جہاد کرنے کی بیعت کی ہے۔

سرورِ عالم ہاری برحق ان کے جوش ایمانی کو دیکھ کر جواباً فرماتے ہیں:

اللَّهُمَّ لَا عَيْشَ إِلَّا عَيْشُ الْآخِرَةِ

فَاغْفِرِ الْأَنْصَارَ وَالْمُهَاجِرَةَ

ترجمہ: اے اللہ! زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے۔ الہی! میرے انصار اور مہاجرین کو بخش دے۔

شکرِ اسلام میدانِ بدر کی طرف کوچ کر رہا ہے۔ تین تین سپاہیوں کے لیے

ایک سواری کا انتظام ہو سکا ہے۔ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی سواری

میں سیدنا علی اور مرشد بن ابی مرشد کو شریک کر لیا ہے۔ مدینہ طیبہ سے جب قدسیوں کا  
 لشکر نکلتا ہے تو حضور اونٹنی پر سوار ہیں۔ مقررہ مسافت طے کرنے کے بعد حضور اتر  
 جاتے ہیں اور اپنے ساتھیوں کو حکم دیتے ہیں کہ ان میں سے ایک سوار ہو جائے۔ وہ  
 عرض کرتے ہیں کہ ان کی باری بھی حضور ہی سوار رہیں۔ اس سے انھیں روحانی مسرت  
 ہوگی۔ حضور جانتے ہیں کہ یہ پیش کش صدقِ دل سے کی جا رہی ہے، لیکن حضور کو  
 اچھی طرح علم ہے کہ حضور کا مقام اقدارِ عالیہ کے معلم اور استاد کا ہے۔ حضور ان کی  
 مخلصانہ پیش کش کو قبول نہیں فرماتے بلکہ انھیں یوں جواب دیتے ہیں :

مَا أَنْتُمْ بِأَهْوَىٰ مِنِّي

کہ تم مجھ سے زیادہ طاقت ور ہو اور

وَلَا أَنَا غَنِيٌّ عَنْكُمْ

نہ یہ بات ہے کہ تمہیں مجھ سے زیادہ جزو

مِنَ الْأَجْرِ۔

ثواب کی ضرورت ہے۔

چرخِ پیر نے بھی یہ منظر کا ہے کو دیکھا ہوگا کہ لشکر کا سپہ سالار، امت کا سردار اور  
 مجاہدین کا محبوب قائد، ناقہ کی نکیل پاتھ میں لیے پیدل چل رہا ہے اور ایک سپاہی  
 اونٹنی پر سوار ہے۔ یہی وہ اُسوہ حسنہ ہے جس نے عرب حبشی وحشی درندہ صفت اور  
 درشت قوم کو کاروانِ انسانیت کا امام بنا دیا۔ اس معلمِ اخلاق کی تربیت سے کروہ قوم  
 تیار ہوئی جس کے بارے میں خالقِ دو جہاں نے فرمایا : كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ  
 أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔

آج بھی اگر اس دلفریب، رُوح پرور اور جاں نواز اُسوہ حسنہ کو ہم سچے دل سے  
 اپنائیں۔ تو ہم اپنی تقدیر کو بدل سکتے ہیں۔ آج یہ مبارک دن جب کہ نظامِ مصطفیٰ کے  
 نفاذ کی طرف ایک مثبت اور عملی قدم اٹھانے کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ کاش! ہم

اپنے کردار کو خلق محمدی کے سانچے میں ڈھال لیں۔ صرف اس طرح ہم نظام مصطفیٰ کی عظمت کو، قانونِ اسلام کی برکتوں کو دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں اور مادیت گزیدہ انسانیت کو وہ تریاق پیش کر سکتے ہیں، جس کی اسے اشد ضرورت ہے اور جس کے عجم امین ہیں۔

واخر دعوانا ان الحمد لله  
 رب العالمین والصلوة والسلام  
 علی رحمة للعالمین والعاقبة  
 للمتقین

صلى الله عليه وسلم  
سُرورِ کائنات

کا  
نظامِ اخلاق



ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ ایچ اے (الازہر)  
نے ۴ مارچ ۱۹۸۰ء کو ہٹل انٹر کانتی نینٹل روپینڈی میں شام ہمد  
کی ایک تقریب میں یہ مقالہ پڑھا۔ اس تقریب میں ملک  
کے نامور اہل قلم، دانشور اور قانون دان  
حضرات موجود تھے۔







کائنات کی وسعتیں بکیراں ہیں۔ سائنس دانوں کی دور رس نگاہوں نے بے شمار  
تتے نظام ہائے شمسی کا سراغ لگا لیا ہے۔ یہ وسعتیں اور ان میں تنوع اپنے خواص اثرات  
رنگ و بو اور کیف و کم کے اعتبار سے ہوش ربا ہیں۔ کہیں نژاد کی بلندیاں ہیں، کہیں نژدی  
کی پستیاں، کہیں عرش کی عظمتیں ہیں اور کہیں فرش کی خاکساریاں، کہیں نور کی جلوہ مانییاں  
ہیں اور کہیں خاک کی تیرگیاں۔ زندگی کے ان گنت جلوے ہیں۔ ہر جلوہ نظر افروز بھی ہے اور  
دلربا بھی۔ لیکن آدم خاکی کی نشان زالی ہے۔ یہ خالق کائنات کے کمال تخلیق کا شاہکار ہے  
یہ اس عالم میں اس کا خلیفہ ہے۔ اس کے ظاہری اور باطنی حسن و جمال اور فضل و کمال  
کی پردہ کشائی ان کلمات سے کی گئی ہے :

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝ اس میں نہ سادہ جہتوں

اور نہ حقہ قوتوں کے گنہائے گراں مایہ کو یہ فرما کر آشکار کیا گیا ہے :

الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ ۝ اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے

اسے انسان بنا، تجھے پیدا کیا، پھر تجھے درست کیا، پھر ذہنی اور جسمانی استعدادوں سے

تجھے سنوارا۔

انسان دیکھنے میں تو مختصر ہے۔ ہاتھی کی طرح گرانڈیل بھی نہیں، شیر کی طرح طاقتور بھی نہیں، ہرن کی طرح تیز رفتار بھی نہیں، لیکن ہر چیز اس سے ہر اسال ہے پہاڑوں کی چوٹیاں اس کے قدم عزم کے سامنے سرنگوں ہیں۔ صحراؤں کی پہنائیاں اس کے حکم سے سکر جاتی ہیں۔ اس کے اشارے سے سمندروں کے سینے شوق ہیں۔ کرہ ہوا میں ابھرنے والی البیلی لہریں اس کے فرامین کو زمین کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک پہنچانے میں مصروف ہیں۔

اس کے خالق نے اس کی تخلیق کا ذکر بھی بالکل ترلے انداز میں کیا ہے: ارض و سما مہر و ماہ، جن و ملک، شجر و حجر کی تخلیق کے بارے میں فرمایا: **إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ**۔ لیکن حضرت انسان کی آفرینش کا ذکر کیا تو فرمایا: **لَمَّا خَلَقْتُ بَدَائِي**۔ میں نے اسے اپنی قدرت کے دو ہاتھوں سے پیدا کیا۔ بلاشبہ اس کی پیدائش کو یہ خصوصی امتیاز حاصل ہے۔ اس کے راہوار عزم و حوصلہ کی جولانیوں کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔ یہ خام صلاحیتیں، عروس گیتی کی زلفیں سنوارنے کے کام بھی آسکتی ہیں اور اس کی قبائے شرف و کرامت کو تار تار بھی کر سکتی ہیں۔ یہ نسیم بہار بن کر خیر و خوبی کے سخیوں کو بھول بھی بنا سکتی ہیں، یہ بادِ صحر بن کر نیکی اور صلاح کے روشن چراغوں کو گل بھی کر سکتی ہیں، جب تک ان کی صحیح نشوونما نہیں ہوگی، ان کو صحیح خطوط پر چلانے کا اہتمام نہیں کیا جائے گا، تو احسن تقویم کی بلندیوں پر دکنے والا یہ مہ پارہ، اسفل السافلین کی پستیوں میں ہمیشہ کے لیے ڈوب جائے گا۔ اس کی بے پناہ صلاحیتوں کا رخ حق اور خیر کی طرف موڑ دینا، اس کے دل میں برائی سے نفرت اور نیکی سے محبت پیدا کر دینا بڑا

نازک مرحلہ ہے اور نہایت مشکل کام ہے، اس کی مشکل کو آسان کرنے کے لیے اسی خطرناک موڑ سے کاروانِ انسانیت کو سلامت گزارنے کے لیے اللہ تعالیٰ انبیاء کرام کو مبعوث کرتا رہا۔ اسی مقصدِ جلیل کی تکمیل کے لیے سید الانبیاء والمرسلین کی تشریف آوری ہوئی۔

میں اس بحث میں آپ کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا کہ دانش برہانی نے شبستانِ وجود کی ظلمتوں کو مٹانے کے لیے چو چراغ روشن کئے، انھوں نے جادہٴ زیست کے مسافروں کے لیے آسانیاں پیدا کیں، یا ان کی ذہنی پریشانیوں میں اضافہ کیا۔ مجھے تو اس صحبت میں دانائے سبل، صادی برحق، مرشدِ قلب و نظر سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی ان کامیاب کوششوں کا ذکر کرنا ہے، جن کے باعث گلشنِ حکمت و دانش میں بہار آئی، جن کی برکت سے انسان کا خفتہٴ بخت بیدار ہوا۔ جن کی مسیحائی نے عمل و خلق کو نئے عنوان عطا کئے جن کی تربیت سے فیروں کو قناعت و استغناء اور امیروں کو ذوقِ جود و عطا ملا۔ درویشوں کو خودداری اور شاہوں کو تواضع و انکساری نصیب ہوئی، جس نے علم کے رخ سے شک و اظہار کی گرد کو صاف کیا۔ اسے نورِ یقین سے نکھارا اور عمل صالح سے ہمکنار کر دیا۔ جن کے قدم ناز کی ٹھوک سے خود غرضی، نفس پرستی، قومی عصبیت اور وطن پرستی کے سارے بت جن کے سامنے صدیوں سے انسان سجدہ ریز چلا آ رہا تھا، پاش پاش ہو گئے۔

نظامِ اخلاق کے بے شمار پہلو ہیں۔ سب کو یہاں بیان کرنا ممکن نہیں ہیں آج کی اس مغل میں صرف اس کے تین پہلوؤں کا بالاختصار ذکر کروں گا۔

① جس انسان کی تربیت کے لیے نظام اخلاق وضع کیا گیا ہے، اس کی فطرت کے بارے میں محسن انسانیت کی کیا رائے ہے؟

② نظام اخلاق کا مقصد اعلیٰ کیا ہے؟

③ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو نظام اخلاق پیش کیا، اخلاق کے

دوسرے نظاموں کے مقابلہ میں اس کی امتیازی شان کیا ہے؟

عیسائیت جس کے ماننے والوں کی تعداد ایک ارب سے بھی زیادہ ہے، اس کا انسانی فطرت کے بارے میں یہ عقیدہ ہے کہ انسان کا جو بچہ پیدا ہوتا ہے وہ پیدائشی گنہگار ہوتا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق آدم وحوٰا نے جو گناہ کیا تھا اس کے داغ سے ہر انسان کی پیشانی داغدار ہے، وہ اپنی پشت پرنا کردہ گناہوں کا یہ بوجھ اٹھاتے ہوئے اس عالم رنگ و بو میں قدم رکھتا ہے۔ جب تک یسوع مسیح کے نام پر اسے پتھر نہ دیا جائے اس وقت تک وہ اس گناہ سے بری الذمہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ انھیں اس مسئلہ میں اس قدر غلو ہے کہ وہ معصوم بچہ جو عیسائی مال باپ کے گھر پیدا ہوتا ہے وہ بھی پیدائشی گنہگار ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک اگر وہ پتھر لینے سے پہلے مر جائے تو وہ بھی آسمانی بادشاہی کی حدود میں داخل نہیں ہو سکتا بلکہ دوزخ میں پھینک دیا جاتا ہے۔ عیسائیت کے علاوہ جو مذاہب تناسخ اور آواگون کے قائل ہیں وہ بھی انسان کو اپنی سابقہ زندگی کے اعمال کا صید زبوں خیال کرتے ہیں۔ یعنی جو انسان آج پیدا ہو رہا ہے، اس کی سعادت و شقاوت کا فیصلہ پہلے ہو چکا ہے، اس کے عمل اور سعی کو اپنی قسمت کے سنوارنے میں کوئی دخل نہیں۔

ان معتقدات کی رو سے انسان کی بے بسی اور آشفۃ نجاتی کا آپ باسانی اندازہ

لگا سکتے ہیں کہ جب کوئی انسان اپنی اس خستہ حالی پر آگاہ ہوتا ہوگا تو بے ساختہ چیخ اٹھتا ہوگا۔

يَا لَيْتَنِي كُنْتُ  
شَرَابًا  
اے کاش! میں انسان نہ ہوتا، مٹی کا  
تودہ ہوتا۔

لیکن رحمت عالمیاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم جو کتاب مقدس لے کر آئے، اس نے انسان کو مقہور و مجبور اور ناکردہ گناہوں کے طوق و سلاسل میں اسیر نہیں بتایا بلکہ مختلف عنوانوں سے اس کی فطرت کی پاکی اور اس کی جبلت کی جلالتِ شان کا ذکر فرمایا ہے، عقیدہ توحید کو اس کی فطرت کی آواز اور تقاضا قرار دیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ  
حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي  
فَطَّرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا  
تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ -  
ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَ  
لَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ  
پس آپ کر لیں اپنا رخ دین اسلام کی  
طرف پوری کیوٹی سے مضبوطی سے پکڑ  
لیں، اللہ تعالیٰ کے دین کو جس کے مطابق  
اس نے لوگوں کو پیدا فرمایا کوئی رد و بدل  
نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں یہی  
سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں  
جانتے۔ (روم آیت ۳۰)

قرآن کریم میں مذکور ہے کہ روزِ اول اللہ تعالیٰ نے ارواحِ انسانی سے پوچھا:  
أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ (کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں) سب نے بیک زبان جواب دیا:  
قَالُوا بَلَىٰ (بے شک تو ہمارا پروردگار ہے) یوں اس غلط فہمی کی بیخ کنی کر دی کہ انسان  
فطرۃً ناپاک اور گمراہ ہے۔

قرآن کریم نے انسان کی عظمت اور اس کی فطرت کی ارجحندی کو ایک نئے عنوان سے بھی آشکارا کیا ہے، بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے نہاں خانہ دل میں ایک ایسی قوت رکھ دی ہے، جو اسے نیکی پر ابھارتی ہے اور برائی سے روکتی ہے۔ اگر یہ نہیں رکھتا تو وہ قوت سراپا احتجاج بن کر سینہ تان کر اس کی راہ میں کھڑی ہو جاتی ہے۔ وہ اسے روند کر ہی گناہ کی وادی کی طرف پیش قدمی کر سکتا ہے۔ اس قوت میں جب تک سکت باقی رہتی ہے وہ اس کا دامن پکڑے رہتی ہے۔ اس قوت کو قرآن کریم نے نفس لوامر سے تعبیر کیا ہے اور اس کی عظمت کی قسم کھاتی ہے۔ وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللّٰوَاْمَةِ۔

سرور عالم مرشد قلب و نظر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو بڑے پیارے انداز سے بیان فرمایا ہے۔ حضرت و البصہ بن معبد رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں، بارگاہ نبوت میں نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کرنے کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔ صحابہ کرام کا بے پناہ ہجوم ہے۔ وہ ذوق و شوق میں اس ہجوم کو پھرتے ہوئے حضور کے قریب پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لوگوں نے انھیں بارہا روکا ہے لیکن وہ نہیں رکتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے شوق فراوان کو دیکھا تو فرمایا: و البصہ! قریب آجاؤ۔ جب وہ نزدیک جا کر بیٹھ گئے تو حضور نے ارشاد فرمایا: اے و البصہ! میں بتاؤں کہ تم کیوں آئے ہو یا تم خود بتا دو گے۔ انھوں نے عرض کی: حضور ہی ارشاد فرمائیں۔ فرمایا: و البصہ! تم مجھ سے نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کرنے کے لیے آئے ہو۔ حضرت و البصہ نے عرض کی: یہ ہے یا رسول اللہ!۔ و البصہ کہتے ہیں کہ حضور نے اپنی تین انگلیاں اکٹھی کر کے میرے سینے میں چوکیں اور فرمایا:

یا وَاِبْصَنَةُ اسْتَفْتِ نَفْسَكَ  
 الْبِرُّ مَا اَظْمَنَ اِلَيْهِ  
 الْقَلْبُ وَاَطْمَأْنَنْتُ  
 اِلَيْهِ النَّفْسُ وَاِلَاثْمُ  
 مَا حَالَكَ فِي الْقَلْبِ وَا  
 تَرَدَّدَ فِي الصَّدْرِ وَا  
 اَفْتَاكَ النَّاسُ -

اے والبصر! اپنے دل سے پوچھا کر  
 اور اپنے نفس سے فتویٰ لیا کر۔ نیکی وہ  
 ہے جس سے دل اور نفس میں اطمینان  
 پیدا ہو اور گناہ وہ ہے جو ترسے دل  
 میں کھٹکے اور نفس کو تردد میں ڈال دے  
 اگرچہ لوگ تجھے اس کے جواز کا بھی  
 فتویٰ دیں۔

(مسند امام احمد جلد ۲ صفحہ ۲۲۸ مطبوعہ مصر)

حضور کا ایک اور ارشاد گرامی بھی اس سلسلہ میں بڑا بصیرت افروز ہے فرمایا:

اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا اَخْطَا  
 خَطِيئَةً نَّكَتَتْ فِي  
 قَلْبِهِ نَكْتَةً سَوْدَاءَ  
 وَاِذَا نَزَعَ وَاَسْتَغْفَرَ  
 وَاَتَابَ ، صَقُلَ قَلْبُهُ وَا  
 وَاِنْ عَادَ زَيْدًا فِيهَا حَتَّى  
 يَعْلُوَ قَلْبُهُ -

بندہ جب گناہ کرتا ہے تو اس کے  
 دل پر ایک سیاہ نقطہ آگ جاتا ہے۔  
 اگر اس نے پھر اپنے آپ کو اس گناہ  
 سے علیحدہ کر لیا اور خدا سے مغفرت مانگی  
 اور توبہ کی تو اس کا دل صاف ہو جاتا  
 ہے اور اگر اس نے پھر وہی گناہ کیا  
 تو وہ سیاہ داغ بڑھنے لگتا ہے ،

یہاں تک کہ پورے دل پر چھا جاتا ہے

ان ارشادات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اسلام کے نزدیک انسان فطرۃً  
 بدکار اور نامہنجا نہیں، بلکہ وہ صاف دل، پاک نفس پیدا ہوتا ہے۔ اس کے اپنے



بڑے اعمال ہی اس کے آئینہ دل کو مگر کر دیتے ہیں اور نیکی کی قوتوں کا گلا گھونٹ کر انھیں خاموش کر دیتے ہیں۔ انسان جو فطرۃً نیک ہے، جس میں ایسی قوت پنہان ہے جو برائی کے خلاف سینہ تان کر کھڑا ہونے کی ہمت رکھتی ہے۔ ایسے انسان کیلئے جو نظام اخلاق ہوگا وہ کتنا بلند ہوگا۔ اور انسان کو پیدا کنشی گنہگار سمجھنے والوں کے ضابطہ اخلاق سے کس قدر مختلف ہوگا۔

### نظام اخلاق کا مقصد اعلیٰ

ہر فعل کسی مقصد کے حصول کے لیے کیا جاتا ہے۔ ہر قدم کسی منزل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اٹھایا جاتا ہے۔ اس لیے نظام اخلاق پر کاربند ہونے کا ضرور کوئی مقصد ہونا چاہیے۔ وہ مقصد کیا ہے۔

حکماء اور فلاسفہ عہد قدیم سے اب تک اس گره کو کھولنے میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ بیسیوں نظریے پیش کئے گئے ہیں، بزمِ فلسفہ و حکمت میں بھانست بھانست کی بولیاں سننے میں آتی ہیں۔ لیکن بات بنتی نظر نہیں آتی۔ آرا کے اس اختلاف اور حکما کی باہمی کشاکش کو دیکھ کر انسان چکرا جاتا ہے۔ کسی نے سعادت کو کسی نے مسرت کو، کسی نے قوت اور غلبہ کو، ضابطہ اخلاق کا حاصل قرار دیا ہے۔ یہ تمام الفاظ حد درجہ مبہم ہیں۔ ہر شخص حسبِ منشا ان کی تشریح کر کے اپنا مطلب نکال سکتا ہے۔ اس پر ستم یہ ہے کہ ان نظریات میں باہمی تضاد ہے جس کے باعث یقین کی شمع ٹمٹانے لگتی ہے۔ شکوک و شبہات کا دھواں پھیلنے لگتا ہے۔

اسلام نے انسان کو ان شرف المخلوقات قرار دیا ہے۔ قرآن نے اس کو زمین پر

اپنے خالق کا خلیفہ بتایا ہے۔ فرشتوں نے اس کی عظمتوں کو سجدے کیے ہیں۔ اس لیے اس کے ضابطہ اخلاق کا مقصد کوئی گھٹیا چیز نہیں ہو سکتی۔ اس کا مقصد اس کے نمایاں شان ہونا چاہیے۔ ذاتی اغراض شخصی مفادات، لذت و سرور ادنیٰ ترین مقام ہیں۔ اسلام یہ پسند نہیں کرتا کہ انسان کا دامن ان سے آلودہ ہو۔ چنانچہ اس آیت طیبہ سے حضور رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے اس مقصد عظیم کا اعلان فرمایا جو مسجود ملائک کو زیب دیتا ہے۔

قُلْ اِنْ صَلَاتِيْ وَ  
نَسِيْتِيْ وَ مَحْيَايَ وَ  
مَمَاتِيْ لِلّٰهِ مَرْبِّ  
الْعٰلَمِيْنَ -  
اے حبیب باپ اعلان کر دیجئے کہ  
میری نماز، میری عبادتیں، میری زندگی  
اور میری موت، صرف اس اللہ تعالیٰ کی  
رضا کے لیے ہے جو رب العالمین ہے

یہ ہے وہ مقصد جلیل جس کا اعلان بادی برحق نے فرمایا۔ جو انسان کے مقام رفیع سے مناسبت رکھتا ہے۔ بلکہ اس مقصد کی رعنائیاں اور لفریبیاں خاک کے پرانگندہ ذروں کو ہمدوش ثریا بنا دیتی ہے۔

نبی رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس امر کی وضاحت کی طرف توجہ نہیں دی کہ انسان کے اخلاق کا مقصد کیا ہے۔ بلکہ اپنی ساری کوششیں اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے وقف فرمائیں کہ انسان کا مقصد حیات کیا ہونا چاہیے اور اس نقطہ پر زور دیا ہے کہ رضائے الہی کے بغیر کوئی ایسی چیز نہیں جو انسان کا مقصد حیات بن سکے۔ چنانچہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر ان اہل ایمان کی توصیف کی گئی ہے جو انہی جان اور اپنا مال رضائے الہی کے لیے قربان کر دیا کرتے ہیں

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي  
بَعْضُ لَوْكٍ أَيْسَهُمْ جِوَانِي جَانِ كُوخَا  
نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ  
كِي رِضَا كِي لِي سِي دِي تِي هِي، اُور  
اللَّهُ رَوْفٌ بِالْعِبَادِ -  
اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔

سورہ النسا میں ارشاد باری تعالیٰ ہے :

وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ ابْتِغَاءَ  
اُور جُویہ تمام کام اللہ تعالیٰ کی رضا کے  
مَرْضَاةِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ  
لِيے کرے گا تو ہم اس کو بڑا اجر  
أَجْرًا عَظِيمًا -  
دیں گے۔

انسان کے فطرۃ گنہگار یا معصوم ہونے کے بارے میں عیسائیت، دیگر مذاہب اور اسلام کے نظریات آپس میں بچے۔ نظام اخلاق کی غرض و غانت جس کو اپنانے کی ترغیب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی، اس کا تذکرہ بھی ہو چکا۔ اب ان خصوصیات کی طرف اشارہ مطلوب ہے، جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کردہ ضابطہ اخلاق کا طرہ امتیاز ہے۔ وہ خصوصیات ان گنت ہیں۔ میں یہاں چند ایک کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں گا۔

(الف) کوئی چیز خواہ کتنی منفعت بخش اور حسین و جمیل ہو اس میں جب افراط و تفریط راہ پالیتی ہے، تو اس کی منفعت مضرت میں بدل جاتی ہے۔ اس کا حسن و جمال پر اگندگی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسلام ہر کام میں اعتدال اور میانہ روی کو خاص اہمیت دیتا ہے۔ اس کے دین الہی ہونے کی یہ ایک روشن دلیل ہے۔ عبادات، معاملات قوانین اور اخلاق الغرض اس کے جملہ اوامر و نواہی میں اعتدال کا نور جھلک رہا ہوتا ہے۔ بشریت موسوی کا مطالعہ کرتے ہوئے ہر قدم پر شدت اور سختی کا احساس ہوتا ہے

معلوم ہوتا ہے کہ رحمت و رافت کی یہاں ذرا گنجائش نہیں، تو راست کا ہر قانون عادلانہ انتقام پر مبنی ہے۔ کتاب الخروج باب ۲۱ کی آیات ۲۳ تا ۲۵ ملاحظہ ہوں۔

..... ” لیکن اگر نقصان ہو جائے تو تو جان کے بدلے جان لے اور آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت، ہاتھ کے بدلے ہاتھ، پاؤں کے بدلے پاؤں، جلانے کے بدلے جلانا، زخم کے بدلے زخم اور چوٹ کے بدلے چوٹ۔

قاتل کو ہر حالت میں قتل کرنا ضروری ہے بمقتول کے وارثوں کو دیت ادا کر کے وہ اپنی جان نہیں بچا سکتا۔ چنانچہ گنتی باب ۳۵ کی آیت ۳۱ ملاحظہ ہو۔

..... ” اور تم اس قاتل سے جو واجب القتل ہو، دیت نہ لینا، بلکہ وہ ضروری مارا جائے۔“

اس کے برعکس ہم شریعت عیسوی پر جب نظر ڈالتے ہیں تو وہاں عدل و انصاف قائم کرنے کا جذبہ بہت کمزور نظر آتا ہے۔ وہاں صرف درحمت اور عفو و درگزر پر زور دیا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے ایک مشہور وعظ میں اپنی تعلیم کا اعلان ان لفظوں میں کیا ہے:

”تم نے یہ سنا ہو گا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ برائی کا برائی سے مقابلہ نہ کرو۔ بلکہ جو شخص تمہارے داہنے گال پر طمانچہ مارے اس کے سامنے دوسرا گال بھی کر دو۔ جو شخص لڑنے جھگڑنے میں تمہارے کپڑے پکڑے۔ اس کو چادر بھی دے دو۔ جو شخص تم کو ایک میل تک بیگار میں پکڑ کر لے جاتے اس کے ساتھ

دو میل تک چسے جاؤ۔ جو تم سے مانگے اس کو دو۔ جو تم سے قرض لینا چاہے  
اس کو واپس نہ کرو۔“ (متی، باب ۵)

لیکن داعی دینِ فطرت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے  
عدل و احسان دونوں میں حسین توازن پیدا کیا۔ اس طرح یہودیت اور عیسائیت میں  
جو خامیاں تھیں ان کا ازالہ فرمادیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ربِّ کریم کا یہ  
فرمان اولادِ آدم کو سنایا۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ -  
يَقْنَأُ اللَّهُ تَعَالَى عَدْلًا وَاحْسَانًا دُونًا  
کا حکم دیتا ہے۔

بے شک معاشرہ میں امن و امان کے قیام اور فتنہ و فساد کا قلع قمع کرنے کے لیے  
قانون کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں، لیکن اس سے بدکار انسان کو عبرت ناک سزا  
تو دی جاسکتی ہے۔ لیکن اس کے قلب میں بُرائی سے نفرت کا جذبہ پیدا نہیں کیا  
جاسکتا۔ اسی طرح اخلاق سے ان لوگوں کی اصلاح تو ممکن ہے جو نیک فطرت اور  
سلیم الطبع ہیں، لیکن معاشرے کے سارے افراد تو ایسے نہیں ہوتے جو اخلاقِ حسنہ  
کی تعلیمات کو شرح صدر سے قبول کر لیں۔ بدسرشت اور اکھڑ مزاج افراد کی بھی کمی نہیں  
اس لیے معاشرہ کی تطہیر، اصلاح اور صحت مند نشوونما کے لیے قانون اور اخلاق  
دونوں کی اشد ضرورت ہے اور ان میں حسین امتزاج صرف حضور نبی اکرم صلی اللہ  
تعالیٰ علیہ وسلم کے پیش کردہ ضابطہ اخلاق میں نظر آتا ہے۔

(ب) اسلامی تعلیمات کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان کو  
اپنی بدکرداری اور گناہ کے عبرت ناک انجام سے بے خوف نہیں ہونے دیتا اور نہ

اس کو مایوسی کے عمیق گڑھے میں گرنے دیتا ہے۔ بیم ورجا کی کیفیت ہر قدم پر ملحوظ رکھی جاتی ہے تاکہ انسان اپنے اعمالِ بد کے نتائج سے خوفزدہ بھی رہے اور اس کے ساتھ ساتھ رحمتِ الہی سے مایوس بھی نہ ہو۔ ارشادِ الہی ہے:

يُعْبَادِي الَّذِينَ أَسْرَفُوا      اے میرے بندو! جنہوں نے اپنے  
عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا      نفسوں پر زیادتی کی اللہ کی رحمت سے  
مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ      مایوس مت ہو۔

بلکہ مایوسی کو گناہ قرار دیا اور اسے کفار و منکرین کا شیوہ کہا گیا ہے:

وَلَا تَأْيِسُوا مِنَ رُوحِ اللَّهِ      یعنی رحمتِ الہی سے مایوس نہ ہو اللہ  
إِنَّهُ لَا يَأْتِيَنَّ مِنَ رُوحِ اللَّهِ      تعالیٰ کی رحمت سے صرف کفار ہی  
إِلَّا الْقَوْمَ الْكَافِرُونَ      مایوس ہوتے ہیں۔

(اگر تم نے اپنی زندگی کا قیمتی حصہ نافرمانی اور سرکشی میں ضائع کر دیا ہے، اب بھی اگر تم اپنے کئے پر ندامت محسوس کرتے ہو تو توبہ کا دروازہ کھٹکھٹاؤ، رحمتِ الہی کو تم اپنا منظر پھاؤ گے۔)

(ج) معاشرہ میں نیکی کو فروغ دینا اور برائی کا قلع قمع کرنا صرف ایک فرد یا چند اشخاص کی ذمہ داری نہیں، بلکہ ساری قوم کا اجتماعی فریضہ ہے۔ امت مسلمہ کو خیر الامم کے لقب سے سرفراز کرنے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے:

تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ      کہ تم نیکی کا علم کرتے ہو اور برائی سے  
عَنِ الْمُنْكَرِ      روکتے ہو۔

اگر امت کے چند افراد اس فرض کو ادا کریں اور دوسرے لوگ اس سے بے تعلق

اور بے حسی کا مظاہرہ کریں تو ایسا معاشرہ کیونکر معرض وجود میں آئے گا، جس کا ظاہر و باطن، جلوت و خلوت، نیکی کے نور سے منور ہو جس میں برائی اور گناہ کے خلاف ایک عمومی نفرت اور بیزاری کا جذبہ پایا جائے کیوں کہ ملتِ اسلامیہ کے تمام افراد کا مفاد اور مضرت مشترک ہے۔ اس لیے یہ ذمہ داری بھی تمام پر یکساں عائد ہوتی ہے۔ حضور سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو بڑی دل فرور اور دلنشین مثال سے واضح فرمایا ہے کہ ایک جہاز میں اوپر تین درجے ہیں بہر درجہ میں کچھ مسافر فروکش ہیں۔ سب سے نچلے درجے والے جہاز کے پینڈے میں سوراخ کر کے پانی لینا چاہتے ہیں۔ اگر بالائی منزلوں کے مکین سوراخ کرنے سے ان کو روک دیں تو وہ خود بھی بچ جائیں گے اور انھیں بھی بچالیں گے اور اگر اوپر والے تعلقے کا مظاہرہ کریں گے تو جب سوراخ ہو جائے گا اور جہاز میں پانی بھر جائے گا تو جہاز اپنے تمام مسافروں سمیت غرق ہو جائے گا۔

بعینہ اسی طرح جو لوگ معاشرہ میں بدکاری اور فحاشی کو پھیلانے میں مصروف ہیں اگر قوم کے باشعور افراد نے ان کو سختی سے روک دیا تو ان کی لگائی ہوئی آگ سے ساری ملت محفوظ ہو جائے گی۔ لیکن اگر ان لوگوں کو فسق و فجور کی آگ بھڑکانے کی اجازت دے دی گئی، تو صرف وہی اپنی جلائی ہوئی آگ میں بھسم نہیں ہوں گے، بلکہ ملت کے سارے ایوان کو جلا کر راکھ کا ڈبیر بنا دیں گے۔ اسی لیے اسلام میں معاشرہ سے کٹ کر گوشہ عزلت میں زندگی بسر کرنے اور کشمکش حیات سے فرار اختیار کر کے رہنمائی کو اپنانے سے روکا گیا ہے۔

اسلام کے نظامِ اخلاق کی بے شمار خصوصیات میں سے یہ چند اہم خصوصیات ہیں

جو اسے دوسرے نظاموں سے ممتاز کرتی ہیں۔

## اسلامی نظامِ اخلاق

قرآنِ کریم اور سنتِ نبوی کے ذخائر اسلامی نظامِ اخلاق کی تفصیلات سے پُر ہیں۔ میں یہاں صاحبِ خلقِ عظیم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشادِ گرامی نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں جس کی جامعیت نظامِ اخلاق کی جملہ جزئیات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ نبی رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

میرے رب نے مجھے نوباتوں کی وصیت	أَوْصَانِي رَبِّي بِتَسْعِ
کی ہے میں تمہیں بھی ان باتوں کی وصیت	أَوْصِيكُمْ بِهَا - أَوْصَانِي
کرتا ہوں۔ تجھے وصیت فرمائی گئی ہے کہ	بِإِلْخَالِصٍ فِي السِّرِّ وَ
میں خلوت و جہوت میں اخلاص کا مظاہرہ	الْعَلَانِيَّةِ - وَالْعَدْلُ فِي
کروں۔ خوشنودی اور غصہ دونوں حالتوں	الرِّضَا وَالغَضَبِ - وَالْقَصْدِ
میں عدل کروں۔ ثروت اور افلاس	فِي الْغِنَى وَالْفَقْرِ - وَأَنْ
دونوں صورتوں میں میانہ روی اختیار کروں	أَعْفُو عَمَّنْ ظَلَمَنِي وَ
اور جو مجھ پر ظلم کرے میں اس کو معاف	أَعْطَى مَن حَرَمَنِي
کر دوں۔ جو مجھے محروم رکھے، اس کو	وَاصِلَ مَنْ قَطَعَنِي
عطا کروں جو میرے ساتھ قطعِ رحمی کرے	وَأَنْ يَكُونَ صَمَتِي
میں اس سے صلہِ رحمی کروں میری خاموشی	فِكْرًا وَ نَطْقِي
غور و فکر ہو۔ میری گفتگو ذکرِ الہی ہو اور	ذِكْرًا وَ نَظْرِي



## نبی کریم صاحبِ خلقِ عظیم

اب آئیے اس مقدس ہستی کی کتابِ حیات کا مطالعہ کریں، جس کے روح پرور ارشادات اور انقلاب آفرین تعلیمات نے خود فراموش انسان کو خود شناس بنایا اور اس کے دل میں اپنی منزلِ رفیع پر پہنچنے کی بے چین تمنا پیدا کر دی۔ ذرا دیکھیں! اس کے اپنے شب و روز کیسے بسر ہوتے تھے، اس کا اپنا اخلاقی معیار کیا تھا، لیکن اس سے پیسے میں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری سمجھتا ہوں۔ خلقِ صرف رحمت و رافت، عفو و درگزر اور تواضع و انکساری کا نام نہیں۔ اخلاق کا یہ نہایت محدود تصور ہے انتہائی اشتعال انگیز ماحول میں جذبات کو قابو میں رکھنا، ناگفتہ بہ حالات میں ثبات و استقامت کا مظاہرہ کرنا، باطل کی طاغوتی قوتوں کے سامنے سر بلند کر کے سینہ سپر ہونا، اپنے مقصدِ حیات سے لازوال وابستگی اور وفا کیشی میدانِ جنگ میں ناموافق حالات میں بھی جرات و بسالت کا اظہار کرنا اخلاقِ حسنہ کے اہم ترین پہلو ہیں۔

حضور سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی کتابِ حیات کا ہر ورق جسدِ مکارمِ اخلاق سے روشن و تابندہ ہے۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب دعوتِ حق کا آغاز کیا تو حضور کی للکار کی ہیبت سے باطل کے ایوانوں میں زلزلہ آگیا۔ انھوں نے شمعِ حق کے پروانوں پر جو روستم کی انتہا کر دی لیکن ان کا جذبہٴ ایمان کم نہ ہوا۔ روز بروز غلامانِ مصطفیٰ علیہ السجۃ و الثنا میں اضافہ ہونے لگا۔

ایک روز اہل مکہ کا ایک وفد جناب ابوطالب کے پاس گیا اور انہیں ساری

قوم کا یہ پیغام سنایا کہ آپ کے بھتیجے نے ہمارا ناک میں دم کر دیا ہے۔ وہ صبح و شام ہمارے بتوں کی توہین و تضحیک کرتا رہتا ہے۔ آپ قوم کے بزرگ ہیں۔ ہمیں آپ کا احترام ملحوظ ہے۔ اسی لیے آج تک ہم نے آپ کے بھتیجے کے خلاف کوئی موثر کارروائی نہیں کی۔ اب ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ آپ اپنے بھتیجے سے پوچھتے کہ فٹنڈ انگریزی سے دو کیا مطلب حاصل کرنا چاہتا ہے، اگر اسے دولت کی خواہش ہے تو ہم اس کے قدموں پر زرو سیم کے ڈھیر لگا دیتے ہیں۔ اگر اسے کوئی رشتہ مطلوب ہے تو ہم اس کی دامادی کو اپنے لیے باعث شرف سمجھیں گے اور اگر اسے حکم ان بننے کا شوق ہے تو ہم اسے بصد مسرت اپنا سر براہ ماننے کو تیار ہیں۔ لیکن اگر وہ پھر بھی باز نہ آیا تو ہم آپ کا مزید احترام برقرار نہ رکھ سکیں گے۔ جناب ابوطالب نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے بھتیجے کو سمجھائیں گے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے محترم چچا کے پاس تشریف لائے تو انہوں نے سارا ماجرا بیان کیا۔ چچہ کہا: میں بوڑھا ہو گیا ہوں، مجھ میں اب اتنی سکت نہیں کہ تنہا ساری قوم کا مقابلہ کر سکوں۔ اس لیے اب ان کے عبودوں کے خلاف کچھ کہنا چھوڑ دیں۔ حضور کی ذات جو نہ اپارافت و رحمت تھی اس وقت اس کا ایک ٹوکھا پلو آشکارا ہوا۔ حضور نے فرمایا: غم متیتم، اگر اہل مکہ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں پر چاند لاکر رکھ دیں تب بھی میں توحید کی تبلیغ سے باز نہیں آؤں گا۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک یہ دعوت کا میاب ہو جائے یا میری زندگی کے دن پورے ہو جائیں۔

سبحان اللہ! کیا جلال ہے اس جمال میں! اور کیا ممکنیت ہے پیکرِ سادہ و تواضع کے اس جواب میں۔ ہر مجلس داعی کو اپنی دعوت سے حد درجہ پیارا اور محبت ہو جاتی ہے۔

یہی جذبہ رکاوٹوں کی چٹانوں کو ریزہ ریزہ کرتا ہے، کامیابی کی راہ ہوا کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں بھی حضور کی شان نرالی تھی۔ ایک روز محبوب رب العالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مصروف عبادت تھے، بد بخت ابو جہل حضور کو یوں مصروف عبادت دیکھ کر آپلے سے باہر ہو گیا۔ اور حضور پر حملہ کر دیا اور شدید زرد کو ب کیا۔ حضور کے چچا حمزہ ابھی تک مشرف باسلام نہ ہوتے تھے۔ اس روز سارا دن جنگل میں شکار کھیلتے رہے۔ شام کو واپس آئے ہر مار مار کر ساتھ لائے۔ اپنی لونڈی کے سامنے اپنی نشانہ بازی اور بہادری کی تعریف کرنے لگے لونڈی نے کہا: حیف ہے تمہاری اس جرات پر تمہارے بھتیجے کو تو ابو جہل نے مار مار کر لہو لہا کر دیا ہے اور تم دن بھر ہرنوں کا شکار کرتے رہتے ہو یہ سن کر خون جوش میں آیا۔ اپنی کمان لے کر ابو جہل کی تلاش میں گئے۔ اسے ڈھونڈا اور اسے خوب مارا۔ دل کی بھر اس نکالنے کے بعد حضور کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور بتایا کہ میں نے آپ کا بدلہ ابو جہل سے لے لیا ہے۔ اب تو آپ خوش ہیں حضور نے فرمایا: ”میں ان باتوں سے خوش نہیں ہوا کرتا“ یہ غیر متوقع جواب سن کر حمزہ پر حیرت طاری ہو گئی لیکن قسمت یاور تھی۔ انھوں نے دریافت کیا کہ پھر آپ کس بات سے خوش ہوتے ہیں۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم اسلام لے آؤ تو میری خوشی کی انتہا نہ ہوگی۔ اپنی دعوت کے ساتھ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی یہ وابستگی دیکھ کر حضرت حمزہ کی آنکھوں سے غفلت کے پردے ہٹ گئے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دست مبارک پر مشرف باسلام ہو گئے۔

میدان جنگ میں فتح یاب ہونے کے بعد ہزیمت خوردہ دشمن سے انتقام نہ

لینا بے شک عالی ظرفی کی انتہا ہے، لیکن ذرا اُحد کے میدان کی طرف دیکھتے، فسح شکست میں تبدیل ہو چکی ہے، بہادر جان نثاروں کے لاشے بکھرے پڑے ہیں۔ اپنا جسم زخموں سے چور ہے، پھر بھی اولو العزمی کا یہ عالم ہے کہ اپنے زخمی ساتھیوں کو ساتھ لے کر مکہ کے فتحیاب شکر پر یغار فرماتے ہیں اور اس کے تعاقب میں حمراً الاسد تک بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ مکارم اخلاق کا یہ وہ پہلو ہے جس میں حضور کی ہمسری کا کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا۔

قیصر روم نے اسلام کی روز افزوں قوت کو اپنے مستقبل کے لیے خطرہ خیال کیا۔ اور اس نے مدینہ طیبہ پر چڑھائی کے لیے ایک لاکھ کے قریب لشکر تیار کیا تاکہ اس کی نئی قوت کو ابتدائی مرحلہ میں ہی نیست و نابود کر دیا جائے جسور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جب اس کے ارادے کی اطلاع ملی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو پسند نہ فرمایا کہ مملکتِ اسلامیہ کا کوئی گوشہ میدانِ جنگ بنے، بلکہ مجاہدینِ اسلام کو ہراہ لے کر پیش قدمی کرتے ہوئے دشمن کے علاقہ میں تبوک کے مقام تک پہنچ گئے اور وہاں اپنے خیمے نصب کر دیئے۔ قیصر پر ایسا عجب طاری ہوا کہ وہ حضور نبی رحمتؐ کے ساتھ جنگ کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ کچھ عرصہ وہاں قیام فرما رہنے کے بعد حضور منظر و منصور مرکزِ اسلام مدینہ طیبہ میں مراجعت فرما ہوئے۔

خلقِ عظیم کے اس پیکرِ جمیل کی رعنائیاں آج بھی قلب و نظر کو شکار کر رہی ہیں اور افسردہ جذبات کو نئی توانائیاں بخش رہی ہیں اور مردہ دلوں کو نئی زندگی عطا کر رہی ہیں۔ اسی کی برکت ہے کہ امت کے ہر طبقہ میں ہمیں اخلاق کی ایسی بلندیاں نظر آتی ہیں جن کی مثال چشمِ فلک پر کو اور کہیں نظر نہیں آتی۔

اگرچہ شام، فلسطین، لبنان، اردن وغیرہ علاقوں کو قیصر روم کے تسلط سے عہد فاروقی میں آزاد کرایا گیا تھا، لیکن رومی سلطنت کی سرحدیں مملکت اسلامیہ کی سرحد کے ساتھ دور دور تک چلی گئی تھیں۔ اور رومی حکومت سے اکثر و بیشتر جنگ و جدال کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ سلجوقی فرمانروا الپ ارسلان کے دور میں مائیکل ہفتم قیصر روم کے ساتھ تعلقات از حد شدید ہو گئے۔ یہاں تک کہ نوبت جنگ رسید قیصر کے لشکر کی تعداد ایک لاکھ تھی، جب کہ الپ ارسلان کی فوج صرف پندرہ ہزار مجاہدین پر مشتمل تھی۔ ارسلان نے چاہا کہ جنگ کی نوبت نہ آئے اور مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے، لیکن قیصر کو اپنی قوت اور لشکر کی کثرت پر بڑا گھمنہ تھا۔ اس نے مصالحت کی ساری کوششیں ناکام بنا دیں۔

آخر کار جنگ شروع ہوئی، گھمسان کارن پڑا۔ ارسلان کے مجاہدین نے قیصر کے لشکر جبار کو شکست فاش دی اور قیصر کو گرفتار کر لیا۔ مائیکل ہفتم جب ایک جنگی قیدی کی حیثیت سے الپ ارسلان کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ تو الپ ارسلان نے اس کی عزت و تکریم کی حد کر دی۔ بڑے احترام سے اسے پاس بٹھایا پھر اس سے پوچھا کہ اگر تم میری جگہ ہوتے اور مجھے تمہارے سامنے جنگی قیدی کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تو تم میرے ساتھ کیا سلوک کرتے۔ قیصر نے کہا کہ میں دروں سے تمہاری کھال ادھیڑ دیتا۔ الپ ارسلان نے اس کا یہ گستاخانہ جواب سن کر صرف اتنا کہا کہ بے شک مسلمان اور عیسائی میں یہی فرق ہے۔ اس کے بعد بڑی عزت و احترام کے ساتھ قیمتی تحائف دے کر اسے آزاد کر دیا اور اس کا مفتوحہ علاقہ بھی اس کو واپس کر دیا۔

سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سا لہا سال صلیبی حملہ آوروں

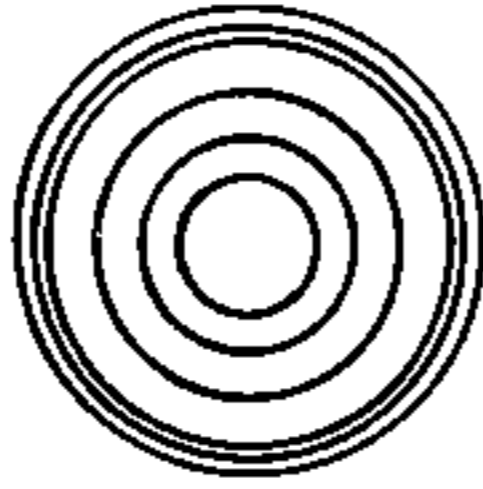
سے نبرد آزار ہے، ایک دفعہ انگلستان کے بادشاہ رچرڈ جسے شیر دل کہا جاتا تھا سے معرکہ کارزار گرم تھا۔ سلطان نے دیکھا کہ رچرڈ کا گھوڑا مارا گیا ہے اور وہ پیدل مصروف قتال ہے۔ اسی وقت اپنے اصطلیل سے ایک قیمتی اسیل گھوڑا منگوایا اور رچرڈ کی طرف بھیجا تا کہ وہ اس پر سوار ہو کر سلطان کا مقابلہ کرے۔

قوموں کے سیاسی زوال سے پہلے ان کا اخلاقی انحطاط شروع ہوتا ہے جو بالآخر انھیں ایوان اقتدار سے نکل جانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے، اسی طرح قوموں کا سیاسی عروج تب شروع ہوتا ہے، جب ان کے اخلاق میں بندگی اور سیرت میں سچائی آجاتی ہے جس قوم کے سامنے نبی رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہو۔ وہ کیوں بادیۃ ضلالت میں بھٹکتی رہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنے ہادی برحق نبی کریم رحمۃ للعالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اخلاق حمیدہ کو اپنا کر گھویا ہوا مقام حاصل کر سکیں۔

عزت مآب جناب حکیم حافظ محمد سعید صاحب ساری ملت کے شکر یہ کے مستحق ہیں کہ ان بدلے ہوئے حالات میں انھوں نے دعوت حق کا ایک اچھوتا انداز اختیار کیا ہے جو باوقار بھی ہے اور اثر انگیز بھی۔ وہ ہر سال ایک موضوع منتخب کرتے ہیں اور ملک کے معروف دانشوروں اور علماء کرام کو اس موضوع پر اظہار خیال کی دعوت دیتے ہیں اور یہ اجلاس ایسے مقامات پر منعقد کیے جاتے ہیں جہاں وہ لوگ بھی شرکت کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں جو وعظ و ارشاد کی دیگر محافل میں شرکت کرنے سے بوجہ گریزاں رہتے ہیں۔ قوم کے اخلاقی انحطاط کو سنبھال دینے کے لیے اس سال کے لیے انھوں نے ”آواز اخلاق“ کا عنوان تجویز فرمایا۔ فقیر ذاتی طور پر

ان کا پیاس گزار ہے کہ انہوں نے اس باوقار محفل میں مجھے اظہارِ خیال کا موقع بخشا۔  
 بارگاہِ الہی میں صدقِ دل سے دستِ بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ محترم حکیم صاحب کی  
 مساعی جمیدہ کو ثمرِ بار کرے اور انہیں مزید توفیقات سے بہرہ ور فرمائے، اور انہیں  
 اجرِ عظیم عطا فرمائے۔

امین، ثم امین بجاہِ ظلہ ولسین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم



اتباعِ سنتِ نبویؐ

قرآن کی روشنی میں









قرآن حکیم میں ایسی بے شمار آیتیں ہیں جن میں علیم وخبیر خدا نے اپنی مخلوق کو اپنے اس برگزیدہ بندے اور مقبول رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر مشروط اطاعت کا حکم دیا ہے اور بارہا تنبیہ بھی فرمائی ہے کہ جس نے اس کی فرماں برداری سے انحراف کیا وہ اپنے پُروردگار کا باغی ہے۔ اس کے انعامات سے محروم اور اس کے غیظ و غضب کا سزاوار ہے

چند آیات ملاحظہ ہوں :

### پہلی اور دوسری دلیل

۱) قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ	اے میرے رسول! تم فرماؤ! اگر تم محبت
فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَ	رکھتے ہو اللہ کی تو میری راہ چلو، تاکہ محبت
يَغْفِرَ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ	کرے تم سے اللہ اور تمہارے گناہ بخش
غَفُورٌ رَحِيمٌ (آل عمران)	وے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔
۲) قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَ	اے میرے رسول! تم فرماؤ، حکم مانو
الرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ	اللہ کا، اور رسول کا۔ پھر اگر وہ اعمہ انہیں
اللَّهُ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ۝	کریں تو اللہ کی کافروں سے محبت نہیں ہے،

یہ ہے قرآن پاک کی آیات بیانات کا اعجاز کہ ان کے سامنے شک اور اربیتات کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور حقیقت اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ بے نقاب ہو جاتی ہے، ان دو آیتوں پر غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ کیا فرماتا ہے۔ ارشاد ہے؛

وہ لوگ جو میرے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع نہیں کرتے، اس کے نقش پا کو اپنا خضر راہ نہیں بناتے اور اس کے ارشادات کے سامنے سہمنا و اطعنا کہتے ہوئے سرسليم خم نہیں کر دیتے، اور پھر کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمارے دل تیری محبت سے سرشار اور سینے تیرے نور عشق سے معمور ہیں، وہ جھوٹے ہیں، ان کا تو مجھ سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اگر واقعی انھیں مجھ سے الفت ہے تو میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ میں بھی ان سے محبت کرنے لگوں گا، یعنی پہلے وہ صرف محب تھے اور اس دعویٰ محبت کی صداقت پر ان کے پاس کوئی دلیل بھی نہیں تھی، لیکن جب میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا شرف انھیں حاصل ہو جائے گا، تو ان کا دعویٰ محبت بھی مسلم اور انھیں خلعت محبوبیت بھی مبارک۔

محبوبیت حقیقت میں خدا تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور فرمانبرداری میں سنجگی اور ثبات کا نتیجہ ہے۔ اسی حقیقت کی طرف تو حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے اپنے اس شعر میں اشارہ کیا ہے۔

چوں تمام افسد، سراپا ناز می گرد دنیا  
قیس را لیلیٰ ہے نامند در صحرائے من

## محبتِ الہی کی وضاحت

اس آیت کریمہ میں تعجبوں اللہ اور یحب بکرم اللہ کے الفاظ میں محبت کا جو ذکر کیا گیا ہے، اس پر اگر مزید غور کیا جائے تو حقیقت یوں اُجاگر ہو جاتی ہے کہ پھر کسی کو مجال انکار نہیں رہتی۔

محبت کیا ہے؟ بندے کی محبت اللہ تعالیٰ سے کیسی ہوتی ہے؟ اور اللہ تعالیٰ کی محبت اپنے بندے سے، کا کیا معنی ہے؟

محبت کہتے ہیں اس کشش اور میلان کو جو دل میں کسی باکمال ہستی کی طرف پیدا ہوتا ہے خواہ وہ کمال جمال معنوی ہو یا صورتی، حسن ظاہری ہو یا حسن سیرت و شمائل اور یہ جذبہ اسے اس ہستی سے قریب تر ہونے کے لیے بے تاب رکھتا ہے۔ بندہ جب یہ سمجھ لیتا ہے کہ گلستانِ حسن و خوبی کی ہر کلی اور ہر پتی پر اس ذاتِ احدیت کا جمال جلوہ طراز ہے اور آنکھ جو کمال کہیں اور کسی شکل میں دکھیتی ہے، اس کا سرچشمہ وہی ذاتِ احدیت ہے تو اس کے عشق و محبت اور اجلال و احترام کی محرابوں کے مصنوعی صنم پائش پائش ہو جاتے ہیں اور اس کے ان تمام جذبات کا مرکز صرف وہی ایک ذات رہ جاتی ہے۔ اس کا یہ جذبہ کیونکر ایجابی ہوتا ہے۔ اس لیے اپنے محبوب حقیقی کی عبادت اور اطاعت میں عملی طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ جذب نہاں کی اسی نمود اور ظہور کو مَحَبَّةُ الْعَبْدِ لِلَّهِ (بندے کی اللہ سے محبت) کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اگر خلوص نیت اور عزمِ صادق کی زاد لے کر وہ راہِ عشق پر چل سکے گا تو بارگاہِ

ربوبیت سے جلد ہی رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ اللهُ تعالیٰ ان سے راضی اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی کی نوید جانفزا سامع نواز ہوتی ہے، اسی سرفرازی اور پذیرائی کو اللہ تعالیٰ کی اپنے بندے سے محبت کہا جاتا ہے۔

دل عاشق میں وصالِ حبیب کے لیے بیقراری کی جو آگ بھڑک رہی ہوتی ہے وہ اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ کوئی ایسی صورت نکالے خواہ جان پر ہی کیوں نہ کھینا پڑے جس سے وصال پیسر ہو۔ اب اگر اللہ تعالیٰ اپنے عاشقانِ دل نگار کی رہنمائی نہ فرمائے تو یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے عقل و فکر کی قوت سے قربِ الہی حاصل کر سکیں کیونکہ ان کی عقل کتنی ہی روشن ہو بہر حال محدود ہے۔ ان کا فکر کتنا ہی بلند پرواز ہو، بہر حال انسانی فکر ہے۔ اسی لیے رب العالمین نے اپنا رسول بھیجا اور تمام دنیا والوں کو بتا دیا کہ اگر میری رضا و قرب کے خواہشمند ہو اور میرے وصال کے طلب گار ہو تو گمان و تخمین کی دلدلوں میں نہ بھٹکتے پھر دو بلکہ میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن پکڑ لو۔ اس کے بتائے ہوتے طریقے پر میری یاد کرو۔ اس کے سکھلائے ہوتے اسلوب پر میری عبادت کرو۔ اپنی اقتصادی، سیاسی اخلاقی اور معاشرتی مشکلات کو اس کے ارشادات کے مطابق حل کرو۔

یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا	اے ایمان والو! اسلام میں مکمل طور پر
فِي السَّلَامِ كَافَّةً وَ لَئِنْ	داخل ہو جاؤ۔ اور شیطان کے قدموں
تَبِعُوا أخطواتِ الشَّيْطَانِ	پر مت چلو۔ بے شک وہ تمہارا کھلا
لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ (البقرہ)	دشمن ہے۔

یہی میری رضا مندی کے حصول کا واحد ذریعہ ہے اور صرف اسی طرح تمہیں میرا

قرب حاصل ہو سکتا ہے۔

اب اگر کوئی محبتِ الہی کا مدعی ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہیں کرتا یا تو وہ نادان ہے یا وہ اپنے دعویٰ محبت میں جھوٹا ہے۔

اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اتباعِ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مزید برکت کا بھی ذکر فرمایا کہ **يَغْفِرُ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ** کہ اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے تمہارے گناہ بخش دیئے جائیں گے، تمہاری لغزشوں اور کوتاہیوں پر قلمِ عفو پھیر دیا جائے گا۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ قوموں پر خدائے قہار کا عذاب ان کے گناہوں اور بدکرداریوں کی وجہ سے نازل ہوتا ہے۔ قیامت خیز قحط، ہلاکت آفریں جنگیں اور تباہ کن امراض کے شکنجہ میں قدرتِ بلا وجہ نہیں کس دیتی بلکہ انسان کی اپنی بد اعمالیوں کا طبعی ردّ عمل ہوا کرتا ہے۔

ذَلِكَ بِمَا قَدَّمْتُمْ أَيْدِيكُمْ  
وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ  
لِّلْعَبِيدِ ط  
یہ بدلہ ہے اسی کا جو تم نے آگے بھیجا  
اپنے ہاتھوں اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں  
پر ہرگز ظلم نہیں کرتا۔

لیکن اطاعتِ رسولِ عربی وہ اکسیر ہے، جس سے جاں بلب مریض شفا یاب ہو جاتا ہے۔ اس کے اعجاز سے ان قوموں کو تاجِ سرور می عطا کیا جاتا ہے جو قعرِ مذلت میں مدتوں سے پڑی سڑ رہی ہوتی ہیں، اسی کے صدقے ان امتوں کو حیاتِ نو اور ذوقِ عمل مرحمت کیا جاتا ہے، جو اپنی سست گامی سے زندگی کی دوڑ میں شکست کھا چکی ہوتی ہیں۔

تو چنان ہمانی اے جاں کہ بزیر سایہ تو

بکف آدرند ز اغان ہماں خلعت ہمانی

ایک قلب سلیم کے لیے تو اس روشن دلیل اور واضح برہان کے بعد کسی دوسری دلیل کی ضرورت نہیں لیکن دبیر ازل کے قلم معجزہ نگار نے کیونکہ اس مضمون کو مختلف ادوار سے پیش فرمایا ہے، اس لیے ان سے متمتع ہونا بھی عین سعادت ہے۔

## تیسری دلیل

اللہ تعالیٰ سورہ النساء پارہ چہارم میں ارشاد فرماتا ہے :

مَلِكٌ حُدُودُ اللَّهِ وَهَسْبٌ  
يُطِيعُ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلُهُ  
جَنَّتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ  
خَالِدِينَ فِيهَا ذَلِكَ  
الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ط

یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں اور جو حکم  
مانے اللہ اور اس کے رسول کا۔ اللہ  
اسے باغات میں لے جائے گا۔ جن  
کے نیچے نہریں رواں ہیں۔ اور یہی بڑی  
کامیابی ہے۔

یہ دنیا دار العمل ہے اور ہمارا عقیدہ ہے کہ قیامت کے روز تمام مخلوقات کو پھر  
زندہ کیا جائے گا، اور ان کے اعمال نیک و بد کا محاسبہ ہوگا۔ اطاعت کیش اور پاکباز  
جنت کی ابدی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے اور سرکشوں اور متکبروں کو دوزخ کا  
ایندھن بنایا جائے گا۔ اس جہاں میں ہمارا مقصد زلیست شوکت و سطوت، جاہ و  
منصب اور عیش و نشاط کے حصول تک محدود نہیں، گو ہم ان سے دست کش ہونا  
بھی کفرانِ نعمت سمجھتے ہیں۔ ہمارا عقاب بہت اس عالم آب و گل کے کوہستانوں میں

آشیانہ نہیں بناتا۔ اس کا شہین تو فردوسِ اعلیٰ کی سب سے اونچی چوٹی ہے۔  
 ہماری حقیقی کامیابی یہی ہے کہ ہم قیامت کے روز بارگاہِ الہی میں سرخرو ہوں، اور  
 اس کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے یہی بتایا ہے کہ اس کی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم  
 کی اطاعت کرو اور یہی سب سے بڑی کامرانی کی علتِ عامہ ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے  
 سرمدی انعامات کے مستحق صرف وہی خوش نصیب ہیں جنہوں نے فرمانِ مصطفوی  
 کو دل و جان سے تسلیم کیا۔

## پوتھی دلیل

اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کی گونا گوں برکات بیان کرنے  
 کے ساتھ حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی سے روکا۔ سورہ مجادلہ میں ارشاد ہے

لے ایمان والو! جب تم آپس میں مشورہ	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا
کرو، تو گناہ کرنے، حد سے بڑھنے	تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَنَاجُوا بِالرِّسْمِ
اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی	وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَةِ الرَّسُولِ
کا مشورہ نہ کرو اور نیکی اور برہنہ کاری کا	وَتَنَاجُوا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوَى
مشورہ کرو اور اللہ سے ڈرو جس کی	وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي إِلَيْهِ
طرف اٹھائے جاؤ گے۔	تُنْحَرُونَ ۝

دیکھتے اللہ تعالیٰ کس دلکش اور محبت بھرے انداز میں مسلمانوں کو ایسی سرگوشیوں سے  
 روکتے ہیں، جن میں فسقِ تعدی اور فحشِ الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی سازش کی جاتی  
 اور ساتھ ہی تنبیہ جاری فرمادی کہ یہ تمہاری سرگوشیاں مجھ سے اوتھیل نہیں۔ اگر تم باز نہ آئے



توقیامت کے دن تمہیں رسوا کیا جائے گا۔

اسلامی حکومتوں کے اربابِ حل و عقد، مجالس دستور ساز کے ارکان، مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبران اس آیت کو بار بار پڑھیں اور غور کریں کہ اللہ تعالیٰ نے کس وضاحت سے اس امر کی تصریح فرمائی ہے کہ سنتِ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف کوئی آئین یا قانون بنانے کا انھیں کوئی اختیار نہیں۔ اسلامی مملکت کے صدر، وزیر اعظم اور افسران کسی خود ساختہ مصلحت کی وجہ سے ترکِ سنت کے مجاز نہیں۔

## پانچویں دلیل

کئی مقامات پر رب العزت نے دوزخ کی آگ میں جلنے والوں اور عذابِ خداوندی میں گرفتار بندھیوں کا ذکر فرمایا کہ اس وقت ان کی آنکھیں کھلیں گی اور وہ اس وقت کھنکھاتے ہوئے اور اشکِ ندامت بہاتے ہوئے نہایت حسرت سے اپنے جرم کا اعتراف بدیں الفاظ کریں گے۔

يَوْمَ تَقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ رِفَىٰ  
التَّارِيقُ لَوْ نَ لَيْتَنَّا  
أَطَعْنَا اللَّهَ وَ أَطَعْنَا  
الرَّسُولَ ط (الاحزاب ۶۶)

جس دن ان کے منہ الٹ الٹ کر آگ  
میں تلے جائیں گے، کہتے ہوں گے،  
کاش! ہم نے خدا کی اطاعت کی ہوتی  
اور رسول کی اطاعت کی ہوتی۔

ہائے اس زود پشیمان کا پشیمان ہونا

## چھٹی دلیل

اور کہیں گے جب کہ ان کا یہ کہنا انھیں کوئی نفع نہ دے گا :

یَوْمَئِذٍ يَوْمَ الَّذِينَ كَفَرُوا  
وَعَصُوا الرَّسُولَ كَوَّسُوا  
بِهِمُ الْأَرْضُ وَلَا يَكْتُمُونَ  
اللَّهُ حَدِيثًا (النار: ۲۲)

اس دن تمنا کریں گے وہ جنہوں نے کفر  
کیا اور رسول کی نافرمانی کی۔ کاش انہیں  
مٹی میں دبا کر زمین ہموار کر دی جاتے اور  
وہ کوئی بات اللہ سے چھپا نہ سکیں گے۔

## ساتویں دلیل

مندرجہ ذیل آیت سورہ توبہ کی ہے۔ آپ اسے پڑھیے اور غور کیجئے کہ ان لوگوں  
پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور غضب کا کیا عالم ہے جو نور محمد ہادی اعظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ  
وسلم کی حرام کردہ اشیاء کو حرام نہیں سمجھتے اور فرزند ان توحید کو انہیں کون ہی سزا  
دینے کا حکم دیا گیا ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ  
بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا  
يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ  
وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ  
الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى  
يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ  
صَاغِرُونَ۔ (توبہ: ۲۹)

لڑو ان سے جو ایمان نہیں لائے اللہ  
پر اور قیامت پر اور حرام نہیں مانتے  
اس چیز کو جس کو حرام کیا اللہ اور اس  
کے رسول نے اور سچے دین کے تابع  
نہیں ہوتے یعنی وہ جو کتاب دیے گئے  
جب تک اپنے ہاتھ سے جزیہ نہیں  
ذلیل ہو کر۔

اللہ تعالیٰ نے نہایت کھلے طور پر یہ بیان کیا ہے کہ قرآن کریم کی اطاعت اور  
سنت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت مساوی طور پر فرض ہے اور جو سزا

قرآن سے سرتابی کرنے والے کی ہے اسی سزا کا مستحق سنت نبوی کا منکر ہے۔

## اکھویں دلیل

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا  
إِلَىٰ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ  
إِلَى الرَّسُولِ سَأَيَّبَتِ  
الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ  
عَنْكَ صُدُودًا -  
(النساء، ۶۱)

اور جب ان کو (جو بظاہر میں مسلمان  
ہونے کے مدعی ہیں) کہا گیا ہے کہ آؤ  
اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل فرمائی  
ہے اور اس کے رسول کی طرف تو تم  
نے دیکھا منافق لوگوں کو، وہ تم سے دور  
ہٹتے ہیں۔

قرآن کی اصطلاح میں وہ بھی منافق ہے جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے  
ارشاد گرامی کو ماننے سے انکار کرتا ہے۔ یعنی کوئی مسلمان تو سنت سے انحراف کا تصور  
مجہی نہیں کر سکتا۔ سنت سے انحراف تو فقط منافقین کا شیوہ ہے۔

## نویں دلیل

کیونکہ اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم رشد و ہدایت کی کفیل ہے! اسی لیے انسان  
روزِ محشر کی ندامت سے محفوظ ہو سکتا ہے۔ یہی بات جنت کی کلید ہے، اسی لیے اللہ  
تعالیٰ نے اپنی رحمت وسیع کا حق دار انھیں لوگوں کو ٹھہرایا ہے جو اطاعت رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم میں کوشاں رہتے ہیں۔  
وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ  
اور میری رحمت شامل ہے ہر چیز کو

فَسَاكِبْهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَ  
 يُوْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ  
 هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ الَّذِينَ  
 يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ  
 الْأَوْحَىٰ - الخ (الاعراف ۱۵۶-۱۵۷)

سو اس کو کھ دوں گا ان کے لیے جو  
 متقی ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو ہماری  
 باتوں پر یقین رکھتے ہیں اور وہ لوگ جو  
 پیروی کرتے ہیں اس رسول کی جو نبی اوحیٰ  
 ہے۔ الخ

## اطاعت اور اتباع کے معانی کی تحقیق

کیونکہ ان تمام آیات میں جہاں نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیروی کا حکم ہے۔  
 اطاعت اور اتباع کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ بحث ختم کرنے سے  
 پہلے لفظ "اطاعت" ، اتباع کی تحقیق کر لینی چاہیے تاکہ کسی قسم کا لفظی نزاع بھی  
 کسی غلط فہمی کا باعث نہ بنے۔

عربی زبان میں اتباع کہتے ہیں کہ کسی شخص کے پیچھے پیچھے چلنا۔ چنانچہ ابن منظور نے  
 اپنی لغت کی شہرہ آفاق کتاب "لسان العرب" میں اس کی یوں تحقیق کی ہے۔

قَالَ الْفَرَّاءُ الْإِتِّبَاعُ  
 أَنْ يَسِيرَ الرَّجُلُ وَ  
 أَنْتَ تَسِيرُ وَرَأْتَهُ وَ  
 إِذَا قُلْتَ إِتَّبَعْتَهُ  
 فَكَأَنَّكَ قَفْوَتُهُ -  
 (لسان العرب)

فرا (لغت و نحو کے امام) نے کہا کہ  
 اتباع کا معنی یہ ہے کہ کوئی شخص آگے  
 آگے چل رہا ہو۔ اور تو اس کے پیچھے  
 پیچھے چلے اور اگر تو کہے کہ میں نے اس  
 کا اتباع کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ  
 تو اس کے پیچھے پیچھے اور اس کے

(فصل التاء من باب العين) نفس قدم پر چلا۔

صاحب تاج العروس نے اس مفہوم کو ذکر کرنے کے ساتھ چند ایک اور الفاظ بھی لکھے ہیں جن سے "اتباع" کا معنی اور زیادہ واضح اور روشن ہو جاتا ہے مثلاً:

الْتَّبِعُ وَكَذَلِكَ التُّبَّعُ  
 التُّبَّعُ اور التُّبَّعُ جن کا مادہ اشتقاق  
 كَسْرُ الظِّلِّ سُبَّيْ بِهِ  
 تبع ہے، کا معنی سایہ ہے، اور اس کی  
 لِأَنَّكَ يَتَّبِعُ الشَّمْسَ حَيْثُمَا  
 وجہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سورج کے پیچھے  
 زَالَتْ وَ مِنْ الْمُجَازِ التُّبَّعُ  
 پیچھے رہتا ہے، اور التبع مجازاً شہد کی  
 ضَرْبٌ مِنَ الْيَعَاقِبِ اعْظَمَهَا  
 مکھیوں کے سب سے اعلیٰ اور بہتر  
 وَ أَحْسَنَهَا -  
 کو بھی کہتے ہیں (کیونکہ شہد کی مکھیاں

تاج العروس فصل التاء من باب العين) اس کے پیچھے پیچھے رہتی ہیں۔

اور اس کا اصطلاحی معنی امام ابو الحسن اللامدی نے یوں بیان کیا ہے:

وَأَمَّا التُّبَّاعَةُ فَقَدْ تَكُونُ  
 متابعت کبھی کسی کے قول کی ہوتی ہے  
 فِي الْقَوْلِ وَقَدْ تَكُونُ فِي  
 اور کبھی کسی کے فعل و ترک کی۔ کسی کے  
 الْفِعْلِ وَ التَّرْكِ، فَاتِّبَاعُ  
 قول کے اتباع کا معنی تو یہ ہے کہ اپنے  
 الْقَوْلِ هُوَ امْتِنَالُهُ عَلَى  
 متبوع کی اس طرح فرمانبرداری کی جائے۔  
 الْوَجْهِ الَّذِي اقْتَضَاهُ  
 جس طرح اس کے قول کا تقاضا ہو اور  
 الْقَوْلُ، وَ اتِّبَاعُ فِي  
 کسی کے فعل کے اتباع کا معنی یہ ہے  
 الْفِعْلِ هُوَ التَّاسِي بِعَيْنِهِ  
 کہ اس کے اس فعل کو اس طرح کیا  
 وَ التَّاسِي أَنْ تَفْعَلَ مِثْلَ  
 جائے جس طرح وہ کرتا ہے اور اس لیے

فَعَلِهِ عَلَىٰ وَجْهِهِ مِنْ كَيْدِ كَرِهٍ كَرِهٍ .

أَجَلِهِ . (الاحكام في اصول الاحكام ۸۸، ۸۹)

اتباع کی لغوی اور اصطلاحی تحقیق سے یہ واضح ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کے متعلق جو عہدیں اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے اس کی تعمیل صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال پر اس طرح عمل کریں جیسا ان اقوال کا تقاضا اور منشا ہے اور حضور کے افعال کو اس طرح ادا کریں، جس طرح حضور نے ادا فرمائے اور اس لیے ادا کریں کیونکہ حضور پر نور نے ان افعال کو ادا فرمایا۔ اگر ہم حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر اس طرح عمل نہ کریں جیسے ان کا تقاضا ہے یا افعال رسالت کو اس طرح ادا نہ کریں جیسے حضور نے ادا کئے یا اس لیے ادا نہ کریں کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انہیں ادا کیا تو پھر اتباع نبوی سے جس کا ہمیں اللہ تعالیٰ نے بارہا حکم فرمایا ہے۔ ہم محسروم رہیں گے۔

اتباع کا معنی سمجھ لینے کے بعد اب ذرا لفظ "اطاعة" پر غور فرمائیے ؛ عربی زبان میں "اطاعة" کسی کے سامنے تسلیم خم کر دینے اور اس کے ہر حکم کی تعمیل کرنے کو کہتے ہیں، چنانچہ "لسان العرب" میں ہے ؛

وَفِي التَّهْدِيْبِ وَقَدْ طَاعَ لَهُ يَطُوعٌ إِذَا انْقَادَ لَهُ بِغَيْرِ الْفِي فَإِذَا مَضَىٰ لِأَمْرٍ

تہذیب (لغت کی ایک مستند کتاب) میں ہے کہ قد طاع له يطوع (جب کہ ثانی مجرد ہو) کا معنی ہے کسی کے سامنے تسلیم خم کر دینا اور جب

فَقَدْ أَطَاعَ . کوئی کسی کے حکم کی تعمیل کرے تو کہتے ہیں

( لسان العرب ) ( قد اطاعه ) یعنی اس نے اس کی

( فصل الطاء من باب العين ) اطاعت کی ۔

اور اطاعت کا اصطلاحی معنی امام ابو الحسن الآمدی نے یہ لکھا ہے :

وَمَنْ أَتَى بِمِثْلِ فِعْلٍ یعنی جب کوئی شخص کسی دوسرے کی عزت

الغَيْرِ عَلَى قَصْدٍ اعْظَاهُ و احترام کے باعث بعینہ اس کے فعل

فَهُوَ مُطِيعٌ لَهُ . کی طرح کوئی فعل کرے تو کہتے ہیں کہ یہ

( الاحکام فی اصول الاحکام ج ۱ ص ۹۱ طبع بیجی ) شخص فلاں شخص کا مطیع ہے ۔

تو گویا اہل عرب جن کی زبان میں قرآن کریم نازل ہوا " اطاعت " کا لفظ اس

وقت استعمال کرتے ہیں جب کہ کسی کے حکم کی تعمیل کی جائے اور اس کی عزت و احترام کی وجہ سے بعینہ ایسا کام کیا جائے جیسا اس کام کو وہ معزز و محترم شخص کرتا ہے۔

## اطاعت رسول کے حکم الہی کی تعمیل کی واحد صورت

اب جن آیات قرآنی میں اطاعت و اتباع رسول کی بار بار تاکید کی گئی ہے ان پر عمل تو فقط اسی صورت میں ہو گا کہ آپ ایسا کریں جیسے وہ رسول کرتا ہے یعنی جیسے وہ نازل پڑھتا ہے۔ اسی طرح انہیں اوقات پر انہی ہی رکعتیں ادا کریں، حج کی جو عملی تصویر وہ پیش کرتا ہے بعینہ اس کا چربہ تاریں۔ زکوٰۃ کے نصاب اس کی شرح وغیرہ کے جو اصول اس نے سکھائے ہیں بلا چون و چرا ان پر عمل پیرا رہیں۔ یلین دین، نکاح و طلاق، اخلاق و معاشرت کے جو ضوابط اس نے مقرر فرمائے ہیں ان پر بطیب خاطر کار بند رہیں۔ اگر

آپ ایسا کریں تو واقعی آپ نے اس کی متابعت کی اور اپنے رب کا حکم مانا، لیکن اگر آپ ایسا نہیں کرتے بلکہ اپنی فہم و دانست کے مطابق تعلیماتِ اسلامی کو سنتِ نبویؐ شکلوں میں پیش کر کے اپنے شوقِ تجدید پسندی کی تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں تو یہ بلاشبہ اتباعِ ہوس و اطاعتِ نفس تو ہوگی لیکن آپ اسے کسی تاویل کی قوت سے بھی اطاعتِ رسول اور اتباعِ سنت نہیں کہہ سکتے۔

اب ان حضرات کی خدمت میں مودبانہ التماس ہے جو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت کے منکر ہیں کہ اللہ تعالیٰ تو اپنی کلامِ پاک میں جسے وہ بھی قیامت تک کے لیے غیر تغیر پذیر مانتے ہیں اور اس کی مقرر کردہ جزئیات کو بھی غیر متبدل تسلیم کرتے ہیں، یہ فرماتا ہے:

گناہوں کی آمرزش چاہتے ہو تو میرے رسول کی اطاعت کرو۔  
 میری محبت کے دعویٰ دار ہو تو میرے رسول کی اطاعت کرو۔  
 جنت کے طلب کار ہو تو میرے رسول کی اطاعت کرو۔  
 میرے محبوب بننا چاہتے ہو تو میرے رسول کی اطاعت کرو۔  
 میرے دامنِ رحمت میں پناہ لینا چاہتے ہو تو میرے رسول کی اطاعت کرو۔  
 اور جس وقت تمہیں کسی خطہ زمین میں غلبہ و تمکین عطا فرماؤں اور تمہیں مجالسِ ستورساز میں وضعِ آئین و قوانین کے لیے اکٹھے ہو تو میرے رسول کی اطاعت کرو۔

ورنہ

قیامت کے دن ہونٹ کاٹو گے، اپنے تمہے دو سرکشی پر پچھاؤ گے، اپنے وجود تک سے بیزاری کا اظہار کرو گے۔ لیکن کوئی عذر نہیں سنا جائے گا۔



اور یہ حضرات کہتے ہیں کہ نہیں اب ہمیں خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اطاعت کی ضرورت نہیں۔ اطاعتِ رسول کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اب ہمارا حکم واجب التعمیل ہے اور ہماری سنت قابل تقلید۔

قرآن کے اصولوں اور اس کی تفصیلات کو اٹل اور دائمی کہنے والے اب ان آیات کے متعلق کیا کہتے ہیں، کیا یہ آیتیں ان کے نزدیک قرآن پاک کی نہیں؟ کیا یہ اللہ تعالیٰ کا نازل فرمایا ہوا کلام نہیں؟ ان کو وہ کیوں غیر متبدل نہیں سمجھتے؟ کیا یہ آیات محکمات منسوخ ہو چکی ہیں؟ یا ان کے معانی بدل چکے ہیں؟ ایک منقذ نے حرمتِ جہاد کا فتویٰ جاری کر کے امتِ مسطفویٰ کے قوسے عمل و نشاط کو مفلوج کرنا چاہا تھا تاہم اپنے محسن آقا کے سامنے اپنی نیاز مندی اور وفاداری کا ثبوت پیش کر سکے جس کے فکرِ فتنہ مارنے اس کے لیے نبوتِ تخلیق کی جس کے دجل و فریب سے اس کے باطل و تقویت ملی جس کے مکر و خداع نے اسے دامِ ہرنگِ زمین بخشا۔ اور جس کی بخشش ہائے بے اندازہ نے اسے مال و جاہ کے پجاریوں کا قاضی الحاجات بنا دیا۔

لیکن زمین و آسمان کا خدا شاہد ہے کہ وہ اپنی دسیسہ کاریوں میں ناکام رہا۔ امتِ محمدیہ کے دلوں سے جہاد کا جذبہ مٹ نہ سکا، راہِ حق میں مرنے کی تڑپ کم نہ ہوئی اسلام کا پرچم بلند رکھنے کے عزم میں ضعف نہ آیا۔ میدانِ سرفروشی میں نعرہٴ توحید بلند ہوتا رہا اور شہادتِ گاہِ عشق میں آقائے بدر و جنین کے غلام اپنا دل و جان نثارِ اکبر وئے جاناں کرتے ہی رہے اور جب تک چشمِ آفتاب روشن ہے وہ یہ نظارہ دکھتی رہے گی۔

اب یہ ملت کے نئے درد مند اور بہی خواہ صرف ایک چیز سے نہیں بلکہ اسلام کے ان تمام اصولوں کو ناقابل عمل ثابت کرنے کے لیے کوشاں ہیں، جن کا سرچشمہ ذاتِ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم قرآن کو مانتے ہیں اور ہمارا ایمان ہے کہ اس کے احکام میں رد و بدل ناممکن ہے، لیکن اگر وہی قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیارے رسول کی اطاعت و فرمانبرداری کرو اور صرف ایک بار نہیں بلکہ سینکڑوں بار کہتا ہے تو پروا نہیں کرتے اور یہی کہتے ہیں کہ نہیں اطاعت رسول کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اب ہم پر بلکہ ساری امت پر رسول کی اطاعت فرض نہیں رہی۔ سچ تو یہ ہے کہ دامن مصطفوی ہاتھ سے چھوٹنے کے بعد کوئی کتنا ہی چاہے کتنا ہو جو جہل اللہ (قرآن) کو نہیں تھام سکتا۔ جن کے لیے نفس پائے مصطفیٰ دلیلِ راہ نہیں ان کے لیے سر دوشِ غیب بھی بے معنی ہے۔

تجربہ شاہد ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ شرعی (سنتِ طبعی نہیں) میں جو اصول اور جو احکام مذکور ہیں، زمانے کے بدلتے ہوئے احوال اس کے دامنِ ابدیت کو نہیں چھو سکتے۔ شب و روز کا غیر منقطع تسلسل ان کی زندگی بخش اور شباب آفریں قوتوں کو مضحک نہیں کر سکتا۔ گردشِ لیل و نہار ان کی افادیت اور سلامت پر اثر انداز نہیں ہو سکتی ہے۔ ہمارا یقین محکم ہے کہ قرآن کریم کے دوسرے اصول و تفصیلات جس طرح ابدی اور دائمی ہیں، اسی طرح اطاعت رسالت کے متعلق جو حکم ہے وہ بھی قیامت تک کے لیے واجب العمل ہے۔





# قرآن کتابِ انقلاب



مقدمہ ضیاء القرآن سے





إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ

(ہم نے اس (قرآن) کو شبِ قدر میں نازل کیا)

رحمن ورحیم پروردگار نے اپنے بندوں کی راہنمائی اور ان کی حقیقی فلاح و کامرانی کے لیے جو صحیفہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ منیر پر نازل فرمایا اسے ہم قرآن مجید کے نام سے جانتے ہیں۔ کثرت کو تو یہ ایک کتاب ہے اور کتابیں ان گنت ہیں، بڑی ضخیم، بڑی ادنیٰ، بڑی دلاویز، لیکن اس کتاب کی شان ہی نرالی ہے۔ یہ صحیفہ بیک وقت کتاب بھی ہے اور علم و معرفت کا آفتاب جہاں تاب بھی، جس میں زندگی کی حرارت اور ہدایت کا نور دونوں یک جا ہیں۔ اس کا حسن و جمال قلب و نگاہ کو یکساں متاثر کرتا ہے۔ اس کی تجلیات سے دنیا و عقبی دونوں جگہاں رہتے ہیں۔ اس کا فیض ہر پیاسے کو اس کی پیاس کے مطابق سیراب کرتا ہے۔ اس کا پیغام اگر عقل و خرد کو لذتِ جستجو بخشتا ہے تو قلب و روح کو بھی شوق فراوان سے مالا مال کرتا ہے۔ اس کی تعلیم نے انسان کو خود شناس بھی بتایا اور خدا شناس بھی۔

یہ کتاب مقدس ہر لحاظ سے سراپا اعجاز ہے۔ اس کا ہر پہلو اتنا دلربا ہے کہ اپنے پڑھنے والے کو مسحور کر دیتا ہے۔ اسی لیے جب سے اس کا نزول ہوا اس نے اپنی فطری جاذبیت سے نوع انسانی کے ہر طبقہ سے سنجیدہ اور ذہین افراد کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ فاران کی وادیوں سے قرآن کا پشتمہ فیض کیا پھوٹا کہ اس سے علوم و فنون کے دریا بہ نکلے جنہوں نے جزیرہ عرب کے پیاسے رگزاروں کو سیراب کیا اور انہیں حکمت و دانش کی جلوہ گاہ بنا دیا۔ اس ایک کتاب مجید نے جہاں پہلے کو حیاتِ نو بخشی وہاں اس نے بے شمار جدید علوم کی تشکیل کا سامان فراہم کر دیا۔ علوم تفسیر، لغت و فقہ اللغت، فقہ و اصول فقہ، معانی و بلاغت و بدیع، صرف و نحو، قرأت و تجوید، وعظ و خطابت، قصص و اخبار، امثال و حکایات، ان کے علاوہ اور کئی علوم ہیں جنہوں نے قرآن کریم کے سایہ عاطفت میں جنم لیا اور اسی کے آغوشِ تربیت میں پروان چڑھے، اس طرح قرآن حکیم کے فیض سے دنیا کی سب سے زیادہ جاہل قوم علم و حکمت کے عظیم خزانوں کی مالک بلکہ خالق بن گئی۔

## قرآن کا اہم پہلو

ہر عہد میں ملتِ اسلامیہ کے ذہین و فطین افراد نے چوروشن دماغ بھی تھے اور روشن ضمیر بھی، اپنی استطاعت، ذاتی صلاحیت و استعداد اور اپنے مخصوص ماحول کی ضروریات اور تقاضوں کے پیش نظر قرآن مجید کے ان خادمِ علوم میں سے کسی کو اپنے لیے منتخب کیا اور خدمتِ گزاری کا حق ادا کر دیا اور اپنے اپنے موضوع پر ایسی زندہ جاوید تالیفات اور تصنیفات کا گراں بہا ذخیرہ چھوڑا جن کی روشنی سے

دنیا بھر کے کتب خانے اور دانش گاہ میں آج بھی چمک رہی ہیں، لیکن اس ناچیز کے نزدیک قرآن کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ وہ کتاب ہدایت ہے، اس کے نازل فرمانے والے نے بارہا اس کا تعارف اس قسم کے کلمات سے کرایا ہے:

هَذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَنُورٌ عَظِيمٌ لِلْمُسْتَقِيمِينَ ط

آج ہمیں قرآن مجید کے اسی پہلو پر زیادہ توجہ دینی چاہیے، لیکن شوخی تفسیر ملاحظہ ہو، آج قرآن کا یہی پہلو متروک اور مہجور ہے۔

قرآن حکیم کا مقصد اولین انسان کی اصلاح ہے، تربیتِ پیہم سے اس کے نفسِ امارہ کو نفسِ مطمئنہ بنانا ہے۔ ہوا و ہوس کے غبار سے آئینہ دل کو صاف کر کے اسے انور ربانی کی جلوہ گاہ بنانا ہے۔ انانیت و غرور، تمرد و سرکشی کی بیخ کنی کر کے انسان کو اپنے مالکِ حقیقی کی اطاعت و انقیاد کا نور کرنا ہے۔ یہی کام سب سے اہم بھی ہے اور سب سے مشکل اور کٹھن بھی۔ قرآن مجید نے اسی اہم ترین اور مشکل ترین کام کو سرانجام دیا اور اس حسن و خوبی سے کہ دنیا کا نقشہ بدل گیا۔

## کتابِ الفتلاب

یہ صرف باتیں ہی باتیں نہیں ہیں بلکہ ایک حقیقت ہے، زندگی جاوید حقیقت اور ناقابل انکار حقیقت، کہ قرآن کی ہدایت سے بگڑا ہوا انسان سدھرا اور سدھر کر ساری کائنات کے لیے آیتِ رحمت بن گیا۔ غور فرمائیے، حکمتِ الہی نے نزولِ قرآن کے لیے جس سرزمین کو منتخب کیا، وہ عرب کا خلتہ تھا، وہاں بسنے والے لوگ شکل و صورت میں انسان تو تھے، لیکن انسانیت سے ان کا دور کا واسطہ بھی نہ تھا، کفر و



شُرک، فسق و فجور، ظلم و ستم، وحشت و بربریت، بے مالت اور اُجڑ پن، اس پر فقر و افلاس مستزاد، غرضیکہ کون سا عیب تھا یا کون سی گمراہی تھی جو ان میں بدرجہ اتم موجود نہ تھی اور دنیا نے دیکھا کہ قرآن حکیم کی تاثیر اور صاحب قرآن کی برکت سے وہ کیا بن گئے! اگر قرآن عرب کے اُجڑ بدوؤں کو آدم و بنی آدم کے لیے باعثِ عز و شرف بنا سکتا ہے، اگر ان جاہلوں کو جو ابجد خواں بھی نہ تھے، بزمِ علم و دانش کا صدر نشین بنا سکتا ہے۔ اگر حرمِ کعبہ میں ۳۶۰ بتوں کی پوجا کرنے والی قوم کے دل میں معرفتِ الہی کی شمع فروزاں کر سکتا ہے، تو ہمارے صنم کدہ تصورات کے لات و پہل کو کیوں ریزہ ریزہ نہیں کر سکتا۔ ہمارے ظلمت خانہ حیات کو اس کی کرنیں کیوں کر منور نہیں کر سکتیں۔ بخدا ہو سکتا ہے، سب کچھ ہو سکتا ہے بشرطیکہ ہم قرآن کی ہدایت کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوں اور ہمارا کاروانِ حیات اس شاہراہِ ہدایت پر گامزن ہو جو قرآن نے ہمارے لیے تجویز کی ہے۔

## قرآن کی قیادت قبول کرو

اے درمائدہ راہ قوم! قرآن تمہیں عظمت و عزت کی بلندیوں کی طرف آج بھی لے جا سکتا ہے بشرطیکہ تم اس کی قیادت قبول کر لو۔ اسے اپنی قسمت برگشتہ پر آہ و فغان کرنے والے نوجوانوں دنیا کی امامت تمہاری متاعِ گم گشتہ ہے تمہیں واپس مل سکتی ہے۔ اگر تم میں اس کی واپسی کی تڑپ ہو تو قرآن تمہیں واپس دلا سکتا ہے، اگر تم اس کا حکم ماننے کے لیے تیار ہو۔

زندگی کی یہ ساری چہل پہل تقسیمِ کار کے باعث ہے۔ ایک ہی ملت کے

مختلف افراد مختلف کام سرانجام دیتے ہیں کسی کے ہاتھ میں حکمرانی کی باگ ڈور ہے، کوئی مجلس مشاورت کا رکن رکین ہے۔ کوئی تجارت و صنعت کو چارچاند لگا رہا ہے، کوئی شکم زمین سے رزق کے سرمہر خزانے بحال کران کے ڈھیر لگا رہا ہے، کوئی وعظ و نصیحت کے منبر پر جلوہ نما ہے، کوئی تعلیم و تدریس کی مسند کو رونق بخشنے ہے اور کوئی سجادہ فقر و درویشی پر تشریف فرما ہے۔ قوم کو مجموعی طور پر اصلاح یافتہ اسی وقت کہا جاسکتا ہے جب کہ اس کے تمام عناصر حق کا دامن مضبوطی سے پکڑے ہوتے ہوں اور اپنے اپنے دائرہ عمل میں قرآن کی ہدایت پر کاربند ہوں اور اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی میں پوری دیانتداری سے مصروف کار ہوں۔ ان عناصر کا باہمی تعلق اتنا گہرا ہوتا ہے اگر ایک عنصر بھی جادہ حق سے برگشتہ ہو جائے تو دوسرے عناصر اس سے متاثر ہوتے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس لیے قرآن حکیم نے ہر ایک کو اپنی خصوصی توجہ کا مستحق سمجھا ہے اور ہر گروہ میں راہ پانے والی خرابیوں کی نشاندہی کی ہے اور انھیں اس کے عبرتناک انجام سے آگاہ کیا ہے۔

ہم اکثر بگڑی ہوئی قوموں کے حالات اور ان کے عبرتناک انجام کے متعلق قرآن میں پڑھتے ہیں اور ایک لمحہ توقف کئے بغیر آگے نکل جاتے ہیں۔ ہم یہ جہت بہت کم گوارا کرتے ہیں کہ اپنے اعمال کا موازنہ برباد شدہ قوموں کے اعمال سے کریں اور یہ سوچیں کہ کہیں ہم بھی انھیں نافرمانیوں کا شکار تو نہیں اور اگر خدا نخواستہ میں تو اپنے انجام کی ہولناکیوں سے نافل کیوں میں؟ کیا مکافات عمل کا قانون قدرت کا اہل قانون نہیں؟ کیا ہم نے یہ نہیں پڑھا؟ کہ

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا۔

## مکمل ضابطہ حیات

قرآن کریم نے اپنے ماننے والوں کو ایک واضح اور مکمل ضابطہ حیات (شرعیات) عطا کیا ہے اور یہ ضابطہ اتنا ہی وسیع ہے جتنی زندگی اپنے لوگوں کے ساتھ وسیع ہے بلکہ بلا مبالغہ اس سے بھی وسیع تر۔ انسان کیا ہے؟ اس کا تعلق اپنے خالق کے ساتھ اور اس کی مخلوق سے کیا ہونا چاہیے؟ اگر وہ حاکم ہے تو اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ اگر وہ رعایا ہے تو اس کے فرائض کی نوعیت کیا ہے؟ اگر وہ دولت مند ہے، تو اس کا طرز عمل کیا ہو اور اگر وہ فقیر و محتاج ہے تو کس طرح باوقار زندگی بسر کر سکتا ہے؟ قرآن نے جو شرعیات کا مدہ ہمیں دی ہے اس میں ان سوالات کا مکمل جواب موجود ہے۔ اسی لیے عبادات، سیاسیات، معاشیات، نظام اخلاق وغیرہ تمام امور کو شرعیات نے اپنے دامن میں سمیٹا ہوا ہے۔

## قرآن فہمی

فرقان حمید عربی زبان میں نازل ہوا عربی کا اپنا ادب ہے فصاحت و بلاغت کا اپنا معیار ہے، اس کے اپنے مجازات، استعارات اور امثال ہیں یہ مفردات کے اشتقاق اور جملوں کی ترتیب کے انگ قواعد ہیں۔ اس کا دامن الفاظ کی کثرت سے معمور ہے اور قواعد اشتقاق نے تو اس میں اتنی وسعت پیدا کر دی ہے کہ دنیا کی کوئی ترقی یافتہ زبان بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

اس مقدس کتاب کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم عربی زبان سے

رہلے پیدا کریں۔ اس کے قواعد و ضوابط سے اچھی طرح واقفیت بہم پہنچائیں۔ اس کے ادب اور اسلوب انشار کی خصوصیات کو سمجھیں تاکہ کلمات کے اگلیوں میں حقیقت کی جو شراب ظہور چھلک رہی ہے اس سے لطف اندوز ہو سکیں۔

## جمع و تدوین

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے فاضل اور فن تحریر میں ماہر صحابہ کرام کی ایک جماعت کو قرآن کریم کی کتابت کے لیے متعین فرمایا ہوا تھا۔ جنہیں کاتبان وحی کہا جاتا تھا۔ جب بھی کوئی آیت یا مجموعہ آیات یا سورہ نازل ہوتی تو ارشاد نبوی کے مطابق کاتبان وحی اسے ضبط تحریر میں لے آتے۔ حضور پر آیت کے متعلق یہ تصریح فرماتے کہ یہ آیت فلاں سورت میں فلاں مقام پر لکھی جائے اس طرح جوں جوں قرآن نازل ہوتا رہا۔ رسول مکرم کی نگرانی میں حضور کی ہدایت کے مطابق تحریر کیا جاتا رہا۔ لیکن یہ تحریریں کتابی شکل میں مدون نہیں تھیں، بلکہ کاغذوں، پٹی کے ٹکڑوں، کھجور کے تھیلوں، پتھر کی ستوں وغیرہ اشیاء پر لکھی جاتی رہیں۔

حفاظت قرآن کا سب سے اہم ذریعہ حفظ قرآن مجید تھا۔ حضور اپنے صحابہ کو اسے یاد کرنے کا شوق دلاتے۔ قیامت کے روز حفاظ قرآن کو مقامات رفیعہ اور مدارج سنیتہ پر فائز ہونے کی بشارتیں دیتے۔ نماز میں بھی اس کی تلاوت کو فرض کر دیا گیا۔ اس لیے ہر مسلمان کے لیے قرآن کا کچھ نہ کچھ حصہ حفظ کرنا ضروری ہو گیا۔ اور کئی صحابہ ایسے تھے جنہیں تمام قرآن حکیم یاد تھا۔

رحمت عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے رفیق اعلیٰ سے جاننے کے بعد جب

ارتداد کا فتنہ اٹھا اور حضرت صدیق اکبر نے اس کو کچلنے کے لیے صحابہ کرام کے لشکر روانہ کئے تو میلہ کذاب سے پیامہ کے مقام پر مسلمانوں کی جو خوریر جنگ ہوئی اس میں اگرچہ میلہ اور اس کی جھوٹی نبوت کا تو خاتمہ ہو گیا، لیکن ختم رسالت کے خدا کاروں کا بھی بے انداز جانی نقصان ہوا، جس میں سات سو کے قریب صرف حفاظ قرآن نے جام شہادت نوش کیا۔ (القرطبی)

اس سانحہ نے حضرت عمر فاروق اعظم کو بہت پریشان کر دیا۔ بارگاہ خلافت میں حاضر ہو کر انھوں نے عرض کی کہ اے صدیق باطل سے جنگوں کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، وہ ختم ہونا نظر نہیں آتا۔ اگر حفاظ قرآن کے قتل کی یہی رفتار رہی تو مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں ہم اللہ تعالیٰ کی اس کتاب سے محروم نہ ہو جائیں اس لیے مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ اسے کتابی شکل میں یکجا جمع کر دیا جائے۔

حضرت صدیق نے کہا: اے عمر! میں وہ کام کرنے کے لیے تیار نہیں جسے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نہیں کیا۔ لیکن حضرت عمر کے پیم اصرار کے باعث آپ کو بھی اس کام کی اہمیت کا احساس ہو گیا۔ آپ نے حضرت زید بن ثابت کو طلب کیا اور انھیں قرآن کریم کو یکجا جمع کرنے کی ہدایت فرمائی۔

حضرت زید کا قول ہے کہ حضرت ابو بکرؓ مجھے کسی پہاڑ کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ لے جانے کا حکم دیتے تو مجھ پر ایسا شاق نہ گزرتا جتنی اس حکم کی تعمیل شاق گزری پہلے آپ نے بھی ایسا کام کرنے سے انکار کیا جو عہد رسالت میں نہیں کیا گیا تھا، لیکن خلیفہ اول کی فمائش سے انھیں بھی الشراح صدر حاصل ہو گیا اور اس کام کی اہمیت کا انھیں بھی احساس ہو گیا۔ بڑی جانفشانی، محبت، تجسس اور جستجو سے

قرآن حکیم کا پہلا نسخہ مدون کیا گیا۔ پنا پچھ حضرت صدیق اکبر کے عہد خلافت میں یہ نسخہ آپ کے پاس رہا۔ آپ کے بعد حضرت فاروق اعظم کے پاس رہا۔ اور ان کے بعد ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس محفوظ رکھا گیا اور ضرورت کے وقت ان کی طرف رجوع کیا جاتا۔

یہ امر مخفی نہیں کہ قرآن کے اولین مخاطب اہل عرب تھے جن کی ماوری زبان عربی تھی۔ اگرچہ سب قبائل کی مشترک زبان عربی ہی تھی لیکن ان کے لہجوں میں تلفظ الفاظ میں اور بعض اعراب میں یقیناً تفاوت تھا۔ یہ صورت حال اس قدر زبان میں ہوتی ہے جس علاقہ میں اردو بولی جاتی ہے۔ وہاں کے ہر ضلع بلکہ ہر تحصیل کے لوگوں کے لب و لہجہ میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔ ابتداء میں مختلف قبائل کی سہولت کے پیش نظر ان کے مخصوص انداز کے مطابق قرأت قرآن کی اجازت دے دی گئی تھی، کیونکہ سب اہل زبان تھے۔ اس لیے ایسے تفاوت سے کوئی غلط فہمی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ لیکن جب فتوحات کا سلسلہ وسیع ہوا اور دوسرے ممالک بھی قلم و اسلامی کا حصہ بن گئے اور وہاں کے باشندوں نے اسلام قبول کیا اور قرآن مجید پڑھنا شروع کیا تو ہر ایک نے قرآن کے فقط اسی لہجہ اور تلفظ کو صحیح یقین کیا جو اس کے استاد نے سکھایا تھا۔ اس طرح مختلف اساتذہ کے شاگردان اختلافات کے باعث ایک دوسرے کی تغلیط کرنے لگ گئے اور فتنہ و فساد کی آگ آہستہ آہستہ سلگنے لگی۔ اسی قسم کا ایک واقعہ حضرت عثمان کی خلافت کے زمانہ میں حضرت خدیفہ کے سامنے پیش آیا جس نے آپ کو حیران و سر اسیما کر دیا۔

حضرت خدیفہ غزوہ آرمینیا میں شریک تھے۔ عراق اور شام کے نو مسلم بھی اس

جنگ میں شرکت کے لیے آئے ہوتے تھے۔ ہر ایک نے اپنے معلم کی سکھائی ہوئی قرأت کے مطابق قرآن مجید پڑھنا شروع کیا۔ جس سے باہمی نزاع پیدا ہو گیا۔ ہر ایک نے دوسرے کی تغلیط کی اور اسے محرف قرآن کہا۔ حضرت حذیفہ نے جب یہ ماجرا اپنی آنکھوں سے دیکھا تو انھیں سخت فکر و امن گیر ہوئی۔ چنانچہ آپ مدینہ منورہ واپس آئے اور اپنے گھر جانے سے پہلے امیر المؤمنین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی:

أَدْرِيكَ هَذِهِ الْقُرْآنَةُ قَبْلَ  
أَنْ تَهْلِكَ - اس امت کی چارہ سازی کیجئے اس سے  
بیشتر کہ یہ ہلاک ہو جائے۔

اور پھر سارا ماجرا کہ سنایا اور کہا:

إِنِّي أَخْشَى عَلَيْهِمْ أَنْ يَخْتَلِفُوا  
فِي كِتَابِهِمْ كَمَا اخْتَلَفَ الْيَهُودُ  
وَالنَّصَارَى - یعنی مجھے ان کے بارے میں سخت اندیشہ  
ہے کہ کہیں یہ بھی یہود و نصاریٰ کی طرح  
اپنی کتاب میں اختلاف نہ کرنے لگیں۔

قرآن کریم کا نزول لغت قریش کے مطابق ہوا تھا۔ محض آسانی اور سہولت کے پیش نظر دوسرے قبائل کو اپنے اپنے لب و لہجہ سے اس کی تلاوت کی اجازت دی گئی تھی، لیکن اب یہ رخصت ایک عظیم فتنہ کا باعث بن رہی تھی۔ ان حالات میں اس کو برقرار رکھنا سراسر نقصان دہ اور مضر تھا، چنانچہ صحابہ کرام کے مشورے سے حضرت عثمان نے زید بن ثابت کو حکم دیا کہ قرآن کریم کا ایک نسخہ صرف لغت قریش کے مطابق لکھیں۔ چنانچہ وہ تیار کر چکے تو اس کی متعدد نقلیں تیار کر کے مختلف دیار و امصار میں بھیجی گئیں اور لوگوں کو اس کی پابندی کا حکم دیا گیا اور دوسرے تمام نسخوں کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اس طرح حضرت عثمان کی سعی و کوشش سے ایک مہلک ترین فتنہ

کاستر باب ہو گیا۔ امت اسلامیہ حضرت عثمان کے اس احسان کا شکریہ ادا نہیں کر سکتی۔ اسی وجہ سے آپ کو جامع آیات القرآن کے معزز لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لب و لہجہ کے تفاوت اور قرأتوں کے اختلاف کی نوعیت بیان کر دی جائے تاکہ اس کے متعلق کوئی دوسرے دل میں نہ رہ جائے، چند مثالیں ذکر کر دینے سے ان امور کی حقیقت واضح ہو جائے گی اور پتہ چل جائے گا کہ یہ اختلاف معمولی قسم کا تھا۔ مثلاً قریش (حتیٰ) (جب تک) کہتے اور بنی ہذیل اور بنی ثقیف اس کا لفظ ”اتی“ کیا کرتے بنی اسد مضارع میں حروف اتین کو کسور پڑھا کرتے، جیسے تَعْلَمُونَ۔ اور قریش کی لغت میں حروف اتین مفتوح ہیں جیسے تَعْلَمُونَ مصر میں اب بھی عام لوگ اپنی گفتگو میں حروف اتین کو کسرہ دیا کرتے ہیں۔ قریش کی لغت میں مَاءٌ غَيْرَ يَأْسُنَ ہے لیکن بنی تمیم اسے ما غیر یأسن پڑھتے۔

ان امثلہ سے معلوم ہو گیا کہ یہ اختلاف کس نوعیت کا تھا، لیکن قرآن کا تقدس اور اس کی عظمت اتنے سے اختلاف کی بھی متحمل نہیں، اس لیے اس کو بھی ممنوع قرار دے دیا گیا۔ چنانچہ وہی قرآن جو عرشِ عظیم کے رب نے اپنے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمایا تھا۔ اور جس کو حضرت ابوبکر صدیقؓ اور ان کے بعد حضرت عثمان ذوالنورین نے خالص قریشی لغت کے مطابق جس میں اس کا نزول ہوا تھا، ایک صحیفہ مدون فرمایا وہی قرآن جو ان جوں کا توں بغیر کسی تحریف کے بغیر کسی معمولی تغیر کے بغیر کسی ادنیٰ رد و بدل کے اب تک محفوظ ہمارے پاس موجود ہے، اور قیامت تک موجود رہے گا اور اس کا اعتراف دوست دشمن سب کو ہے۔ چنانچہ



انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا صفحہ ۲۸۰، جلد ۱۳ میں بھی یہ تصریح موجود ہے :

THIS RECENSION OF UTHMAN THUS BECAME THE ONLY STANDARD TEXT FOR THE WHOLE MUSLIM WORLD UP TO THE PRESENT DAY.

## ترتیب قرآن

یہ تو واضح ہے کہ قرآن کریم کی سورتوں اور سورتوں کی آیات کی موجودہ ترتیب وہ نہیں جس ترتیب سے اس کا نزول ہوا۔ پھر اس موجودہ ترتیب کا ماخذ کیا ہے؟ اور کس نے یہ ترتیب دی ہے؟ اکثر عیسائی مستشرقین نے اس پر بڑی لے دے کی ہے۔ اور یہ ثابت کرنے کے لیے بڑے جتن کئے ہیں کہ موجودہ ترتیب زمانہ نبوت میں نہیں دی گئی بلکہ اس کے بعد صحابہؓ نے اس کو یوں مرتب کیا ہے۔ ایسے حقائق کی روشنی میں ان کے اس مفروضہ کا جائزہ لیں۔

ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق قرآن کی سورتوں اور سورتوں کی آیتوں کو مرتب فرمایا اور یہ موجودہ ترتیب وہی ہے اس کے لیے متعدد دلائل ہیں جن میں سے چند ایک اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے ہدیہ ناظرین ہیں :

۱۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

إِنَّا عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ  
فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ  
یعنی قرآن کو جمع کرنا اور اسے پڑھنا ہمارا  
ذمہ ہے اور جب ہم پڑھ چکیں تو آپ اس  
پڑھے ہوئے کی اتباع کریں۔

(۷۵۰، ۱۸، ۱۷)

اب آپ سوچیں کہ کیا ترتیب کے بغیر جمع قرآن کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ کیا کسی مخصوص ترتیب کے بغیر اس کی تلاوت ممکن ہے؟ جب جمع کرنے اور پڑھنے کے لیے اس کا مرتب ہونا ضروری ہے تو معلوم ہوا کہ جس ذات پاک کے ذمہ اس کا جمع کرنا اور پڑھنا ہے، اسی نے اس کو مرتب فرمایا ہے۔

(ب) تاریخی لحاظ سے آپ سوچئے، عہد رسالت میں صحابہ کرام کو قرآن کریم یاد تھا۔ بعض کو کچھ سورتیں اور بعض کو سارا قرآن صحابہ کرام نماز میں اور اس کے باہر اس کی تلاوت کیا کرتے حضور رحمت عالمیاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم خود بھی نماز تہجد میں دوسری نمازوں میں، عام خطبات میں کثرت سے قرآن کریم کی قرأت فرماتے اور حضور کی قرأت و ترتیب صحابہ کی قرأت و ترتیب میں قطعاً سو فرق نہیں ہوا کرتا تھا۔ یہ وہ امور ہیں جن سے کوئی بھی انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

اب آپ خود فیصلہ کیجئے کہ اگر حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسے حکم الہی سے مرتب نہیں فرمایا تھا تو صحابہ کیسے اس کو حفظ کر سکتے تھے؟ کیسے اس کی تلاوت ان کے لیے ممکن تھی، اور اگر حضور کی مقررہ ترتیب نہیں تھی، تو ہر ایک کی قرأت دوسرے سے مختلف ہونی چاہیے تھی، حالانکہ ایسا نہیں تھا، تو ثابت ہوا کہ قرآن کریم عہد رسالت میں مکمل طور پر مرتب فرمادیا گیا تھا اور تمام صحابہ اسی کی پیروی اور پابندی کیا کرتے تھے، اس لیے عیسائی متعصبین کا یہ شور و غوغا قطعاً کوئی وزن نہیں رکھتا۔  
ولقد الحجۃ بالغة۔

آداب تلاوت

قرآن حکیم کتاب ہدایت ہے۔ اس کی تلاوت کا مقصد دل بہلانا اور وقت گزارنا

نہیں بلکہ اس کا مقصد اولین تعمیر انسانیت اور تشکیل سیرت ہے۔ اور یہ مقصد تب ہی حاصل ہو سکتا ہے جب پڑھنے والے کو اس کتاب عزیز سے دلی لگاؤ اور طبعی ربط پیدا ہو جائے۔ اس لگاؤ اور ربط کو پیدا کرنے کے لیے حکما اسلام نے چند آداب اور شرائط بتاتے ہیں۔ جن کی پابندی کرنے سے قرآن کریم سے فیض یاب ہونے کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ میں انھیں قارئین کرام کے فائدے کے لیے العارف الکامل حجۃ الاسلام الامام محمد بن محمد بن محمد بن احمد الغزالی کی شہر آفاق کتاب اجماع علوم الدین سے استفادہ کرتے ہوئے مختصراً قلمبند کرتا ہوں۔

① قاری کے لیے ضروری ہے کہ با وضو ہو۔ قبلہ رو کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر بڑے ادب و سکون کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کرے۔

② مقدارِ قرأت: بعض لوگ دن رات میں ایک مرتبہ، بعض دو مرتبہ اور بعض تین مرتبہ بھی قرآن ختم کرتے ہیں۔ اور بعض ایک ماہ میں ایک مرتبہ اور بعض ہفتہ میں ایک بار، کیونکہ قرأت قرآن کا مدعا اس کو صحیح طور پر سمجھنا اور اس سے ہدایت حاصل کرنا ہے۔ اور ایک دن میں اسے ختم کرنے سے یہ مدعا پورا نہیں ہوتا۔ اس لیے اس کو مکروہ کہا گیا۔ اَلْخَتْمُ فِي يَوْمٍ وَكَيْلَةٌ قَدْ كَرِهَتْ جَمَاعَةٌ (اجماع) حضور کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ فِي يَوْمٍ لَمْ يَفْقَهُهُ يَفْقَهُهُ يَوْمًا آخَرَ۔ یعنی جس نے تین دن سے کم وقت میں قرآن ختم کیا، اس نے اسے سمجھا ہی نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو ارشاد نبوی یہی تھا کہ وہ ہفتہ میں قرآنِ نختم کیا کریں پچنانچہ حضرات عثمان، زید بن ثابت، ابن مسعود اور ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا یہی معمول تھا۔

③ ترتیل؛ ٹھہر ٹھہر کر آہستہ آہستہ پڑھنا، کیونکہ ایسی صورت میں انسان آیات میں غور کر سکتا ہے۔

④ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے :  
 أَتْلُوا الْقُرْآنَ وَابْكُوا      قرآنِ کریم پڑھو اور روؤ اور اگر رونانا  
 فَإِنَّ لَكُمْ تَبْكُوا أَفْتَبَا كُوا۔      آئے تو بہت کھف رونے کی کوشش کرو۔

کیونکہ گریہ و رازی سے ہی انسان رحمتِ الہی کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہے۔ جو آیت پڑھے، اس کا حق ادا کرے یعنی آیت تسبیح و تکبیر پڑھے تو خود بھی سُبْحَانَ اللَّهِ اور اللَّهُ أَكْبَرُ کہے، اگر دعا و استغفار کی آیت تلاوت کرے، تو اپنے لیے بھی دعا مانگے اور مغفرت طلب کرے۔ اگر کسی آیت میں انعاماتِ الہیہ کا ذکر ہے، تو ان کے لیے دستِ سوال و راز کرے۔ اگر کہیں عذاب و مصیبت کا تذکرہ آئے تو اپنے لیے پناہ مانگے۔ اگر آیت سجدہ پڑھے یا سنے تو سجدہ کرے غرضیکہ جس مضمون کی آیت پڑھے اسی قسم کے تاثر کا اظہار کرے۔

⑤ تلاوت شروع کرتے وقت یہ پڑھے :  
 أَعُوذُ بِاللَّهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ  
 رَبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ وَأَعُوذُ بِكَ

دب ان یخضرون -

اور جب تلاوت ختم کرنے لگے تو یہ کہے :

صَدَقَ اللهُ تَعَالَى وَبَلَغَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
اللَّهُمَّ أَنْفَعْنَا بِهِ وَبَارِكْ اللهُ لَنَا فِيهِ - الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ  
الْعَالَمِينَ وَاسْتَغْفِرُ اللهُ الْحَيَّ الْقَيُّومَ

⑥ پڑھتے وقت اتنا آواز بلند کرے کہ کم از کم خود سن سکے۔ اس سے زیادہ بلند آواز سے قرأت اگر کسی دوسرے شخص کے لیے تکلیف دہ نہ ہو تو محبوب ہے ورنہ مکروہ۔

⑦ حضور کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے :  
زَيِّنُوا الْقُرْآنَ بِأَصْوَاتِكُمْ خوش آوازی سے قرآن کو مزین و آراستہ کرو۔

دوسری حدیث شریف میں ہے :

قَالَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
لَيْسَ مِنْكُمْ لَمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ  
یعنی حضور نے فرمایا جو قرآن کو خوش الحانی سے نہیں پڑھا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔  
اس لیے تکلف و تصنع کے بغیر جتنا ممکن ہو خوش الحانی سے پڑھے تاکہ خود بھی اور سننے والے بھی اس کی قرأت سے لطف اندوز ہوں۔

ان کے علاوہ چند باطنی آداب و شرائط ہیں جن کا التزام باعث ہزار برکت و سعادت ہے :

۱۔ پڑھنے والے کا دل و دماغ اس مقدس کتاب کی عظمت اور اس کے نازل فرمانے

والے کی عظمت سے لبریز ہو۔ اسے یہ احساس ہو کہ یہ کتاب کوئی معمولی کتاب نہیں ہے۔ اس کو انسان نے تصنیف نہیں کیا بلکہ یہ خالق جن و بشر، مالک بحر و بر، رب السموات والارض احکم الحاکمین کا کلام معجز، نظام ہے، جو اس نے ازراہ غایت بندہ پروری اور اپنے بندوں کی ہدایت پذیرمی کے لیے اپنے محبوب و برگزیدہ بندے خاتم الانبیاء و المرسلین، رحمۃ للعالمین محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے قلب منیر پر نازل فرمایا ہے۔

ب : دل کو تمام وسوسوں اور اندیشوں سے پاک کر کے بڑی کیسوئی اور حضور قلب سے اس کی تلاوت میں مشغول ہو۔

ج : فکر و تدبر کی جملہ صلاحیتوں کو اس کے اسرار و رموز تک رسائی حاصل کرنے کے لیے بروئے کار لاتے تاکہ رحمت الہی اس کے شوق و طلب کی بقیاریوں پر رحم فرماتے ہوئے اس کے لیے فیوض قرآنی کے دروازے کھول دے۔

د : نفس اور نفس کی پیدا کردہ خواہشیں اور مصلحتیں، غلطی اور جہالت سے جگہ پڑے ہوئے نظریات اور اعتقادات، ماحول کی مجبوریاں اور گناہوں کی نحوستیں، بسا اوقات قرآن فہمی کی راہ میں پہاڑ بن کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ قرآن کے ہیات بخش چشمہ تک پہنچنے والے کے لیے ضروری ہے کہ ایک ایک رکاوٹ کو پیوند ناک کرے اور مردانہ وار آگے بڑھتا چلا جائے، قرآن کے سحابِ کرم سے عرفان کے جو قطرے اس کی کشتِ ایمان پر ٹپکنے لگیں ان کی راہ میں کسی چیز کو حائل نہ ہونے دے۔

لا : قرآن فہمی کے لیے صرف اپنی فہم و ذکاوت اور علم و دانش پر بھروسہ نہ کرے بلکہ اللہ تعالیٰ کی توفیق و تائید پر اعتماد کرے اور قدم قدم پر اس کی راہنمائی اور شگبری

کے لیے بصد عجز و نیاز التَّجَا کرتا ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا

وَمَا يَتَذَكَّرُ إِلَّا مَنْ

ہی (اس صحیفہ رشد و ہدایت سے) نصیحت

بُنَيْبٌ -

قبول کرتا ہے۔

(المومن)

اپنے رب کی طرف مائل ہونے والے

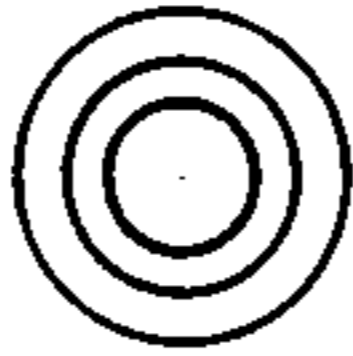
تَبْصِرَةٌ وَ ذِكْرٍ لِّكُلِّ

ہر بندے کے لیے یہ کتاب بصیرت افروز

عَبْدٍ مُّبِينٍ

اور نصیحت ہے۔

(ق)



# اسلام دینِ فطرت



۴ جولائی ۱۹۸۰ء کو برمنگھم (انگلینڈ) میں ہونے  
والی عظیم الشان سنی کانفرنس سے حضرت  
ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ صاحب الازہری  
کا تاریخی خطاب







الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد  
المرسلين وعلى آله واصحابه اجمعين. قال الله تعالى  
وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى  
النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا

آج جب کہ علم نے اسرارِ کائنات کو بے نقاب کر دیا ہے، سائنس کروں اور  
فضاؤں کو مسخر کرنے کے بعد خلاؤں کی تسخیر کی مہم سر کر چکی ہے، جب عقل کی جولانیاں  
کائنات کی وسعتوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے کی کوشش کر رہی ہیں، جب  
ہر ترقی یافتہ ملک نے فہم و دانش کی قندیلیں روشن کر کے اپنی زندگی کی اندھیری  
رات میں چراغاں کر دیا ہے، جب دنیا کے دانشور اپنی نکتہ سنجیوں کے باعث حیات  
انسانی کے مختلف شعبوں میں اپنی فتح کے علم کاڑھ چکے ہیں، ہم مسلمان کیوں مصر ہیں کہ  
ہم چودہ صدیاں پرانے دینِ اسلام کو ضرور نافذ کریں گے۔ ہم اپنی ساری زندگی کو  
نظامِ مصطفیٰ علیہ الطیب التیۃ و اجمل الثناء کے سانچے میں ہی ڈھالیں گے۔  
کہیں ہماری یہ ضد نادان بچوں کی سی بے جا ضد تو نہیں، ہم کسی ایسے تعصب

کاشکار تو نہیں، جس نے حقیقت کے روتے زیبا کو ہماری نگاہوں سے اوجھل کر دیا ہو؟ ہم اپنی قومی انا کے اندھے پرستار بن کر تو ایسا نہیں کہہ رہے؟ جدید تہذیب سے ہمیں خدا واسطے کا کوئی بے تیر تو نہیں، جس کے باعث ہم اس سے بیزار ہیں یا جو مطالبہ ہم کر رہے ہیں، اس میں واقعی وزن ہے۔ نظام مصطفیٰ حقیقتاً ہماری فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔ جب اس کے نور سے ہمارا آنکھ روشن ہوگا تو یہ جہاں بقعہ نور بن جائے گا۔ صرف عالم اسلام کا مقدر ہی نہیں جاگے گا بلکہ دنیا سے انسانیت کی قسمت بدل جائے گی۔

یہ ہیں وہ سوالات جو اقوام عالم کے دل میں ہمارے بارے میں اٹھتے رہتے ہیں یہ وہ شکوک و شبہات ہیں جو ہماری نئی نسل کی ذہنی پریشانی اور اضطراب کا باعث بنتے رہتے ہیں۔

اقوام عالم کے سوالات کا تسلی بخش جواب دینا اور اپنے نوجوانوں کے شکوک کا ازالہ کرنا ان لوگوں کا اولین فرض ہے، جو اسلام کو رب العالمین کا بھیجا ہوا اور رحمۃ للعالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین سمجھتے ہیں۔ اگرچہ تمام مسلمانوں پر یہ ذمہ داری یکساں ہے، لیکن اہل پاکستان ان سوالات کا جواب دینے کے زیادہ ذمہ دار ہیں۔ انھوں نے بیسویں صدی میں ایک آزاد وطن کا محض اس لیے مطالبہ کیا تھا کہ وہاں عملاً نظام مصطفیٰ نافذ کرنا چاہتے ہیں، اور اس مدعا کو پانے کے لیے انھوں نے جانوں، عھمتوں، اموال و املاک کی ایسی قربانیاں ہنستے مسکراتے پیش کیں جن کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔

آج کا یہ اجتماع ایک ایسے ملک میں منعقد ہو رہا ہے، جو جدید سائنس، صنعتی علوم

اور جملہ فنون کا منبع ہے اور مغربی تہذیب و ثقافت کا نمائندہ مرکز ہے۔ نیز اس اجتماع کے انعقاد کا اہتمام امت مسلمہ کے سوا اعظم اہل سنت نے کیا ہے، جو اسلام کے کسی ایک جزو کے ترجمان نہیں بلکہ کل اسلام کے علم بردار ہیں۔ عقائد، خواہ ان کا تعلق توحید باری تعالیٰ سے ہو یا نبوت و مقام مصطفیٰ سے ہو۔ ان کا تعلق عظمتِ اہل بیت سے ہو یا صحابہ کرام کی شانِ رفعت سے۔ ان جملہ عقائد کے ترجمان اہل سنت ہیں۔ اعمال فقہی ہوں یا اخلاقی، روحانی ہوں یا عسکری، ان سب کی افادیت پر یہ ایمان بھی رکھتے ہیں اور ان کے نگہبان بھی ہیں جن کے مایہ ناز اسلاف نے علم و حکمت کے خیابانوں میں تحقیق کے وہ پھول کھلائے ہیں جن کی مہک سے دنیا کی دانش گاہیں معطر ہیں۔ جن کے غازیوں نے مشرق و مغرب کے وہ قلعے مسخر کئے، جہاں کوئی فاتح اپنا پرچم نہ لہرا سکا۔

ان حالات کے پیش نظر بین الاقوامی سنی کانفرنس کا پلیٹ فارم موزوں ترین جگہ ہے، جہاں سے ان سوالات کا جواب دیا جانا چاہیے۔

حاضرین کرام! میں پورے وثوق سے اعلان کرتا ہوں کہ اہل پاکستان نے نظام مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کے نفاذ کا نعرہ کسی اندھی عقیدت، وقتی جوش، بیجا تعصب، یا کسی نظریہ حیات سے جا ہلانہ عداوت اور احمقانہ محاسنت کی بنا پر نہیں لگایا تھا، بلکہ انھوں نے عصر حاضر کے نظریات کا منصفانہ تجربہ کیا انسانیت کے لیے انھیں تباہ کن پایا اور بے جھجک انہیں مسترد کر دیا۔ وقت کی تنگ دامانی تفصیل میں جانے کی اجازت نہیں دیتی۔ اشارات پر ہی اکتفا کروں گا۔ داناؤں کے لیے اشارہ کافی ہوتا ہے۔

آج کل جن نظریات کی شوکت و سطوت سے سارا عالم گونج رہا ہے۔ وہ سرمایہ داری اور اشتراکیت کے نظریات ہیں۔ بظاہر یہ دونوں نظام جدا جدا ہیں جو باہم متضاد م بھی ہیں اور بسا اوقات متضاد بھی، لیکن اگر وقت نظر سے دیکھا جائے، تو ان کی حقیقت و ماہیت بھی ایک ہے اور ان کے مبداء و مال میں بھی چنداں تفاوت نہیں۔ دونوں کا سرچشمہ الحاد ہے، اور مطلق نظر مادی ترقی ہے۔ دونوں ایک خالق حکیم کے منکر ہیں اور زیادہ سے زیادہ مادی آسائشوں کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ زندگی ان کے نزدیک بس یہی دنیوی زندگی ہے۔ اُخروی زندگی کا ان کے ہاں کوئی تصور نہیں۔ ازراہ انصاف آپ خود ہی بتائیے کہ جن نظریات کا منبع شرک اور الحاد ہو گا، کیا وہاں اعتدال کہیں نظر آئے گا؟ افراط و تفریط کے جھکے کبھی بلندی پر اور کبھی پستی پر پٹخ رہے ہوں گے۔ لندن کا وہ گنبد (پلینٹیرم) جس میں مصنوعی سورج، چاند اور ستاروں کے طلوع و غروب کے مناظر دکھائے جاتے ہیں۔ لوگ اس کے بارے میں تو یہ کہتے ہیں کہ فلاں فلاں ماہر انجنیئر نے اس کی تعمیر و تکمیل میں حصہ لیا، لیکن زمین کے قرص زمر دیں، اس کے فلک بوس پہاڑ، یہ نیگیوں بے کر ان سمندر، آسمان کا یہ گنبد نیلوفر می، اس میں حقیقی مہر و ماہ کا طلوع و غروب، اس میں فروزاں ان گنت ضیاء بار قندیلیں، ان کی بختگی اور حیران کن باہمی نظم و ضبط، کیا کسی خالق حکیم کے بغیر معرض وجود میں آسکتا ہے؟ جو عقل اس روشن حقیقت کا عرفان حاصل کرنے سے قاصر ہے۔ زندگی کے پیچیدہ مسائل کو سلجھانے کے لیے اس پر کیوں کر کلیتہً انحصار کیا جاسکتا ہے۔ جو لوگ حیات اُخروی کا انکار کرتے ہیں، وہ درحقیقت اس امر کا انکار کرتے ہیں کہ دنیا کا نظام عدل و انصاف پر مبنی ہے۔ ہمارے سامنے سینکڑوں نہیں

ہزاروں مثالیں ہیں کہ اسمگلر، چور بازاری کرنے والے، قمار باز، قزاق اور ظالم۔ عیش و عشرت اور عزت و احترام کی زندگی بسر کرتے ہیں اور قوم و وطن کے مخلص خادم، علم اور ثقافت کے بے لوث خدمت گار، بنی نوع انسان کے سچے خیر خواہ، مفلسی، غربت، ذلت اور گناہی کی زنجیروں میں جکڑے رہتے ہیں۔ اس سے بڑا ظلم بھی کوئی ہو سکتا ہے کہ زمانے کے فرود و فرعون تو اورنگ شاہی پر بٹھیں اور اپنے شبستانوں میں عمر بھر دادِ عیش دیتے رہیں اور خلیل و کلیم کے پیرو دھکے کھاتے رہیں اور اس ایک ایک پر زندگی کے ڈرامے کا ڈراپ سین ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات اگرچہ اپنی روشن آیات اور واضح دلائل کے باعث اظہر من الشمس ہے پھر بھی حواس و عقل کی رسائی سے ماورا ہے۔ آیتے ذرا دیکھیں۔ انسان نے خود اپنے بارے میں کیا کیا گھنٹا نیاں کی ہیں۔ اپنے بارے میں اس کے نظریات کے تضاد اور افکار کی بے اعتدالیوں کا کیا عالم ہے۔

ہم یونان اور روم کے عہد قدیم اور ان کے نظریات کو بیان کرنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کریں گے۔ جب کہ انسان اپنے دیوتاؤں سے برسرِ پیکار رہتا تھا ان کے اختیارات چھیننے، ان کو مسدود سے محروم کرنے کے لیے ہمیشہ سازشیں کرتا رہتا تھا۔ ہم عہد جدید کے مفکرین کی آرا کا اجمالی تذکرہ کریں گے۔ اس سے فکر انسانی کی بے اعتدالیوں کا آپ بے آسانی اندازہ لگا سکیں گے۔

قسطنطین قسیر روم کے سہارے عیسائیت نے جب یورپ میں اپنے قدم جمائے تو اس نے انسان کو ایک پیدائشی گناہ گار کے روپ میں پیش کیا اور اس کی بخشش کے لیے خداوند کے اکلوتے بیٹے یسوع مسیح کو سولی پر چڑھا کر کفارہ کا

عجیب و غریب نظریہ پیش کیا۔

اٹھارویں صدی کے آغاز میں جب عیسائیت کے خلاف شدید رد عمل رونما ہوا، تو ایک ایسے دور کا آغاز ہوا، جسے یورپ کی تاریخ میں روشن دور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس وقت کے فلسفیوں نے عقل کو کائنات اور زندگی کے تمام معاملات میں ”حکم تسلیم کیا، اس کے فیصلے کو قطعی اور آخری فیصلہ مانا گیا۔ ہر وہ چیز خواہ وہ خدا کی ذات کیوں نہ ہو، جو عقل کے ظرف میں سما نہیں سکتی ہیں اس کے وجود ہی کا انکار کر دیا۔ اس طرح مذہب کو زندگی سے خارج کر دیا گیا۔ اٹھارویں صدی کے خاتمہ سے یہ روشن دور بھی اپنی انتہا کو پہنچا۔ انیسویں صدی کے اہل فکر نے عقل اور انسان دونوں کا قصہ پاک کر دیا، فلسفہ نے بتایا کہ مادہ ہی خدا ہے، مادہ ہی عقل کو پیدا کرتا ہے، اب انسان کی الوہیت اور عقل انسانی کی حاکمیت کا دور ختم ہو گیا۔ نیچر خدا بن گئی اور انسان اس کا بندہ۔

اس کے بعد ڈارون آیا۔ اس نے انسان کے بارے میں ایک بالکل جدید نقطہ نظر پیش کیا۔ اس نے اعلان کیا کہ انسان، حیوان ہے۔ اس کے درمیان اور دیگر بے خرد اور بے شعور حیوانات کے درمیان چند ارتقائی کڑیوں کا فرق ہے۔ اس طرح انسانی شرف و کرامت کی ساری خلعتیں تار تار ہو گئیں۔ انسان کے ارد گرد تقدس کا جو ہالہ تھا۔ وہ کافر ہو گیا۔ ڈارون کے اس نظریہ کو توقع سے زیادہ قبول عام نصیب ہوا۔ اس نظریہ کی مقبولیت کی وجہ یہ تھی کہ اس کی کوئی علمی یا سائنسی بنیاد تھی، جس پر اس نظریہ کا محل تعمیر کیا گیا۔ ڈارون کے مداح بھی اس کی لغویت کو جانتے تھے ”جیولین ہیکسے، جو ڈارون کا پُرچوش مبلغ تھا، اس نے بھی ڈارون کے اس نظریہ کو جوں کا توں تسلیم کرنے سے

انکار کر دیا، کیونکہ یہ ایک ثابت شدہ علمی حقیقت ہے کہ جن خلیوں سے انسان کا جسم مرتب ہے، وہ ان خلیوں سے یکسر مختلف ہیں جو دیگر حیوانات کے اجزائے ترکیبی ہیں محض کلیسا سے نفرت ڈارون کے نظریہ کی مقبولیت کا سبب بنی۔ لوگ کلیسا اور اس کے ناقابل فہم عقائد سے یوں دل برداشتہ تھے کہ وہ ہر اس نظریہ کو بے تابی سے خوش آمدید کہتے، جس سے کلیسا کا وقار مجروح ہو اور اس کے اقتدار کی گرفت ڈھیلی پڑے۔

انسان کے ساتھ یہ مذاق یہیں ختم نہیں ہوا بلکہ یہودی، جو اپنے آپ کو خدا کی پسندیدہ قوم یقین کرتے اور باقی اقوام عالم کو گدھا تصور کرتے ہیں، اور ان کو دبوچ کر ان پر سواری کرنا اپنا حق جانتے ہیں۔ انھوں نے ڈارون کے نظریہ کو مزید مضحکہ خیز بنانے کے لیے اپنی دانش، قوت استدلال اور اہل یورپ کی مذہب سے بیزاری اور کلیسا سے برہمی کا فائدہ اٹھا کر انسان کو مزید ذلت کی پستیوں میں گرا دیا۔

اس سلسلہ میں تین یہودی علماء کی کاوشیں ساری انسانیت کو ذلیل کرنے میں اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔ کارل مارکس نے کہا کہ انسان ذرائع پیداوار کے رحم و کرم پر ہے اسباب معیشت میں جب تبدیلی آتی ہے تو انسانی اخلاق و کردار میں بھی از خود تغیر رونما ہو جاتا ہے۔ جو اعمال پسندیدہ اور قابل ستائش ہوتے ہیں اس تبدیلی سے فرسودہ اور بے ہودہ ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اخلاقی قدروں کو اٹل اور غیر تبدیل سمجھنا جہالت اور ناوانی ہے۔ اس کے اس نظریہ نے ان تمام اخلاقی اقدار کو خاک میں ملا دیا، جو انسان کی ابتدائے آفرینش سے اب تک مقدس اور مجید سمجھی جاتی تھیں۔

دوسرا یہودی عالم "اسکنتہ فرانیڈ" آگے بڑھا اور اس نے لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات راسخ کرنے کے لیے اپنی اطمینانی ذہانت اور زور قلم صرف کر دیا کہ



انسان کے جملہ اعمال کا سرچشمہ جنسی شہوات کی تسکین کا جذبہ ہے، اس ظالم نے ان جلیل القدر ہستیوں کے عظیم کارناموں کی ایسی بھونڈی تاویلیں کیں، جس سے انسان اس غلط فہمی میں بہ آسانی مبتلا ہو جاتا ہے کہ ان مقدس ہستیوں کے عظیم کارنامے بھی جنسی شہوات کی صدا سے بازگشت ہیں۔ اس نے معصوم بچے کے دودھ پینے، انگوٹھا چوسنے، ماں سے لپٹ جانے جیسے اعمال کو بھی جنسی عشق کی تکمیل کا نام دیا ہے۔ یوں انسانیت کو اس کی مسند رفیع سے دھکا دے کر حیوانیت کے گہرے گڑھے میں پھینک دیا۔

اس کے بعد اجتماعیت کے مورچہ سے تیسرے یہودی عالم ”ڈرکھائم“ نے گولہ باری شروع کی اور کہا کہ شادی کی رسم نہ صرف یہ کہ لغو ہے بلکہ انسانیت کے خلاف سنگین جرم اور گناہ ہے۔

وہی انسان جو کبھی حق کو سر بلند کرنے کے لیے جان کی بازی لگاتا ہوا نظر آتا تھا انسانی فلاح و بہبود کے لیے اپنے مادی وسائل اور ذہنی صلاحیتیں وقف کر دیا کرتا تھا جس کی عفت قلب و نگاہ پر ملائکہ کا تقدس بشار تھا، گاؤنٹر کی طرح اب صرف شکم اور نفس کی شہوتوں کا اسیر بن کر رہ گیا۔ اس کی تمام علمی اور سائنسی تہمتوں کو وہ اسی ایک نقطہ کے گرد گردش کرنے لگی۔

ان تمام نظریات کے برعکس اسلام نے انسان کو نہ اپنے مقام سے بڑھا کر الوہیت کی مسند پر بٹھایا، نہ اسے گرا کر ذلیل حیوان بنایا، بلکہ بتایا کہ اللہ کی زمین پر یہ اس کا خلیفہ ہے۔ اس کے سر پر ”لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ“ کا تاج سجایا۔ اس کی بے پناہ صلاحیتوں اور خوبیوں سے یہ کہہ کر پردہ اٹھایا، لَقَدْ خَلَقْنَا

الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ اس کا خمیر مٹی سے اٹھا۔ اسے فقط زندگی سے  
بہرہ ورنہیں کیا بلکہ ادراک، آگہی اور شعور کی دولت سے اس کا دامن بھر دیا۔ اس  
عالم رنگ و بو کو اس کی قوتوں کی جولان گاہ بنا دیا۔ ارشاد ہے:

اللَّهُ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ  
لِتَجْرِيَ الْفُلُكُ فِيهِ بِأَمْرِهِ  
وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَ  
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۚ وَ  
سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي  
السَّمَوَاتِ وَ مَّا فِي  
الْأَرْضِ جَمِيعًا مِنْهُ ۗ  
إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ  
لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۝  
(النحل، آیت نمبر ۱۲)

اللہ وہ ہے جس نے مسخر کر دیا ہے تمہارے  
لیے سمندر کو تاکہ رواں رہیں اس میں  
کشتیاں اس کے حکم سے اور تاکہ بحری  
تجارت سے تلاش کرو اس کا فضل  
اور تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو اور اس  
نے مسخر کر دیا ہے تمہارے لیے جو کچھ  
آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے،  
سب کا سب اپنے حکم سے بے شک  
اس نظام میں نشانیاں ہیں، ان  
لوگوں کے لیے جو غور و فکر کیا  
کرتے ہیں۔

انسان کے رہوار شوق و تحقیق کو یہ کہہ کر ایسی مہمیز لگائی کہ وہ کہیں رکتا ہی نہیں

ارشاد ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْبَيْلَ وَالنَّهَارَ  
وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ  
وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ  
أُورَ اللہ تعالیٰ نے مسخر کر دیا تمہارے  
لیے رات دن، سورج اور چاند کو اور  
تمہارے ستارے بھی اس کے حکم کے

بِأَمْرِهِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ  
 پابند ہیں۔ بے شک ان تمام چیزوں  
 میں قدرتِ الہی کی نشانیاں ہیں، اس  
 قوم کے لیے جو دانش مند ہو۔  
 (النحل) آیت نمبر ۱۲

اتنی بے انداز صلاحیتیں اور بے پناہ قوتیں دینے کے بعد انسان کو بے لگام  
 نہیں چھوڑ دیا تاکہ اس کی بغاوتوں اور سرکشوں سے زندگی جہنم نہ بن جاتے، بلکہ یوم  
 حساب کی آمد کی اطلاع دے کر اس میں ذمہ داری اور جواب دہی کی شمع روشن کر دی  
 تاکہ ہر عمل سے پہلے، وہ اس پر مرتب ہونے والے نیک و بد نتائج کا اندازہ کرے  
 اگر اس کائنات کو حادثہ اور اتفاق کی پیداوار قرار دیا جائے تو اس کا کوئی مقصد  
 نہیں ہوگا۔ زندگی کا کاروبار بغیر منزل کے وقت کے بیابان میں دھکے کھانا ہے گا  
 اور انسان پر اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس سے اس کی منزل چھین لی جاتے  
 اور اس کے اعمال کو نتائج سے بیگانہ کر دیا جائے۔

انسان کی تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی انسان کا رشتہ وحی الہی سے ٹوٹا، وہ افراط و  
 تفریط کا شکار ہو گیا۔ جب حقیقت انسان کے بارے میں عقل کی ٹھوکروں کا یہ حال ہے  
 تو دوسرے انسانی مسائل کے بارے میں اس کی لغزشیں بعید از قیاس نہیں۔

فرد اور معاشرہ کا باہمی تعلق کیا ہے؟

انسانی سوسائٹی میں عورت کا مقام کیا ہے؟

گناہ کیا ہے؟

خیر و شر کا کیا معیار ہے؟

حاکم اور رعایا میں تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟

دولت کی آفرینش میں سرمایہ اور محنت کا کتنا کتنا حصہ ہے ؟  
اسی طرح کے کئی دیگر مسائل ہیں۔ ہم یہاں صرف چند مسائل کے بارے میں بحث  
کریں گے۔

یورپ میں تحریکِ اصلاحِ علوم سے پہلے وہاں کا عام شہری دوہری غلامی کے شکنجوں  
میں کراہ رہا تھا۔ ایک طرف کلیسا کی جاہلانہ مذہبی بالادستی تھی، دوسری طرف جاگیردار  
کی معاشی برتری تھی۔ ہر شخص اربابِ کلیسا کو اپنی پیداوار کا ایک حصہ دیا کرتا تھا۔ اس  
کے علاوہ وہ اس بات کا بھی پابند تھا کہ وہ کلیسا کی زمینوں میں بطور بیگار کام کرے اور  
کلیسا کی جنگوں میں بطور رضا کار شریک ہو۔ جاگیردار کی گویا یہ زر خرید غلام تھا۔ دن رات  
بے زبان جانوروں کی طرح یہ اس کے کھیتوں میں جتا رہتا۔ ایک جاگیردار کی زمین چھوڑ  
کر وہ نہ کسی دوسرے جاگیردار کے پاس جاسکتا تھا، نہ کوئی دوسرا پیشہ اپنا سکتا تھا۔ جب  
کوئی جاگیردار زمین فروخت کرتا تو کسان بھی زمین کے ساتھ نئے مالک کے قبضہ میں  
منتقل ہو جاتا۔

نشأۃ ثانیہ نے کلیسا کی غلامی کی زنجیروں کو کاٹ دیا۔ صنعتی انقلاب نے جاگیرداروں  
کی بالادستی کا خاتمہ کر دیا۔ دوہری غلامی سے یہ آزادی یورپ کے عام شہری کو بڑی  
مشکل اور دیر کے بعد میسر آئی تھی۔ اس لیے اس نے فرد کی آزادی کے گیت گانے  
شروع کر دیئے۔ وہاں کوئی ایسی قوت نہ تھی جو اس آزادی کو آئین کا پابند بنا کر  
راہِ راست پر گامزن کر دیتی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہو کر ہر شخص  
من مانی کرنے لگا۔ حکومت کو بھی اجازت نہ تھی کہ فرد کی آزادی میں مداخلت ہو۔ اس کا  
یہ فرض تھا کہ اگر کوئی شخص یا ادارہ فرد کی آزادی میں مداخلت ہو تو اس کو ایسا کرنے سے

روکے۔ آزادی کی اس لہر سے عوام کو صرف شراب پینے کی، جو اکھینے کی مجھل رقص و سرود میں شرکت کرنے کی اور ہر طرح کی بدکاری کی آزادی ملی، لیکن سرمایہ دار نے عوام کی اس غفلت سے خوب فائدہ اٹھایا۔ معاشی لوٹ کھسوٹ کی آزادی حاصل کر کے اس نے انھیں دونوں ہاتھوں سے لوٹنا شروع کر دیا۔ اسے سود لینے کی اور حسبِ منشا اس کی شرح مقرر کرنے کی آزادی تھی۔ اسے دلکش اور نظر فریب قمار خانے تعمیر کرنے اور اس میں سادہ لوح عوام کو جو اکھینے کے رنگے برنگے مواقع فراہم کر کے انھیں لوٹنے کی آزادی تھی، مزدور کا استحصال کرنے کی آزادی تھی۔

اس نے سینما بنائے اور ان میں عربوں اور انتہائی اشتعال انگیز فلمیں دکھا کر لوگوں کے اخلاق کو برباد کرنا شروع کر دیا۔ سب اسی آزادی کی دیوی کے قصیدے گا رہے تھے۔ ادیب اپنے افسانوں، ڈراموں اور ناولوں میں اس کی تقدیس بیان کر رہے تھے۔ غرض انفرادیت پرستی کا ایک ایسا جھکڑ چلنے لگا، جس نے معاشرہ کی تمام اخلاقی قدیں پامال کر دیں، لیکن کسی کو اف کرنے کی مجال نہ تھی۔

قوم کا سرمایہ چند حریص اور عیار سرمایہ داروں کے قبضہ میں آ رہا تھا۔ عوام اور مزدور شراب میں مست ہو کر رات رات بھر رقص کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ یہودی سا ہو کاران کے خون کا آخری قطرہ نچوڑ رہا تھا۔ معاشرہ غریب اور امیر میں تیزی سے بٹنے لگا۔ فرد کی یہ مادر پدر آزادی اپنے جلو میں برباد یوں، محرومیوں اور یالوسیوں کا شکر جوار لے کر تباہی مچا رہی تھی، یہاں تک کہ صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ فضا آہوں اور سسکیوں سے بھر گئی، اب اس کا رد عمل شروع ہوا۔ سود خوروں، سٹہ بازوں اور صنعتی اجارہ داروں کے خلاف نفرت اور عداوت کا ایک طوفان

انڈیا۔ کارل مارکس یہودی نے آگے بڑھ کر اسے فلسفیانہ بنیاد اور دلائل و براہین کا انبار مہیا کر دیا۔ یوں کمیونزم نے اجتماعیت کا پرچم لہرایا اور اس کی قربان گاہ پر فرد کو اس کی تمام عزتیں و اقدار سمیت بھینٹ پڑھا دیا گیا۔

فرد کو ہر قسم کی ملکیت کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ اظہارِ خیال، تقریر و تحریر کی آزادی سلب کر لی گئی۔ یوں فرد کی وہ ساری انانیت اور نحر سے خاک میں مل گئے۔ وہ معاشرے کا بندہ بے دام بن کے رہ گیا۔ ان بدے ہوئے حالات میں فرد کا مفاد پیش نظر نہیں ہوگا بلکہ معاشرہ کا مفاد پیش نظر ہوگا۔ اب فرد کی مرضی نہیں چسے گی، معاشرہ کی مرضی چلے گی۔ درحقیقت معاشرہ کا لفظ تو محض ایک دھوکا اور فریب تھا۔ جس کے پردے میں پروتاری امریت اپنے بے پایاں اختیارات کے ساتھ فرد کی بیخ کنی میں سرگرم عمل تھی۔ جہاں بھی اشتراکیت کے سبز قدم پہنچے، انسانی خون کے دریا بہہ گئے۔ سائبریا کے برفانی جنگل و انشوروں، پروفیسروں، انجینئروں، سائنس دانوں، قانون دانوں اور عوام کے جسمِ غفیر سے بھر گئے۔ جہاں موسم کی چیرہ دستیوں کے ساتھ ساتھ نامناسب غذا طبی سہولتوں کے فقدان، کیمپوں کے افسران کی سنگدلیوں کے باعث ہزاروں نہیں لاکھوں قیمتی افراد لقمہ اجل بن گئے۔

حاضرین کرام! کاروانِ انسانیت کی قیادت کا رشتہ جب بھی وحی الہی سے چھوٹا اور عقل زیاں اندیش نے اس کی زمام اپنے ہاتھ میں لی، افراط و تفریط کی ان بھول بھلیوں میں ہی وہ ٹھوکریں کھاتا رہا۔ کبھی ذاتی مفادات کے خارزاروں میں الجھ کر رہ گیا اور کبھی اجتماعی مفاد کی تندہریں اسے شس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گئیں۔ اسلام نے جہاں خود انسان کے بارے میں ایک متوازن نظریہ پیش کیا جو عین

حقیقت تھا۔ اسی طرح فرد اور معاشرہ میں ایسا ربط باہم قائم کیا کہ نہ افراد کی چیرہ دستیوں  
 معاشرہ کے مفادات کو پامال کر سکتی ہیں اور نہ معاشرہ کا عفریت فرد کی فطری صلاحیتوں  
 کی نشوونما میں حائل ہو سکتا ہے۔ اسلام نے فرد کا احترام کیا، اس کو اپنی مرضی  
 کے مطابق پروان چڑھنے کی اجازت دی۔ اس کو کمانے اور کھانے کی آزادی مرحمت  
 کی، لیکن یہ آزادی مادر پدر آزادی نہیں، بلکہ اس کے لیے حدود مقرر کیں۔ وسائل  
 معیشت میں حلال و حرام کا امتیاز قائم کیا ہے تاکہ کوئی کسی کی مجبوری، ناواقفی اور  
 سادہ لوحی سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکے۔ سود، ہوا، بے جان نفع خوری، چور بازاری،  
 اسمگلنگ ذخیرہ اندوزی نیز ایسی صنعتیں جن کا مقصد ہی انسان کے شہوانی جذبات کو  
 برانگیختہ کرنا ہے، ان سب کو ممنوع قرار دیا۔ جہاں تک فرد کی اپنی ذاتی صلاحیتوں  
 کے بروئے کار لانے کا تعلق ہے وہ آزاد ہے۔ اس کی آزاد محنت سے کمائے  
 ہوئے سرمائے کے حقوق ہیں۔ جن کی حفاظت اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔  
 کسی فرد کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کوئی ایسا کام کرے جس سے اس کے بھائی کے  
 جائز حقوق پر زد پڑتی ہو یا معاشرہ کا مفاد مجروح ہوتا ہو۔

ایک اور پیچیدہ مسئلہ مرد و زن کا باہمی تعلق ہے۔ یہاں بھی ہمیں عقل انسانی  
 قلابازیاں کھاتی ہوئی دکھانی دیتی ہے۔ عورت کے بارے میں اہل خرد کے نظریات  
 کا اتار چڑھاؤ بڑا ہی کرب انگیز ہے۔ کبھی اسے مرد کے غلام کی حیثیت دی گئی۔ مرد  
 کی خدمت اور آسائش اس کا مقصد حیات تھا۔ یونان کے فلسفی تو برسوں اس مسئلہ  
 پر بحث کرتے رہے کہ عورت ذمی روح بھی ہے یا نہیں۔ اسے گناہ اور برائی کی  
 دعوت دینے والی یعنی شیطان مردود قرار دیا گیا۔

رومی اپنے ابتدائی دور میں اسے اپنے خاوند کی غلام تصور کرتے۔ بعض حالات میں خاوند کو اجازت تھی کہ وہ اپنی بیوی کو قتل کر دے۔ آہستہ آہستہ عورت کی حیثیت بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ سارا رومی معاشرہ اس کے اشارہ ابرو پر رقص کرنے لگا۔ نکاح کی اہمیت ختم ہوتی گئی۔ بات بات پر طلاق دینے کا عام رواج ہو گیا۔ عورتیں بار بار شادی کرنے کو سرمایہ افتخار سمجھنے لگیں۔ "سینٹ جردم" ایک باکمال عورت کا ذکر کرتا ہے، جس نے آخری بارتیسویں شادی کی اور اپنے شوہر کی اکیسویں بیوی تھی۔ نکاح کے بغیر ازدواجی تعلقات قائم کرنا معیوب نہ رہا۔ فسق و فجور کا سیلاب اُٹھ کر آ گیا۔ شاہی خاندانوں میں بھی ایسے حکمران گزرے، جنہوں نے اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو اپنے شہستان عشرت کی زینت بنا لیا تھا۔ قحبہ گرمی کا پیشہ معیوب نہ رہا۔ رومیوں میں فلور نامی کھیل از حد مقبول تھا، کیونکہ اس میں منسکی دوستی نہیں دوڑتی۔ شریک ہوتی تھیں۔ مالدار بیویاں اپنے شوہروں کو بھاری شرح سود پر قرضہ دیا کرتی تھیں۔ اس بے راہروی کے دور میں قسطنطین کی سرپرستی میں عیسائیت نے یورپ میں قدم رکھا اور ایک نئے رد عمل کا آغاز ہوا۔ اس نے اعلان کیا کہ عورت گناہ کی ماں اور بدی کی جڑ ہے۔ اس کا عورت ہونا ہی شرمناک ہے اس کو اپنے حسن و جمال پر اترا نا نہیں، شرمانا چاہیے۔ "طوطولیاں" جو ابتدائی دور کے ائمہ مسیحیت میں سے تھا کہتا ہے :

عورت شیطان کے آنے کا دروازہ ہے، وہ شجر ممنوعہ کی طرف پہنچانے والی، خدا کے قانون توڑنے والی اور خدا کی تصویر، مرد کو غارت کرنے والی ہے۔



کرائی سوکسٹم جو مسیحیت کے اولیاء کبار میں شمار ہوتا ہے، عورت کے حق میں کہتا ہے:

”ایک ناگزیر برائی، ایک پیدائشی وسوسہ، ایک مرغوب آفت، ایک غارت گرد لربائی، ایک آراستہ مصیبت“

یہی نہیں، بلکہ مرد و عورت کا معنفی تعلق خواہ نکاح سے ہو بجائے خود ایک نجاست اور قابل اعتراض چیز بن گیا۔ مذہبی زندگی کے لیے ضروری ہو گیا کہ انسان نکاح نہ کرے۔ اگر نکاح کر لیا ہو تو قرابت سے باز رہے۔ مذہبی انجمنوں نے یہ قانون پاس کیا کہ چرچ کے عہدہ دار تخلیہ میں اپنی بیویوں سے بھی نہ ملیں۔ چرچ کے تہوار میں وہ مرد اور عورت شریک نہیں ہو سکتے تھے، جنھوں نے پہلی رات ایک ساتھ گزاری ہو۔ اس راہبہ نے تصور نے خاندانی تعلق سمجھے کہ ماں اور بیٹے کے تعلق میں تلخی گھول دی۔

صدیوں عورت نفرت اور تحارت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی رہی۔ وہ نہ اپنے باپ کی وارث ہو سکتی تھی، نہ اپنے خاوند کی، نہ اپنے بیٹے کی۔ اسے یہ حق ہی نہ تھا کہ کسی جائیداد کی مالک بن سکے۔ کلیسا نے فطرت انسانی کے جہتی تقاضوں کے سامنے بند باندھنے کی جو کوشش کی تھی، اس میں اسے بڑی طرح ناکامی ہوئی۔ لٹے ہوئے جذبات سیلاب بن کر اٹھ رہے اور ان خانقاہوں کے تقدس کو بھی خار و خس کی طرح بہا کر لے گئے، جہاں مقدس راہب اور مقدس راہبات اس نجاست سے دامن بچانے کے لیے گوشہ نشین ہو گئے تھے، راہبوں کی خانقاہیں جنسی آلودگیوں میں یوں مبتلا ہو گئیں۔

کہ ان کی سرانڈ سے دماغ پھٹنے لگے۔ آخر جب نشاۃ ثانیہ سے کلیسا کی گرفت ڈھیلی پڑی تو ان غیر فطری پابندیوں کے خلاف بڑی شدت سے رد عمل روپیہ ہوا۔

انیسویں صدی میں ڈارون نے انسان کو حیوان ثابت کر کے پرانی اخلاقی قدروں کو روند ڈالا۔ لذت گیری اور شہوت رانی زندگی کا مقصد اعلیٰ بن گئی۔ فرائیڈ نے یہودیوں کو عالمی سازش کے تحت انسان کو جنسی شہوات کا سید زبوں ثابت کیا۔

انسانی تخلیق کا مقدس فریضہ بھی مرد و زن کی آزاد خواہشات کی راہ میں حائل ہوا تو اسے بھی اٹھا کر پرے پھینک دیا۔ ضبطِ تولید کے نئے طریقے ایجاد کیے جانے لگے، لائقِ فائق ڈاکٹروں کی ٹیمیں سارے کام چھوڑ کر ایسی موثر دوا میں بنانے میں منہمک ہو گئیں جن کے استعمال سے پیدائش اطفال کے عمل کو موثر طور پر روکا جاسکے، جہاں یہ سارے حربے ناکام ثابت ہوئے وہاں کنواری ماؤں کو استقاطِ حمل کی قانونی اجازت دے دی گئی، اور ہسپتالوں میں ایسے شعبے کھولے گئے جو صرف اس کام کے لیے ہی مخصوص ہیں۔ اس کام کے کم و کیف کی تفصیلات ہونٹریا ہیں۔ صرف ایک مثال بطور نمونہ سماعت فرمائیے۔

۲۷ مارچ ۱۹۶۳ء کی صبح سوا چھ بجے بی بی سی لندن نے یہ خبر سنائی،

”آج برطانیہ کے شہر ”نوٹنگھم“ میں پچاس ہزار افراد نے حمل کرانے

کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا۔ ہسپتالوں سے جمع کردہ اغدا بتاتے

ہیں کہ ۱۹۶۲ء میں ایک لاکھ اسی ہزار دو صد پچاس حمل گرائے گئے

تھے۔ یہ سب کنواری لڑکیوں کے تھے، روزانہ اوسط چار صد پچاس بنتی ہے  
یہ ان بچوں کے علاوہ تھے جنہیں یا تو دو شیزہ ماؤں نے خود رکھ لیا تھا یا  
سرکاری پرورش گاہوں میں بھجوا دیا تھا۔

مغرب کے علماء اس جنسی عمل کو عین حیاتیاتی عمل بتاتے ہیں۔ جب خواہش پیدا  
ہو، اسے پورا کر لینا چاہیے، ورنہ طرح طرح کی نفسیاتی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں، یہ عمل عین  
اس طرح ہے جس طرح کسی کو پیاس لگے، وہ پانی کا گلاس پی لے۔ یا بھوک لگے تو کھانا  
کھالے۔ وہ ہم پر پختا ہوتے ہیں کہ تم لوگوں نے اس سادہ سے حیاتیاتی عمل میں اخلاق  
کو گھیسڑ دیا ہے اور اس کو پیچیدہ بنا دیا ہے۔ یہ اہلی اور حماقت کیونکہ اہل مغرب سے  
سزد ہوئی ہے، اس لیے اسے اہلی اور حماقت کہنے کی جرات کون کر سکتا ہے۔

بے شک یہ دانائی اور خرد مندی ہے۔ صرف اس میں مرد کی خود غرضی کا زہر ملا  
ہوا ہے۔ مرد عورت کی سادہ لوحی کا پہلے بھی استحصال کرتا رہا، اب جب کہ اس کی  
خودی بیدار ہو رہی ہے۔ اسے اچھے کپڑے پہنا کر، وسائل زینت سے آراستہ کر کے  
نائٹ کلبوں میں شب بھر گھومنے کی آزادی دے کر، رقص گاہوں میں اسے مصروف  
رقص رہنے کی اجازت دے کر مرد آج بھی اس مسکینہ کے بھولے پن سے فائدہ  
اٹھا رہا ہے۔ مانا کہ بے مروت مرد تو اس حیاتیاتی عمل سے فارغ ہو کر، دامن جھاڑ کر  
چلا گیا، لیکن کبھی کسی نے اس صنفِ نازک کا بھی خیال کیا کہ اس عمل سے اس کی زندگی  
کن کن خطرات میں گھر جاتی ہے۔ ضبطِ تولید کی دوائیں اگر موثر بھی ثابت ہوں، تو  
ان کا خطرناک ردِ عمل بجائے خود ایک حقیقت ہے۔ اس سے اس مظلومہ کو کون بچائے  
گا۔ باوجود کوشش کے اگر حمل ٹھہر گیا تو استقراطِ حمل کا مرحلہ کتنا جانگسل ہوتا ہے۔ اگر

یہ تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی اور بچے نے جہنم لے لیا تو اس کو شفقتِ پدری اور آغوشِ مادری کون مہیا کرے گا۔ سرکاری پرورش گاہیں مانا، سب سہولتیں فراہم کرتی ہے۔ لیکن ماں کا پیار تو نہیں دے سکتیں۔ نیز اس تہذیب کے اثرات تو ان ملکوں میں بھی تیزی سے پھیل رہے ہیں، جہاں لوگوں کو بنیادی ضرورتیں بھی میسر نہیں، چہ جائیکہ ان سہولتوں کے بارے میں سوچا جائے۔

کوریا اور ویت نام میں امریکہ کے فوجی آوارہ بچوں کے جوشکر ہاتے ہزار چھوڑ کر آئے ہیں۔ ان کی حالت زار پر کبھی آپ کی آنکھ نمناک ہوئی؟ کیا یہ مسئلہ اتنا سادہ ہے جتنا پیاسے کے لیے ایک گلاس پانی یا بھوکے کے لیے ایک ڈبل روٹی بسنگدلی اور کند ذہنی کی بھنی کوئی حد ہونی چاہیے۔

اسلام نے اس نازک اور پیچیدہ مسئلہ کو جس عمدگی اور فطری سادگی سے حل کیا ہے، یہ اس کے دینِ فطرت ہونے کی ناقابل تردید دلیل ہے۔ اسلام نے عورت کی فطرت کے متعلق بحث کی ہے۔ اسے انسانیت کے لحاظ سے مرد کا ہم پائے قرار دیا ہے۔ مرد اور عورت کے مجموعہ کو اسلام ایک وحدت سمجھتا ہے جس سے انسانی معاشرہ کا قصرِ رفیع تعمیر ہوتا ہے۔ یوں ان تمام نظریات کو باطل قرار دے دیا، جو عورت کو مرد سے انسانی نقطہ نظر سے فروتر سمجھتے ہیں۔ ارشادِ خداوندی ہے:

یٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ	اے لوگو! ڈرو اپنے رب سے، جس
الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ	نے پیدا فرمایا تمہیں ایک جان سے اور
وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا ذَوْجَهَا	پیدا فرمایا اس سے جوڑا اس کا۔ اور پھیلا
وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا	دیئے ان دونوں سے مرد کثیر تعداد میں

وَتَسَاءُ ۞ (النساء: ۱۱) اور عورتیں (کثیر تعداد میں)

اس بات کا بھی اعلان کر دیا کہ اپنے خالق اور پروردگار سے مرد اور عورت کا تعلق یکساں نوعیت کا ہے۔ عورت بھی اپنے اعمالِ صالحہ کے لیے اس کی بارگاہ سے اس اجر اور انعام کی مستحق ہے جس کا حق مرد کو پہنچتا ہے۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ  
أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ  
مِّنْكُمْ مِّمَّنْ ذَكَرْتُ  
بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ

تو قبول فرمایا ان کی التجا، ان کے پروردگار  
نے اور فرمایا، میں ضائع نہیں کرتا عمل  
کسی عمل کرنے والے کا تم سے خواہ مرد  
ہو یا عورت۔ بعض تمہارا اجر ہے بعض

(آل عمران: ۱۹۵) کی۔

پھر اس حقیقت کو بھی آشکارا کر دیا کہ مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں۔ ایک صنف دوسری صنف کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ بعینہ وہی فائدہ دوسری صنف پہلی صنف سے حاصل کرتی ہے۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ  
لِبَاسٌ لَّهُنَّ ط (البقرہ: ۱۸۶) ان کے لیے لباس ہو۔

اس لحاظ سے دونوں کے حقوق و فرائض مساوی ہیں۔ پھر لباس کی تعبیر کتنی معنی خیز ہے۔ مختصر الفاظ میں لباس پر وہ ہے۔ پر عیب کو چھپاتا ہے۔ زینت ہے جس میں جمال کو نکھارتا ہے۔ راحت ہے، سردی اور گرمی سے بچاتا ہے، کیا ایک اچھی بیوی اپنے خاوند کے لیے اور ایک اچھا خاوند اپنی بیوی کے لیے پردہ زینت اور راحت نہیں۔ یقیناً ہے۔ جس ملت کے ہر گھر میں زوجیت کا یہ بلند تصور اور اعلیٰ معیار ہو۔

اس کے لیے یہ دنیا جنت نہیں تو اور کیا ہے۔ (ضیاء القرآن)

ایک دوسری آیت میں مرد اور عورت کے تعلقات کو یوں بیان فرمایا ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلَقَ لَكُمْ  
مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا  
لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ  
بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَ  
رَحْمَةً إِنَّ فِي ذَلِكَ  
لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ  
(الروم: ۲۱)

اور اس کی قدرت کی ایک نشانی یہ ہے

کہ اس نے پیدا فرمائیں تمہارے لیے

تمہاری جنس سے بیویاں تاکہ تم سکون

حاصل کرو ان سے۔ اور پیدا فرمائے

تمہارے درمیان محبت اور رحمت کے

جذبات۔ بے شک اس میں بہت

نشانیوں میں ان لوگوں کے لیے جو غور

فکر کرتے ہیں۔

اور جب سے ہم نے آیات الہی میں غور و فکر کا رویہ ترک کر دیا ہے، ہماری  
زندگی کے گلشن میں کھلنے والے پھول، رنگ اور مہک دونوں سے محروم ہوتے چلے  
جا رہے ہیں۔

عورت کے لیے کسب معاش کا حق تسلیم کیا۔ فرمایا:

لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا  
اَكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ  
مِّمَّا اَكْتَسَبْنَ ط (النساء: ۳۱)

مردوں کے لیے حصہ اس سے جو انہوں

نے کمایا اور عورتوں کے لیے حصہ اس

سے جو انہوں نے کمایا۔

اس کے لیے حق ملکیت ثابت کیا ہے اور اس کو اپنے باپ، خاوند اور دیگر

قریبی رشتہ داروں کا مردوں کی طرح وارث بنایا۔ ارشاد گرامی ہے:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ  
 الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ  
 وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا  
 تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَ  
 الْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ  
 مِنْهُ أَوْ كَثُرًا نَصِيبًا  
 مَّفْرُوضًا۔

(النساء)

مردوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے  
 جو چھوڑ گئے ماں باپ اور قریبی رشتہ دار  
 اور عورتوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے  
 جو چھوڑ گئے ماں باپ یا رشتہ دار  
 اس ترکہ میں سے جو تھوڑا ہو یا زیادہ۔  
 یہ حصہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہے

انسانی زندگی کے چند گوشے اور وہ بھی بڑے اہم مقام کے ساتھ آپ کی خدمت  
 میں پیش کیے۔ عقل انسانی نے ان مسائل کو حل کرنے میں جو ٹھوکریں کھائی ہیں، ان کا  
 بھی آپ نے مشاہدہ فرمایا۔ اس کی منکری بے راہروی سے کس طرح انسان انسانیت  
 کے منصبِ علیل سے گر کر حیوان کی جنسی آلودگی کی دلدل میں بھنس کر رہ گیا۔ اس کی زندگی  
 سے والبتہ مسائل بڑی بے دردی سے افراط و تفریط کی قربان گاہ پر ذبح کئے جاتے رہے  
 برابر انسان نے اس ظلم کو ہی حق و عدل سمجھا اور اس کو بروئے کار لانے کے لیے اپنے  
 تمام وسائل اثر و رسوخ اور قوت و جبروت کو بڑے شرح صدر سے استعمال کیا کشتوں  
 کے پستے لگا دیئے۔ خون کے دریا بہا دیئے۔ آبادیوں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ یہ  
 بربریت، یہ چنگیزیت انسان کی مشکلات کو حل کرنے کے نیک جذبہ کے تحت وا رکھی  
 گئی۔ اس کے باوجود کوئی گرہ کھلی نہیں، بلکہ اس میں مزید چسپیدیاں پیدا ہوتی گئیں۔  
 اس کے برعکس اسلام نے انسان کے بارے میں جو نئے نظریے بیان کیا، اس کے  
 پیچیدہ مسائل کو جس سادگی اور آسانی سے حل کیا، اس کو بھی آپ ملاحظہ فرما چکے۔

یہاں آپ کو افراط و تفریط کا کہیں نشان بھی نہیں ملے گا۔ ایک ظلم کو مٹانے کے لیے اس سے بھی زیادہ ظلم کو جائز نہیں رکھا گیا۔ ایک کو حق دلانے کے لیے دوسرے کی حق تلفی نہیں کی گئی۔ پھر اس دینِ حق کے نبی کریم ﷺ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے طفیل آپ کو ”امین“ بنایا گیا۔ زیبِ عنوان آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا ہے۔ ارشاد ہے :

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا

اے غلامانِ مصطفیٰ! ہم نے تمہیں ایک ایسی امت بنایا۔ جو راہِ اعتدال پر گامزن ہے، جس کا دامن افراط و تفریط کے بدنام داغوں سے آلودہ نہیں۔ جس کے نظامِ حیات میں عقل کی قلابازیوں کے المناک مناظر دیکھنے میں نہیں آتے اور اس کے ساتھ ہی اس امر کی بھی سراسحت کر دی کہ اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ اس نظامِ حیات کے مطابق ایسا معاشرہ وجود میں لاؤ، جس میں ایسے پاکیزہ نفوس آباد ہوں، جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ اور اس کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت کی شمع فروزاں ہو۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے لیے خلوص اور ہمدردی کے جذبات موجزن ہوں۔ جس معاشرہ کے افراد روشن دماغ بھی ہوں اور روشن ضمیر بھی۔ عدل اور مساوات کے جاں پرور، روح افروز مناظر قدم قدم پر دامنِ نگاہ کو اپنی طرف کھینچ رہے ہوں۔ جہاں نیکی کی مظلوم ہونہ ظالم۔ مادی ترقی بھی اپنے عروج پر ہو، اور دنیا سے روحانیت میں بھی بہار کا سماں ہو۔ وہاں بسنے والے دولت مند سخی اور کریم ہوں! اور فقر ان خودار اور بے نیاز ہوں۔ تب ہی تمہاری گواہی قابلِ قبول ہوگی اور اسی قسم کی گواہی ادا کرنے کی ذمہ داری ہم پر عائد کی گئی ہے۔ لَسْتُ كُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ



میں یہی حقیقت بیان کی گئی ہے۔

اسی مقصد کے لیے لاکھوں نوجوانوں نے پاکستان کے حصول کے لیے سروس کے نذرانے پیش کئے تھے۔ اپنے معصوم بچوں کو دشمنوں کی تلواروں کی دھار پر کٹتے دیکھا تھا اور وہ خوش تھے کہ انھوں نے بندگی کا حق ادا کر دیا۔ ان کے اس خلوص نے ہمیں پاکستان جیسا عظیم ملک دیا۔ اس کو اس نہج پر آباد کرنا ہماری ذمہ داری ہے اس لیے ہم اہل سنت نظام مصطفیٰ علیہ التحیۃ والتہار کے نفاذ کے لیے کوشاں ہیں اور جب تک اس منزل تک رسائی حاصل نہ کر لیں۔ اس وقت تک آرام کا سانس لینا ہمارے لیے جائز نہیں۔

وَيَكُونُ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا فَمَا كَرْتُمَا دِيَاكُم مِيرے اس دین کی تحانیّت کا سب سے بڑا گواہ میرا محبوب اور برگزیدہ بندہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہے۔ جن کو میں نے اولین و آخرین کا رسول بنا کر مبعوث فرمایا ہے، جس طرح حضور کے دین کی تحانیّت اور سچائی کے گواہ ہیں، اسی طرح قیامت کے روز اپنی امت کے اعمال حسنة کی بھی گواہی دیں گے، اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی گواہی پر ہی امت کی نجات اور بخشش کا دار و مدار ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے ان کلمات کی کیا بصیرت افروز تفسیر فرمائی ہے۔ اپنی تفسیر ”فتح العزیز“ میں لکھتے ہیں:

”باشد رسول شما بر شما گواہ زیراں تمہارا رسول تم پر گواہی دے گا کیونکہ وہ جانتے ہیں اپنی نبوت کے نور سے ہر متدین بدین خود، کہ در کدام اپنے دین کے ہر ماننے والے کے رتبہ

درجہ در دین من رسیدہ و کو میرے دین میں اس کا کیا درجہ ہے اور  
 حقیقت ایمان او چسیت و اس کے ایمان کی حقیقت کیا ہے اور وہ  
 حجاب لے کہ براں از ترقی محبوب کون سا پردہ ہے جس سے اس کی ترقی  
 ماندہ است کد ام است ، پس رکی ہوئی ہے۔ پس وہ تمہارے گناہوں  
 اومی شتاسد گناہاں شمارا، و کو بھی پہچانتے ہیں۔ تمہارے ایمان کے  
 درجات ایمان شمارا و اعمال درجات کو بھی تمہارے نیک و بد سارے  
 نیک و بد شمارا و اخلاص و اعمال کو، تمہارے اخلاص اور نفاق کو  
 نفاق شمارا۔ بھی خوب پہچانتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرماتے کہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریاں حسن و  
 خوبی سے انجام دیں، تاکہ اسلام کے بارے میں دشمنان اسلام کی پھیلائی ہوئی طرح  
 کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے اور لوگ اس چشمہ فیض سے فیضیاب ہو سکیں اور قیامت  
 کے دن بھی ہم اللہ کی جناب میں سرخروئی حاصل کر سکیں۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ. وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى سَيِّدِ  
 الْمُرْسَلِينَ وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ

# عدل و انصاف

قرآن کی روشنی میں،



ضیاء الامت پر محمد کرم شاہ ایم اے (الازہر) نے یہ مقالہ ۵ جون کو شام ہمدرد کے ایک بارونق اور پرفکار اجتماع میں سنایا۔ ہومل انٹرکانٹینٹیل لاہور میں منعقد ہونے والے اس اجتماع کا اہتمام محترم حکیم محمد سعید دہلوی (شمارۃ امتیاز) نے کیا۔ اور صدارت جسٹس بدیع الزمان کیکاؤس نے کی۔





الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى رَحْمَةِ  
رَبِّ الْعَالَمِينَ وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ

عدل و انصاف زندگی کی بوقلموں رعنائیوں اور دلاویزیوں کی جان ہے۔ اگر  
عدل و انصاف کے سوتے خشک ہو جائیں تو سارا گلشن ہستی اجڑ کر رہ جاتے۔ یہ  
ایک عالمگیر صداقت ہے، جو ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے اور جسے ہر کوئی تسلیم کرنا  
ہے، حتیٰ کہ وہ ظالم اور سفاک لوگ جن کی بربریت اور ستم رانیوں نے شرف انسانی  
کی دھجیاں اڑا دیں، وہ بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ عدل و انصاف سے ظلم و عدوان بہتر  
ہے، بلکہ جہاں تک ان سے بن پڑا، وہ اپنی چہرہ دستیوں کو بھی عدل و انصاف  
کا لباس پہنا کر پیش کرتے رہے۔

محترم جناب حکیم محمد سعید صاحب مدظلہ العالی نے مجھے ارشاد فرمایا ہے کہ میں  
اس باوقار محفل میں قرآن کریم کی روشنی میں عدل و انصاف کے موضوع پر اظہار خیال

کروں۔ اس عزت افزائی کے لیے میں ان کا از حد ممنون ہوں۔ خدا کرے میں ان کے  
حسن ظن پر پورا اتر سکوں۔

جب ہم اقوامِ عالم کے دساتیر اور قوانین پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں تو بجز حیرت و  
حسرت کے ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ حیرت اس لیے کہ انسانی عقل نے انھیں قبول  
کیونکر کیا اور حسرت اس بات پر کہ بے کس انسانیت پر عدل کے نام پر کتنے ظلم  
ہوتے رہے۔ ہر معاشرہ میں ہمیں جھوٹے امتیازات اور ظالمانہ مراعات کے ستم کے  
آباد نظر آتے ہیں۔ اور لوگ ہیں کہ فرط عقیدت سے ان کے گرد مصروفِ طواف میں  
جہاں یہ حالت ہو، وہاں عدل و انصاف کا فرضی وجود تو ہو سکتا ہے، لیکن اس کا  
حقیقی وجود نہیں پایا جاسکتا۔ جو خیرات و برکات کا سرچشمہ ہے، جس کے گھٹنے اور خنک  
سائے میں ستم رسیدہ انسانوں کو سکون نصیب ہوتا ہے۔

تین سو سال قبل مسیح بھارت میں برہمنی تہذیب اپنے شباب پر تھی۔ اسی زمانہ  
میں ہندی معاشرہ کے لیے ایک دستور مرتب کیا گیا، جس میں سیاسی، تمدنی اور  
اخلاقی قواعد و ضوابط کی وضاحت کر دی گئی۔ ملک بھر کے دانشوروں نے اسے بر نظر  
استحسان دیکھا اور اسے ایک قانونی دستاویز کی حیثیت سے قبول کر لیا۔ اس وقت  
سے لے کر آج تک ہندو دھرم کے پرستار اپنے تمام معاملات میں اس سے رہنمائی  
حاصل کرتے ہیں۔

اس دستور کے مصنف میں منوجی اور انہی کے نام پر اس کتاب کو منوشاستر  
کہا جاتا ہے، اس متفقہ طور پر منظور شدہ قانونی اور آئینی دستاویز نے اہالیانِ ہند کو  
چار طبقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ برہمن، کھشتری، ویش اور شودر۔

کے عنوان میں رقمطرازہ

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار

ہے:

کو ایک

”منوجی کے مرتب کردہ صحیفہ قانون

آسمانی تقدس حاصل ہو گیا۔ اس کے قوانین ہر شک و شبہ سے بالاتر اور تنقید سے ماوراء تھے۔ منوشاستر میں تمام طبقات کی درجہ بندی کر دی گئی اور تفصیل سے ہر طبقہ کے فرائض بیان کر دیئے گئے اور اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے سزائیں بھی مقرر کر دی گئیں۔ مقالہ نگار کے یہ جملے آپ کی خصوصی توجہ کے مستحق ہیں:

یعنی جرائم کا ارتکاب اگر برہمن کریں تو ان کی سزاؤں میں غیر معمولی نرمی ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اگر نچلے طبقہ کا کوئی فرد اعلیٰ طبقہ کے حقوق کو پامال کرے تو اس کے لیے بڑی وحشیانہ اور غیر انسانی سزائیں مقرر ہیں۔ معاشرہ میں مجرم کا درجہ جتنا گھٹیا ہو، اتنی ہی سزا سے سخت وہی جاتی ہے۔

اس کتاب کے دوسرے صفحہ پر مقالہ نگار نے یہ بھی لکھا ہے کہ منوکے آئین

کے مطابق شوروروں کو مذہبی تعلیم حاصل کرنے کا بھی حق حاصل نہیں۔ ایسا اجتماع جس میں بیچ قوم کا کوئی فرد موجود ہو، وہاں برہمن کو بھی اجازت نہیں کہ وہ مقدس کتابوں کی تلاوت کرے۔

ایک ہی قوم کے افراد میں قانون کی یہ نامہواری عدل و انصاف کے تصور کو ہی ختم کر دیتی ہے۔ البوریجان البیرونی نے اپنی زندگی کے پندرہ قسیمی سال ہندو مت کے مطالعہ میں صرف کئے۔ پھر بڑی دیانت اور ثقاہت کے ساتھ اپنی تصنیف، کتاب الہند میں اپنے مشاہدات کو قلمبند کر دیا۔ اس کی نگارشات کو بندہ فضلًا بھٹی تسلیم کرتے ہیں۔ ایسے ثقہ مورخ کا یہ اقتباس آپ کے لیے یقیناً مفید ہوگا۔ شور کے بارے میں لکھتے ہیں:

”شور کی حیثیت برہمن کے غلام کی ہے۔ اس کو برہمن کے کام میں مشرور رہنا اور اس کی خدمت کرنا چاہیے۔ ہر وہ کام جو برہمن ہی کے واسطے مخصوص ہے، مثلاً مال اچینا، وید پڑھنا اور آگ کی قربانی شور کے لیے منع ہے۔ اگر شور یا ویش کے متعلق یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے وید پڑھا ہے تو برہمن اس کی اطلاع حاکم کو دے اور حاکم اس کی زبان کاٹ دے“

اسی طرح البیرونی تیسویں باب میں سزاؤں اور کفاروں کا ذکر کرتے ہوئے

لکھتے ہیں:

”جرم کی یہ حالت ہے کہ اگر قاتل برہمن ہے مقتول دوسرے طبقہ کا تو قاتل پر کفارہ کے سوا کوئی سزا لازم نہیں ہے۔“

جناب عبدالمجید سالک اپنی کتاب مسلم ثقافت میں لکھتے ہیں:



”اگر کوئی برہمن کسی دوسری ذات کے آدمی کو قتل کر دیتا تو اس کو صرف برت، پیرا تھنا اور دان پن کرنا پڑتا۔ اس کے سوا اسے کوئی سزا نہ دی جاتی، دوسرے جرائم یہ تھے۔ گاوہتھیا، شراب خوری، زنا کاری، خاص کر اپنے باپ کی بیوی یا گورو کی استری کے ساتھ، لیکن کوئی راجاں جو لہم کی وجہ سے کسی برہمن یا کھستری کو سزائے موت نہ دیتا تھا، بلکہ اس کی جائیداد ضبط کر کے اسے ملک بدر کر دیتا۔“ صفحہ ۳۴

سالک صاحب منوسمیتی، باب اول منتر نمبر ۹۲ تا ۱۰۱ کے حوالہ سے برہمن کی برتری کے بارے میں لکھتے ہیں:

”منوجی نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ دنیا میں برہمن سے زیادہ برتر کوئی نہیں ہے۔ وہ دھرم کی مورت، نجات کا حقدار اور دھرم کے خزانے کا محافظ ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہے سب برہمن کے لیے ہے۔“  
منوسمیتی کے آٹھویں باب منتر ۳۶۴ میں مذکور ہے:

”زنا بالجبر کی سزا قطع عضو تناسل ہے۔ لیکن برہمن کو یہ سزا بھی نہ دی جائے کیونکہ اس کو سزائے جسمانی دینا قطعاً ممنوع ہے۔“

مختلف طبقات میں جو ظالمانہ امتیازات موجود تھے ان کا مختصر سا خاکہ آپ نے ملاحظہ فرمایا لیکن ایک طبقہ کے مرد و زن کے حقوق بھی یکساں نہ تھے۔ یہاں بھی بین تفاوت تھا اور اسے قانون کی پشت پناہی حاصل تھی۔ عورت خاوند کے تابع محل کی حیثیت رکھتی تھی۔ خاوند اسے جوئے میں داؤ پر لگا سکتا تھا اور جوار ہارنے والے کی عورت جیتنے والے کے تصرف میں چلی جاتی تھی اور قانون کو اس ظالمانہ

طریقہ کار پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ عورت جا بجا کی کامل مالک نہیں ہو سکتی تھی اگر کوئی عورت عنفوان شباب میں ہی بیوہ ہو جاتی تو اسے دوبارہ شادی کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اسے بیوگی کی بے آبرو مندانہ زندگی بسر کرنا پڑتی یا اپنے جوان سینے میں اپنی جوان امنگوں کو دبائے اس الاؤ میں کود جانا پڑتا جس میں اس کے خاوند کی لاش جل رہی ہوتی۔

حقوق و فرائض میں اس ظالمانہ تفاوت کو اہل ہند نے صدق دل سے تسلیم کر لیا تھا۔ کیا ایسے معاشرہ میں عدل و انصاف کی بالادستی قائم کی جاسکتی ہے اگر اسی ظلم و عدوان کو کوئی عدل و انصاف کہنے پر مصر ہو تو ہم اس کا کیسا بگاڑ سکتے ہیں۔

ایران ہزاروں سال تک مشرقی دنیا کی مستبد قیادت پر متمکن رہا۔ طبقاتی تقسیم جس کی چیرہ دستیوں کی المناک داستان ابھی آپ سن آئے ہیں۔ ایران میں بھی پوری قوت اور شدت کے ساتھ موجود تھی۔ ہندوستان میں برہمن کے ہاتھ صرف اقتدار تھا۔ کاروبار سلطنت اور تاج و تخت کے مالک راجے و مہاراجے ہوا کرتے تھے۔ یہاں مذہبی اور سیاسی دونوں اقتدار بیک وقت ساسانی خاندان میں مرکوز تھے اہل ایران کا یہ عقیدہ تھا کہ ساسانی فرماں روا اس شاہانہ شان و شوکت کے نمائندے ہیں۔ جو انھیں ہرمز (خدا) نے عطا کی ہے۔

انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا جلد ۱۷ صفحہ ۵۶۲ پر مرقوم ہے :

”اہل ایران کی روایات میں ہے کہ یہ آسمانی حکومت ایران میں صرف

اسی خاندان کو عطا ہوتی ہے۔ کوئی دوسرا ایرانی اس شرف میں ان کا

مساہم نہیں ہو سکتا۔ ان کے تراشے ہوئے مجسموں میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اردشیر اول یا شاپور اول ہرمز کے ساتھ ایک گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہیں۔ اور یہ خدا بادشاہ کوشہنشاہی کی انگوٹھی پہنا رہا ہے! اسی وجہ سے ایرانیوں کے نزدیک بادشاہی اس خاندان کا موروثی حق ہے کیونکہ ہرمز نے فقط اسی خاندان کوشہنشاہی کی انگوٹھی پہنائی ہے اور صرف اسی خاندان کو اپنی خدائی طاقتوں سے سرفراز کیا ہے۔

علامہ ابن جریر طبری نے بھی ایرانیوں کے اس نظریہ کو بیان کیا ہے اور اس کے بعد لکھا ہے:

”ایرانی اپنے بادشاہوں کو ہر قانون سے بالاتر اور ہر تنقید سے ماورا خیال کرتے تھے“

اب ذرا یونان کی اس سرزمین کی طرف عنانِ توجہ مبذول فرمائیے جہاں فلسفہ پیدا ہوا اور جس کی فضاؤں میں پروان چڑھا اور اپنے نامور فرزندوں کی عظیم کوششوں کے باعث یونانی فلسفہ کی روشنی سے نہ صرف یورپ بلکہ ایشیا اور شمالی افریقہ کے دور افتادہ ممالک کے درو دیوار بھی جگمگانے لگے۔ یونان کو بجا طور پر نازیہ ہے کہ اس نے سقراط، افلاطون اور ارسطو جیسے نابغہ روزگار فلاسفر پیدا کئے جن کی عبقریت اور غیر معمولی ذہانت کو دنیا بھر کے دانشور خراجِ پیش کرتے رہے ہیں اور پیش کر رہے ہیں۔ لیکن جب ہم دقتِ نظر سے ان عظیم دانشوروں کی تعلیمات کا غیر جانب دارانہ مطالعہ کرتے ہیں، تو ان کی اچھی باتوں کے ساتھ ساتھ ہمیں ایسے نرافات بھی ملتے ہیں جنہیں پڑھ کر عقلِ انسانی کی نارسائی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ ابونصر فارابی جو یونانی فلسفہ کا بہترین ترجمان اور قابلِ اعتماد مفسر ہے، اس نے

اپنے رسالہ میں افلاطون اور ارسطو کی آراء و نظریات میں تضاد دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس رسالہ کا نام کتاب ”الجمع بین زری الحکیمین“ ہے۔ میرے پاس اس کا وہ نسخہ ہے جو مطبع کا تو لیکر بیروت نے بڑی تحقیق اور اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے اس کا مقدمہ لبنان یونیورسٹی کے دکتور البیر نصری نادر نے لکھا ہے جو وہاں فلسفہ کے پروفیسر ہیں۔ پروفیسر مذکورہ اس کے مقدمہ میں لکھتے ہیں :

”افلاطون سے جب پوچھا گیا کہ ہم اپنے شہر کا نظم و نسق کس طرح چلائیں تاکہ وہ آبادی اور خوشحالی میں بام عروج تک پہنچ جائے اور اس میں عدل و انصاف کے تمام قواعد پر عمل ہو سکے۔

اس کے جواب میں افلاطون کہتا ہے کہ اس کے لیے اس شہر کے باشندوں کو تین طبقوں میں تقسیم کرنا چاہیے۔ حکام، لشکر اور عوام الناس پہلے دو طبقے اس مثالی شہر کے نگہبان ہیں۔ داخلی انتشار اور بیرونی حملوں سے بچانا ان کی ذمہ داری ہے۔ اس لیے ان دو طبقوں کی طرف خصوصی توجہ دی جائے اور ان کی خصوصی تربیت کا اہتمام کیا جائے۔ افلاطون پھر تاکید کرتا ہے کہ ان طبقوں کو ہر قسم کی مالی پریشانیوں سے بچانا حکومت کا فرض ہے۔ اس طرح حکومت پر لازم ہے، ان کے دلوں سے خاندانی جذبات کی بیخ کنی کر دے اور انہیں اپنا علیحدہ خاندان بنانے سے قانونی طور پر روک دے حکومت کو خوشگوار اوقات میں ایسے مذہبی تہوار منعقد کرنے چاہئیں، جن میں یہ چٹنے ہوئے مرد بخت و جمال میں ہر طرح ممتاز عورتوں کے ساتھ وقتی طور پر رشتہ ازدواج قائم کر سکیں اور اس کا مقصد

صرف حکومت کے لئے بہترین بچوں کا پیدا کرنا ہو۔ جب وہ عورتیں بچے  
 جنہیں تو ان بچوں کو ان سے لے لیا جائے اور تمام بچوں کو ایک مکان  
 میں رکھا جائے۔ وہ عورتیں اگر انہیں دودھ پلائیں اور کوئی عورت یہ  
 امتیاز نہ کرے کہ یہ کس کا بچہ ہے اور نہ ان کو پہچان سکے۔ اس طرح اس  
 طبقہ میں کوئی مخصوص رشتہ داری نہیں پائی جائے گی۔ وہ سب ایک  
 خاندان کے افراد شمار ہوں گے۔ سب کے ساتھ یکساں نوعیت کی  
 قرابت ہوگی۔

آخر میں افلاطون جیسا فیلسوف کہتا ہے کہ یہ آزادانہ اختلاط کرنے والے  
 مرد اور عورتیں ممتاز صلاحیتوں کے مالک ہوں گے اور ان کی اولاد بھی  
 یقیناً دوسرے لوگوں سے برتر اور اعلیٰ ہوگی۔

(کتاب الجمع صفحہ ۱۷۸، ۱۷۹)

افلاطون جیسے فلسفی کے یہ خیالات پڑھ کر سر جھکانے لگتا ہے، کیا یہ وہ شخص  
 ہے جس کی علمیت اور حکمت کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بج رہا ہے؟ کیا یہ وہ شخص  
 ہے جسے دنیا حکیم اور فیلسوف کہتی ہے؟ کیا انسانی نفسیات سے اس کی بخبری  
 کا یہ عالم ہے؟

ذرا آگے بڑھتے۔ افلاطون کے فلسفہ کے ایک گوشہ سے نقاب اٹھیے۔ وہاں  
 افلاطون حکیم کی بجائے آپ کو ایک جلاوطن نظر آتے گا۔ جس کا دل رحمت و شفقت کے  
 جذبات سے یکسر عاری ہے، جس کے سامنے عدل و انصاف کی بات کرنا بھی ان  
 الفاظ کی توہین ہے۔ پروفیسر مذکورہ ہی کے الفاظ میں افلاطون کے اس نظریہ کو

ملاحظہ فرمائیے :

فَإِنَّ وُلْدًا لِلشَّعْبِ وَوَالِدًا  
أَطْفَالٌ فِي غَيْرِ زَمَانٍ  
الْمُحَدَّدِ أَعْدَمُوا وَ  
كَذَلِكَ يُعَدُّمُ الطِّفْلُ  
نَاقِصُ الشُّكُونِ وَالْوَالِدُ  
فَاسِدُ الْخَلْقِ وَالرَّجُلُ  
الضَّعِيفُ عَدِيمُ النِّفْعِ  
وَالْمَرِيضُ الَّذِي لَا يُرْجَى  
لَهُ شِفَاءٌ لِأَنَّ الْغَايَةَ  
هِيَ أَنْ يَظَلَ عَدَدُ السَّكَّانِ  
فِي الْمُسْتَوَى الَّذِي يَكْفُلُ  
سَعَادَةَ الْمَدِينَةِ -  
(کتاب الجمع ص ۱۵)

اگر عوام الناس اور اہل شکر کے بچوں  
کی تعداد میں اضافہ ہو جائے اور مقررہ  
وقت میں وہ پیدا نہ ہوں تو انھیں  
قتل کر دیا جائے۔ اسی طرح وہ بچہ  
جو جسمانی طور پر ناقص ہے، وہ لڑکا  
جس کے اخلاق بگڑے ہوئے ہوں  
وہ کمزور مرد جس سے کوئی نفع نہیں،  
وہ بیمار جس کے تندرست ہونے کی  
کوئی امید نہیں (ان سب کو موت  
کے گھاٹ اتار دیا جائے) کیونکہ مقصد  
تو یہ ہے کہ اس مثالی شہر کے باشندوں  
کی تعداد اس سطح سے اوپر نہ ہو جن کی  
سعادت مندی کی ذمہ داری اٹھائی  
جاسکتی ہے۔

جو فلسفی بے گناہ بچوں کے قتل، بیماروں، لاپرواہوں اور کمزوروں کو متین کرنے  
کی یوں کھلی اجازت دے رہا ہے اور اپنے مثالی شہر میں عدل و انصاف کے قیام  
کی اولین بنیاد قرار دیتا ہے، اس سے عدل و انصاف کی توقع سادہ لوحی کی  
انتہا ہے۔

افلاطون کے بعد اس کا شاگرد ارسطو یونان کے افق پر حکمت و فلسفہ کا آفتاب بن کر طلوع ہوتا ہے اور اپنے استاد کے ان نظریات کی پرزور تردید کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

افلاطون نے بچوں کو ان کے والدین	فَقَدْ ظَنَّ افْلَاطُونٌ اَنَّ
سے منسوب کرنے کی مخالفت کی ہے	شَيْوَعِيَّةَ الْاَطْفَالِ تُوَسَّعُ
اور انہیں مشترکہ ماں باپ کی اولاد	دَائِرَةَ السَّعَاطِفِ لِكِنَّهَا
قرار دیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس	فِي الْحَقِيقَةِ تُوَدِّعِي
طرح باہمی محبت و پیار کا دائرہ وسیع	اِلَى اِنْتِفَاءِ الْمَحَبَّةِ
ہوگا۔ درحقیقت یہ سراپا افترا و بہتان	وَالْوَحْتِ اَمْرٍ لِذَاتِ
ہے۔ اس طرح تو محبت و احترام کے	الطِّفْلِ الَّذِي هُوَ
سارے جذبات نیست و نابود ہو جائیں	اَبْنُ الْجَمِيْعِ لَيْسَ
گے، کیونکہ جو بچہ سب کا ہوتا ہے وہ	اَبْنُ اَحَدٍ۔

کسی کا بھی نہیں ہوتا۔

(کتاب الجمع ص ۳۵)

ارسطو کے اپنے نظریات بھی کم تعجب انگیز نہیں۔ وہ اپنی کتاب ”السیاسة“ میں نوع انسانی کی یوں تقسیم کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

”بعض لوگ ایسے ہیں جو طبعاً احرار (آزاد) ہوتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں جو طبعاً غلام ہوتے ہیں۔ شمالی یورپ کے لوگ بہادری ضرور ہیں لیکن ذہانت اور سیاسی سوجھ بوجھ سے بے بہرہ ہیں۔ مشرقی ممالک کے لوگ ذکی اور ماہر تو ہیں، لیکن ان میں شجاعت کا

جو ہر مفقود ہے، لیکن یونانی (ارسطو کی اپنی قوم) ان دونوں خصوصیتوں کے مالک ہیں۔ یہ بہادر بھی ہیں اور ذکی اور فطین بھی۔ اس کے بعد ارسطو یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے:

إِذَا فَا لِيُونَانِي سَيِّدٌ حُرٌّ  
وَالْأَجْنَبِيُّ عَبْدٌ لَهُ، وَإِذَا  
يَسْتَعْبِدُ الْيُونَانِي أَخَاهُ  
بِأَيِّ حَالٍ - هَذِهِ فِكْرَةٌ  
الشَّعْبِ الْمُخْتَارِ قَلْبَهَا  
أَرِسْطُو أَوْلِيَّةٌ كُلِّيَّةٌ  
ضُرُورِيَّةٌ -

یعنی مندرجہ بالا تشریح سے یہ ثابت ہو گیا کہ اہل یونان سردار ہیں۔ آزاد ہیں اور باقی سب ملکوں کے باشندے ان کے غلام ہیں۔ کوئی یونانی، یونانی بھائی کو غلام نہیں بنا سکتا۔ یہی وہ شعب مختار (برگزیدہ قوم) کا نظریہ ہے۔ جسے ارسطو اولین ضرورت قرار

دیتا ہے۔ جس کی کلیت مسلم ہے۔ (کتاب الجمع صفحہ ۳۸، ۳۹)

جب ارسطو کے نزدیک یونانی سردار ہیں، آزاد ہیں اور باقی ساری قومیں ان کی غلام ہیں تو انسانی مساوات کا تصور کہاں سے آئے گا۔ مالک اور غلام میں، آزاد اور اسیر میں عدل و انصاف کا برقرار رکھنا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے: اپنی قومی برتری کا یہی جنون مختلف طالع آزمائوں کو مختلف اوقات میں براہِ نیچتہ کرتا رہا۔ اور وہ اپنی سیادت و برتری کا سکہ جمانے کے خبط میں انسانیت کو مصیبتوں اور ہلاکتوں کے شعلوں میں بھونتے رہے۔ ہٹلر کے دماغ میں جرمن قوم کی برتری کا خبط سما یا ہوا تھا، جس کے باعث اس نے ساری دنیا کو دوسری عالمگیر جنگ میں جھونک دیا۔ اموال و املاک کے نقصان کا تو اندازہ ہی نہیں لگایا جاسکتا۔ مرنے والوں



کی تعداد کروڑوں سے زیادہ ہے، صرف روس کے پچھتر لاکھ افراد ہلاک ہوئے اور  
۲۸ لاکھ جرمن لقمہ اجل بنے۔ کسی قوم کی برتری کا نظریہ جو ارسطو نے بڑے فلسفیانہ  
آب و تاب سے پیش کیا۔ اب تک سینکڑوں فتنوں کا باعث بنا، معلوم نہیں  
کتنے سر پھرے اسی قومی عصبیت اور برتری کا علم بلند کر کے انسانیت کو مصائب و  
آلام کے جہنم میں جھونکتے رہیں گے۔

یہ تو ہوا ارسطو کا سیاسی نظریہ۔ اب ذرا قانون کے بارے میں اس کی  
راے ملاحظہ فرمائیے۔ ارسطو کی مشہور کتاب ”السیاستہ“ کا ترجمہ پروفیسر احمد لطفی  
السید نے عربی میں کیا ہے، جو مصر میں شائع ہوا ہے۔ اس کے آٹھویں باب  
میں ارسطو لکھتا ہے :

یعنی قانون تمام اہل ملک کے لیے	إِنَّ الْقَانُونَ لَا يَنْبَغِي
یکساں نہیں ہوتا بلکہ اس کا مساویانہ	ضَرُورَةٌ أَنْ يُطَبَّقَ إِلَّا
انطباق صرف ان افراد پر ہوگا جو نسب	عَلَى أَفْرَادٍ مُتَسَاوِينَ
اور قابلیت کے لحاظ سے مساوی ہیں	بِالْمَوْلِدِ وَبِالْمَلَكَاتِ
رہا حکمران طبقہ، تو ان لوگوں کے لیے	غَيْرَ أَنَّ الْقَانُونَ لَمْ
قانون نہیں بنایا جاتا۔ بلکہ یہ لوگ بذات	يُشْرَعُ قَطُّ لِأَوْلِيَاءِ النَّاسِ
خود قانون ہیں۔ اور یہ کھلا مذاق ہے	أَلَا فَمَا إِذِ انْتَهَمَ لَهُمْ
کہ ان اکابر کو دستور کی پابندی پر	أَنْفُسُهُمُ الْقَانُونَ وَ
مجبور کیا جاتے۔	مِنَ السُّخْرِيَّةِ أَنْ يُجَادَلَ
(السیاستہ ص ۲۱)	أَخْضَاعُهُمْ لِلدُّسْتُورِ -

ارسطو نے اپنے نظریہ کو ثابت کرنے کے لیے ایک حکایت بیان کی ہے؛  
 نرگوشوں کا ایک جلسہ عام ہوا۔ جس میں ایک قرار داد منظور کی  
 گئی کہ تمام حیوانات میں مساوات کا قاعدہ جاری ہونا چاہیے جب  
 شیروں نے یہ ریزولیشن سنا، تو انھوں نے کہا، پہلے ہمارے جیسے  
 طاقت ور بچے اور تیز دانت لاؤ۔ پھر ہمارے ساتھ مساوات کا  
 مطالبہ کرو۔

انسانی مساوات کے نظریے کے متعلق اس سے بڑا مذاق اور کیا ہو سکتا ہے  
 اور جب یہ مذاق کرنے والا ارسطو ہو تو اس مذاق کی سنگینی کا اندازہ کون لگا  
 سکتا ہے۔ اسی کتاب کے صفحہ ۲۳۲ پر ارسطو امرار طبقہ کے تفوق کو قانونی تحفظ  
 دیتا ہے۔ اس کی عبارت سنتے؛

یہ عدل کے خلاف ہے کہ ایسے سردار	فَلَيْسَ مِنَ الْعَدْلِ قَتْلُ
کو کسی عامی کے بدلے میں قتل کیا جائے	مِثْلِ هَذَا السَّرِيِّ وَ لَا
یا اسے جلا وطن کر دیا جائے اور اسے	اِهْدَا رُحْقَه بِاللَّغْوِيبِ
عام لوگوں کی سطح پر اترنے پر مجبور کیا	وَ لَا اخْضَاعَهُ لِمُسْتَوَى
جائے۔	الْعَامَّةِ۔

ہندوستان میں برہمنوں کو جو قانونی امتیازات حاصل تھے، ان کے بارے  
 میں آپ سن چکے ہیں۔ یورپ کے پادریوں کو جو خصوصی مراعات حاصل تھیں،  
 اب ان کے بارے میں پروفیسر کینی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ پروفیسر  
 مذکور نے کتاب کے

صفحہ ۵ پر لکھتے ہیں :

قیسوں اور کلیسا کے پادریوں کو بے حد وقید خصوصی امتیازات حقوق حاصل تھے۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ عام عدالتوں کو ان کے محاسبہ کا اختیار نہ تھا۔ خواہ ان کے جرم کی نوعیت کتنی ہی سنگین ہو، ان کے لیے خاص عدالتیں تھیں جن کا صدر ایک پادری ہوا کرتا تھا مجرم پادری کو برمی ثابت کرنے کے لیے خاص وسائل سے کام لیا جاتا۔ اور اگر اس کو برمی کرنا کسی صورت میں ممکن نہ ہوتا، تو انھیں صرف یہ سزا دی جاتی کہ انھیں اپنے منصب سے گرا دیا جاتا۔ زیادہ سے زیادہ کچھ عرصہ کے لیے اسے قید کر دیا جاتا۔ کوئی حاکم خواہ اس کا بڑا عہدہ ہو، اس بات کا مجاز نہ تھا کہ ایسے پادری کو پھانسی کی سزا دے، جس نے ایک بے گناہ شخص کو دانستہ قتل کیا ہے۔

اب آئیے، ہادی برحق نبی الانبیاء علیہ التیمۃ والثناء نے تمام دنیا کے انسانیت کے لیے عدل و انصاف کا جو نظام پیش کیا، قرآن کریم کی روشنی میں اس کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ کس طرح ان بتوں کو پاش پاش کر دیا گیا جو سچے انصاف کے قیام میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ نیز کس طرح اس قوم کی ذہنی تربیت کی گئی جس نے اقامتِ عدل کا فریضہ ادا کرنا تھا۔ انسانی نفسیات کا کس طرح حقیقت پسندانہ محاسبہ کیا گیا ہے تعلیم و تربیت اور تنقید نظامِ عدل کے سارے مرحلوں کو جس عمدگی سے بیان کیا گیا ہے، اسے دیکھ کر یہ یقین آ جاتا ہے کہ قرآن کریم واقعی اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ وہ اللہ جو عالم الغیب والشہادۃ ہے، جو علیم بذات الصدور ہے

جو انک انت العزیز الحکیم کی شان کا مالک ہے۔

سب سے پہلے میں سورۃ الحجرات کی آیت نمبر ۱۳ ہدیہ ناظرین کرتا ہوں:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَا  
كُم مِّنْ ذَكَرٍ وَ أُنْثَىٰ وَ  
جَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ  
لِتَعَارَفُوا. إِنَّ أَكْرَمَكُمْ  
عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ. إِنَّ  
اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ

اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور  
ایک عورت سے پیدا کیا ہے۔ اور  
تمہیں مختلف خاندان بنا دیا ہے تاکہ  
تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ تم میں سب  
سے زیادہ عزت والا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ  
میں وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ  
پرہیزگار ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ سب

(الحجرات)

کچھ جاننے والا ہر چیز سے باخبر ہے۔

دو رجاہلیت کے عرب دیگر گونا گوں نرا بیوں کے ساتھ تفاقہ کی بیماری میں بری  
طرح مبتلا تھے۔ وہ اپنے آپ کو سب سے برتر، اشرف اور اعلیٰ خیال کرتے۔ ان  
سب میں قریش کے فخر و مباہات کی شان ہی نرالی تھی۔ جب مکہ فتح ہوا اور اس کی  
فضاؤں میں پرچم اسلام لہرا دیا گیا تو نبی رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے  
حضرت بلال کو حکم دیا کہ کعبہ کی چھت پر چڑھ جاؤ اور آذان دو۔ جب انہوں نے  
آذان دینی شروع کی، تو شرفاً قریش پر کوہ الم ٹوٹ پڑا۔ ان کے دلی حزن و ملال  
کا اندازہ اس مکالمہ سے لگائیے جو ان کے چند اکابر کے درمیان ہوا۔

عتاب بن اسید بولا: "اللہ کا شکر ہے کہ میرا باپ یہ روح فرسا منظر

دیکھنے سے پہلے مر گیا"

حارث بن ہشام کہنے لگا کہ اس کالے کو سے کے بغیر محمد (فداہ ابی و امی) کو اور کوئی مؤذن نہیں ملا۔

سہیل بن عمرو نے بڑی لمبی سے کہا: ”جیسے اللہ کی مرضی“  
اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور ان کے اس زعمِ باطل کو نیست و نابود کر کے رکھ دیا۔

وطنیت، قومیت، رنگ و نسل اور زبان کے بتوں کی پوجا آج بھی بڑے روز و شور سے ہو رہی ہے۔ اس مختصر سی آیت میں ان تمام بنیادوں کو منہدم کر کے رکھ دیا۔ صرف پرہیزگاری اور تقویٰ کو وجہ عزت و افتخار مانا گیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تقویٰ کی بنیاد پر جو معزز اور محترم ہوگا۔ وہ فخر و غرور سے یکسر پاک ہوگا۔ ایسے شخص کا وجود نہ صرف اپنی قوم کے لیے بلکہ ساری نوع انسانی کے لیے بھی خیر و برکت کا باعث ہوگا۔ حضور اکرم رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر بڑے اثر انگیز انداز میں انسانی مساوات کا درس دیا۔ فتح مکہ کے دن حضور نے اپنی اونٹنی قصویٰ پر سوار ہو کر طواف کیا۔ مطاف اور مسجد لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ اس وقت ارشاد فرمایا:

یَأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ اللَّهَ	اے لوگو! آج اللہ تعالیٰ نے تم سے
تَعَالَى قَدْ أَذْهَبَ عَنْكُمْ	عہد جاہلیت کی نخوت اور اپنے باپ
عُبِّيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَ	دادا پر فخر کرنے کی عادت دور کر دی
تَعَظَّمَهَا يَا بَنِيَّهَا. فَإِنَّاسُ	ہے۔ اب لوگوں کی صرف دو قسمیں ہیں
رَجُلَانِ - رَجُلٌ يَبْرَأُ تَقِيٌّ	ایک وہ جو نیکو کار ہے، پرہیزگار ہے

اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں معزز و مکرم

ہے۔ دوسرا وہ شخص جو فاسق ہے،

بدبخت ہے اور اللہ تعالیٰ کی جناب

میں حقیر و ذلیل ہے۔ (سن لو سائے

انسان آدم کی اولاد میں اور اللہ تعالیٰ

نے آدم کو مٹی سے پیدا فرمایا ہے۔

كِرِيمٌ عَلَى اللَّهِ تَعَالَى

وَ رَجُلٌ فَاجِرٌ شَقِيٌّ

هَيِّنٌ عَلَى اللَّهِ تَعَالَى۔

النَّاسُ كُلُّهُمْ بَنُو آدَمَ

وَ خَلَقَ اللَّهُ آدَمَ مِنْ

تُرَابٍ۔

حجۃ الوداع کے موقع پر حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہ خطبہ

بڑی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ ذرا صاحبِ جوامع الکلم کی فصاحت و بلاغت اور تقریر کی دلربائی و دلپذیری کی شان ملاحظہ فرمائیے، ارشاد ہوتا ہے:

اے لوگو! خوب سن لو! تمہارا پروردگار

ایک ہے۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی

فضیلت نہیں اور نہ کسی عجمی کو کسی

عربی پر برتری حاصل ہے۔ نہ کوئی

کالا کسی سرخ سے، اور نہ کوئی سرخ

کسی کالے سے افضل ہے مگر تقویٰ

کے ساتھ۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک

تم میں سے زیادہ معزز وہ ہے جو

زیادہ پرہیزگار ہے۔ کیا تم کو میں نے

پیغام پہنچا دیا، سب نے جواب دیا

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَلَا إِنَّ

رَبَّكُمْ وَاحِدٌ لَا فَضْلَ

لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَبِيٍّ وَ لَا

لِعَجَبِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ وَ لَا

لِأَسْوَدٍ عَلَى أَحْمَرَ وَ لَا

لِأَحْمَرَ عَلَى أَسْوَدٍ إِلَّا

بِالتَّقْوَى إِنَّ أَكْرَمَكُمْ

عِنْدَ اللَّهِ أَتَقَاكُمْ. أَلَا هَلْ

بَلَغْتُ قَالُوا بَلَى

يَا رَسُولَ اللَّهِ! قَالَ

فَلْيَبْلُغِ الشَّاهِدُ  
الْغَائِبَ -

بے شک۔ ارشاد فرمایا کہ جو لوگ یہاں  
موجود ہیں۔ وہ ان تک یہ پیغام پہنچا

دیں۔ جو یہاں حاضر نہیں۔

اس طرح ان تمام رکاوٹوں کو دور کر دیا گیا، جن کے باعث بہترین کوششوں  
کے باوجود نوع انسانی عدل و انصاف کی برکتوں سے بہرہ ور نہ ہو سکی۔ اب  
راستہ صاف ہے۔ ساری چٹانیں پاش پاش ہو چکی ہیں عدل و انصاف کا  
گلستان آباد کرنے کے لیے زمین بالکل تیار ہے۔ فرمان الہی نازل ہوتا ہے:

قُلْ أَصْرِي بِالْقِسْطِ -

اے محبوب! آپ اعلان کر دیجئے کہ

میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ

(الاعراف: ۲۹)

میں انصاف کروں۔

یہ حکم کسی معمولی ہستی کا نہیں بلکہ میرے رب کا حکم ہے۔ یہ حکم کسی ایسے شخص  
کو نہیں دیا جا رہا جو امثال امر میں سستی اور کاہلی روا رکھتا ہو۔ یہ حکم مجھے دیا جا  
رہا ہے جسے اپنے خالق کا بندہ ہونے پر ناز ہے اور جو ہر قیمت پر اس کے  
فرمان کی تعمیل کرنے کے لیے تیار ہے، اس لیے کوئی شخص اس غلط فہمی میں  
ببتلا نہ رہے کہ میں عدل و انصاف کی تنفیذ میں کسی قسم کی کمزوری یا کوتاہی  
روا رکھوں گا۔ یا کسی کے پاس خاطر کے لیے اپنے رب کے فرمان سے سرتابی  
کروں گا۔

اس کے بعد قرآن کریم کی یہ جامع آیت تلاوت فرمائیے:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ

بے شک اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ

وَ الْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ط

(النحل: ۹۰)

(ہر معاملہ میں انصاف کرو اور ہر ایک کے ساتھ بھلائی کرو۔ اور اچھا سلوک کرو۔ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اور منع فرماتا ہے بے حیائی سے بڑے کاموں سے اور سرکشی سے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں نصیحت کرتا ہے، تاکہ تم نصیحت قبول کرو۔

یہ آیت جب نازل ہوئی، تو اسلام کے کئی کینہ پرور دشمن اس کے اعجاز اور جامعیت کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ عکرمہ کہتے ہیں کہ حضور نے یہ آیت ولید بن مغیرہ کو پڑھ کر سنائی، تو اس نے کہا: یا ابنِ اخی! اعد، (میرے بھتیجے! ایک بار پھر پڑھو) حضور نے اسے پھر پڑھا، تو وہ دشمن اسلام اور منکر قرآن یہ کہنے پر مجبور ہو گیا۔

وَاللّٰهُ! اِنَّ لَهٗ لَحَلَاوَةٌ وَّ اِنَّ عَلَيْهِ لَطَلَاوَةٌ وَاِنَّ اَصْلَهٗ لَمُورِقٌ وَاَعْلَاهُ لَمُتَمَرٌّ وَاَمَّا هُوَ بِقَوْلِ بَشَرٍ

بخدا: یہ تو بڑا شیریں کلام ہے۔ اس کا ظاہر بڑا رنگیں ہے۔ اس کا تاپتوں والا ہے۔ اور اس کی شاخیں پھلوں سے لدی ہیں۔ بخدا یہ کسی بشر کا کلام نہیں۔

حضرت ابن مسعود نے اسے قرآنِ کہیم کی جامع ترین آیت قرار دیا ہے۔ حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے:

”العدل الانصاف، والاحسان التفضل“



یعنی عدل سے مراد انصاف کرنا، اور احسان سے مراد فضل و کرم ہے اور حقیقت یہ ہے کہ کسی معاشرہ کا صحت مند بنیادوں پر قائم ہونا انہی دو چیزوں پر موقوف ہے کہ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ قانون کے سامنے شاہ و گدا سب برابر ہوں۔ لیکن تنہا یہی کافی نہیں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ہر فرد اپنے دوسرے ساتھی کے ساتھ برتاؤ کرنے میں احسان کو بھی پیش نظر رکھے۔ اگر کسی سے کوئی کوتاہی سرزد ہو جائے تو عفو و درگزر سے بھی کام لے۔ اس طرح اس معاشرہ سے صرف یہ نہیں کہ حسد و عناد کے شعلے بجھنے نہ پائیں گے، بلکہ انس و محبت کی نسیم بھی ان کے غنچہ ہائے دل کو بستم آتشنا کرتی رہے گی۔

مندرجہ ذیل آیت میں مخاطب عوام نہیں، بلکہ خواص ہیں۔ جنہوں نے صدق دل سے اسلام کو قبول کیا ہے اور قرآن کے کلام الہی ہونے پر انہیں یقین محکم ہے، اس لیے اس کا اسلوب بیان ہی نرالا ہے، اس کا ہر کلمہ جلال و جمال خداوندی کا آئینہ دار ہے۔ اپنے پڑھنے والے کو یہ آیت مجبور کر دیتی ہے کہ ہر حالت میں وہ عدل و انصاف کے دامن کو مضبوطی سے قائم رہے واپس انصاف گرامی ہے:

یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا	اے ایمان والو! ہو جاؤ، مضبوطی سے
كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ	قائم رہنے والے انصاف پر، گواہی
شَاهِدَاءَ لِلَّهِ وَ لَوْ عَلَىٰ	دینے والے محض اللہ تعالیٰ کے لیے
أَنْفُسِكُمْ أَوْ الْوَالِدِينَ	چاہے گواہی دینا پڑے تمہیں اپنے
وَالْأَقْرَبِينَ إِن	نفسوں کے خلاف یا اپنے والدین اور

یٰۤاَکْفُرْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا  
 فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِمَا فَلَاحُ  
 تَتَّبِعُوْا الْاَلْوٰى اَنْتُمْ  
 تَعْدِلُوْا- وَاِنْ سَلُوْا  
 اَوْ تَعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ  
 كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ  
 خَبِيْرًا ط

قریبی رشتہ داروں کے خلاف جس کے  
 خلاف گواہی دی جا رہی ہے، وہ  
 دولت مند ہو یا فقیر، پس اللہ تعالیٰ زیادہ  
 خیر خواہ ہے، دونوں کا۔ نہ پیروی کرو  
 خواہش نفس کی، انصاف کرنے میں۔  
 اور اگر تم نے پیر پھیر کر دیا منہ موڑو تو  
 بے شک اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو

(اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔

(النساء: ۱۳۶)

اہل ایمان کو پہلے شرف مخاطب سے نوازا۔ اس کے بعد انھیں یہ اہم حکم دیا اس  
 فرمان خداوندی کے پہلے دو لفظوں میں جو شکوہ اور سطوت ہے اس پر بھی غور فرمائیے  
 ارشاد ہے: كُنُوْا قَوَّامِيْنَ بِالْقِسْطِ شٰهَدَآءُ لِلّٰهِ۔ راعے  
 میرے بندو! پوری قوت اور طاقت کے ساتھ انصاف کو قائم کرنے والے بن جاؤ، کسی قسم کے  
 ضعف اور کمزوری کا مظاہرہ مت کرو۔ یاد رکھو تمھاری یہ گواہی کسی انسان کے لیے  
 نہیں، اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ رحمت خداوندی نے اسی فرمان پر اکتفا نہیں کیا  
 بلکہ ان تمام کمزوریوں کی نشان دہی بھی کر دی، جن کی وجہ سے انسان حق کے  
 تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ وہ تمام محاذ جن سے شیطان کی یلغار  
 کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ان تمام سے مومن کو خبردار کیا جا رہا ہے اور اسے تاکید کی جا  
 رہی ہے کہ وہ ابلتس کی شکر کشی سے ہوشیار رہے۔ سب سے پہلا اور خطرناک  
 محاذ انسان کی ذاتی مصلحت اور عزت ہے۔ انسان اپنے فائدے کے لیے عام

حالات میں بڑی سے بڑی بے انصافی کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اپنی عزت کو بچانے کے لیے وہ جھوٹی گواہی دینے میں بھی جھجک محسوس نہیں کرتا۔ اس لیے تاکیدی حکم فرمایا کہ خبردار! تمہیں برقمیت پر عدل و انصاف کا علم بلند کرنا ہے۔ ہر حالت میں سچی گواہی دینا ہے، خواہ اس کی زد تمہاری اپنی ذات ہی پر کیوں نہ پڑے، اپنی ذات کے بعد والدین کا مقام ہے، وہ اس کے نزدیک محترم و مکرم بھی ہیں عزیز اور محبوب بھی نیز ان کے نفع و نقصان میں یہ برابر کا شریک ہے، ایسے موقع پر انسان کے ہاتھ سے عدل و انصاف کے دامن کا چھوٹ جانا بعید از امکان نہیں، اس لیے جھڑک دیا کہ خبردار کسی حالت میں بھی یہ اجازت نہیں دی جاسکتی کہ تم ظلم و عدوان کی راہ اختیار کرو، خواہ معاملہ تمہارے والدین کا ہی کیوں نہ ہو۔ قریبی رشتہ داروں کے بارے میں بھی اسی قسم کی صورت حال رونما ہوتی ہے فرمادیا، کوئی قرابت، کوئی رشتہ انصاف کے قیام میں مت حائل ہونے پائے۔

مندرجہ بالا موانع کے علاوہ کبھی یہ خیال انسان کو اظہارِ حق سے روک دیتا ہے کہ جس کے خلاف میں گواہی دے رہا ہوں، وہ امیر کبیر ہے اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ کسی غریب کی مسکنت اور غربت کا احساس انسان کے دل میں رحمت و شفقت کے جذبات ابھار دیتا ہے۔ اور اس غریب کے خلاف سچی بات کہنے سے اس لیے ہچکچاہٹ ہوتی ہے کہ کہیں اس غریب کو نقصان نہ پہنچے، انسانی نفسیات کا کتنا دقیق محاسبہ ہے، ہدایت فرمائی، عدالت میں کھڑے ہو کہ ان احساسات کو بالکل دل سے نکال دو کسی کے نفع و نقصان کی پروا کئے بغیر

سچی بات کہو اور عدل و انصاف قائم کرو۔ فاللہ اولیٰ بیلہا۔ کتنا پیارا جملہ ہے۔  
یعنی تم کسی کی خیر خواہی بھلا کیا کرو گے۔ تم اپنا فرض ادا کرو اپنے رب کا حکم مانو، تم سے  
زیادہ اللہ تعالیٰ خود ان دونوں (غریب و امیر) کا خیر خواہ ہے۔

آیت کریمہ کا یہ پریشکوہ اور دلفریب انداز کیا بندۂ مومن میں یہ جرأت پیدا  
نہیں کر دیتا کہ وہ تمام امتیازات کو پس پشت ڈالتے ہوئے تمام تعلقات کو نظر انداز  
کرتے ہوئے عدل و انصاف کی بالادستی کو قائم کرے اور کسی قیمت پر ایسی بات  
زبان پر نہ آئے جو انصاف کے قیام میں رکاوٹ بن جائے۔

کفار عرب کی قوت دم توڑ رہی ہے، اسلام کی روز افزوں ترقی اور مقبولیت  
نے ان کو بالکل کھوکھلا کر دیا ہے۔ اب ان میں اپنے دفاع کی سمیت بھی نہیں  
رہی۔ کفر و گمراہی کی طویل رات سحر آشنا ہونے والی ہے۔ وہ صبح سعید طلوع ہونے  
والی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کا محبوب اور اس کی مخلوق کا ہادی اپنے جانفروش  
مجاہدین کے ساتھ فاتحانہ انداز میں مکہ داخل ہو گا۔ مسلمانوں کے مکمل غلبہ کے قرائن  
اب ہر شخص کو نظر آ رہے ہیں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ یہ آیت نازل فرماتا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا	اے ایمان والو! ہو جاؤ مضبوطی سے
کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ	قائم رہنے والے اللہ تعالیٰ کے لیے
شٰہِدًاۗۤ اَوْ بِالْقِسْطِ وَاٰ	گواہی دینے والے، انصاف کے
یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ	ساتھ اور ہرگز نہ اکٹھے تمہیں کسی
عَلٰی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اَعْدٰکُمْ	قوم کی عداوت اس بات پر کہ تم
ہُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ؕ وَا	عدل کیا کرو، یہی تقویٰ سے زیادہ

وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ  
خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝

قریب ہے اور ڈرتے رہا کرو۔ اللہ تعالیٰ  
سے بے شک اللہ تعالیٰ خوب خبردار  
ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔

(المائدہ، ۸)

اس آیت میں پہلے ہی تہنیت فرمادی کہ قوت و اقتدار اہل ایمان کو عطا ہونے  
والا ہے۔ اس لیے نہایت وضاحت سے انہیں حکم دیا کہ خبردار کسی قیمت پر انصاف  
کا دامن تمہارے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پاتے جب تم اپنے دشمن سے بھی معاملہ کرو،  
تو پھر بھی عدل و انصاف کے اصولوں کی پابندی کرو۔ اللہ تعالیٰ اسلامی مملکت  
کے بانیوں کو یہ تلقین فرما رہا ہے کہ جب وہ کرسی صدارت پر بیٹھیں تو دوست اور  
دشمن کی تمیز کیے بغیر عدل و انصاف کو قائم کریں۔ یہی تقویٰ کی روح ہے اسی مفہوم  
کی ایک اور آیت بھی سماعت فرمائیے۔

سَمِعُونَ لِلْكَذِبِ  
أَكْثَالُونَ لِلْحَقِّ فَإِنْ  
جَاءُوكَ فَاحْكُمْ  
بَيْنَهُمْ أَوْ أَعْرِضْ عَنْهُمْ  
وَإِنْ تَعْرِضْ عَنْهُمْ  
فَلَنْ يَضُرُّوكَ شَيْئًا  
وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ  
بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ إِنَّ  
اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝

قبول کرنے والے ہیں جھوٹ کو۔ بڑے  
حرام خور ہیں۔ تو اگر وہ (کوئی مقدمہ  
لے کر) آپ کے پاس آئیں تو چاہے  
فیصلہ فرمائیے ان کے درمیان یا ان کے  
منہ پھیر لیں، آپ کو اختیار ہے۔ اور  
آپ اگر ان سے منہ پھیر لیں تو وہ آپ  
کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔  
اور اگر آپ فیصلہ کریں تو فیصلہ فرمائیے  
ان کے درمیان انصاف سے۔ بے شک

اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے

محبت کرتا ہے۔

یہ ارشاد یہود کے بارے میں ہے جو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اذیت پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ جن کی عہد شکنی اور خیانت کے باعث مسلمانوں کو بڑے جاں گسل حالات سے دوچار ہونا پڑا، فرما دیا کہ اگر ایسے سفہ مزاج دشمنوں کے درمیان کبھی کسی متاثرہ کا فیصلہ فرمائیں تو میزان عدل کا پڑا ہرگز جھکنے نہ پاتے۔ اگر کفار مکہ اور یہودیوں جیسے دشمنوں کی سخی تلفی کی قرآن کریم اجازت نہیں دیتا، تو پھر اور کون سا ایسا دشمن ہے جس کی دشمنی کے باعث ایک مومن انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے میں تساہل سے کام لے۔ قرآن کریم کے نزدیک عدل و انصاف کا دائرہ فقط ان معاملات تک ہی محدود نہیں، جو معاملات عدالت میں پیش ہوتے ہیں یا کسی بین الاقوامی کونسل میں زیر بحث آنے والے ہوں۔ قرآن کریم ان بظاہر غیر اہم معاملات میں بھی عدل و انصاف پر پابندی کا حکم دیتا ہے، جن کا تعلق ہماری خانگی یا خاندانی یا کاروباری زندگی سے ہے، جن کے بارے میں کسی عدالت میں رجوع کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ فرمان الہی ملاحظہ ہو:

وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ

إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ

حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ

وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ

اور مت قریب، جاؤ یتیم مال کے

مگر اس طریقہ سے جو بہت اچھا ہو۔

یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے

اور پورا کروناپ اور تول انصاف کے

بِالْقِسْطِ لَوْ نَكَلَّفْنَا نَفْسًا  
 إِلَّا وُسْعَهَا وَإِذَا قُلْتُمْ  
 فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ  
 ذَا قُرْبَىٰ وَبِعَهْدِ اللَّهِ  
 أَوْفُوا ذَٰلِكُمْ وَصَّوْكُمْ  
 بِهِ نَعَلَمُ تَذَكَّرُونَ ط

ساتھ ہم کسی کو تکلیف نہیں دیتے مگر  
 جتنی اس کی طاقت ہے اور جب کوئی  
 بات کہو تو انصاف کی کہو، اگرچہ کسی  
 رشتہ دار کا معاملہ ہو، اور اللہ تعالیٰ سے  
 کئے ہوئے وعدہ کو پورا کرو۔ یہ ہیں وہ  
 باتیں جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے تاکہ

تم نصیحت قبول کرو۔

(الانعام: ۱۵۲)

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ ان امور میں بھی عدل و انصاف کا حکم دیا جا رہا ہے جو  
 بظاہر بالکل معمولی اور غیر اہم دکھائی دیتے ہیں، کیونکہ قرآن کریم اسلامی معاشرہ کے  
 کسی گوشہ میں بھی ظلم و عدوان کو برداشت نہیں کرتا۔ وَبِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا کے  
 کلمات میں غور فرمائیے۔ یاد دلایا جا رہا ہے کہ اسلام قبول کرتے وقت تم نے میرے  
 احکام کی تعمیل کا پختہ وعدہ کیا تھا۔ ہوشیار، اس پر اچھ نہ آتے پاتے، ہر قیمت پر  
 اس وعدہ کو پورا کرو۔

کسی معاشرہ میں عدل و انصاف کا قیام خلفاء اور امراء کی اولین ذمہ داری ہوتی  
 ہے۔ اس لیے ان کو خصوصی تاکید کی گئی ہے کہ وہ اپنی اس ذمہ داری سے عمدتاً  
 ہونے میں تساہل سے کام نہ لیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو حکم دیا جا رہا ہے،  
 اے داؤد! ہم نے آپ کو زمین میں  
 خلیفہ بنایا ہے۔ پس آپ لوگوں کے  
 درمیان حق اور انصاف سے فیصلہ کیا

بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ  
فِيضْلِكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ

کہیں اور خواہش کی پیروی ہرگز نہ کریں  
ورنہ تمہیں راہِ خدا سے ہٹا دے گی۔

(ص: ۲۶)

جب ایک صاحبِ کتاب رسول کو عدل و انصاف سے حکومت کرنے کا  
سنتمی حکم دیا جا رہا ہے، جب اسے ہوائے نفس کی پیروی سے روکا جا رہا ہے تو اور  
کون ہے جسے ظلم کرنے کی اجازت ہو جس کی ذاتی خواہشات اور شخصی مفادات  
پر عدل و انصاف کو قربان کیا جاسکے۔

خلفاءِ اسلام، مملکتِ اسلامیہ کے حکام، قضاة اور قائدین کو حکم دیا جا

رہا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ  
تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ  
أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ  
بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا  
بِالْعَدْلِ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا  
يَعِظُكُمْ بِهِ إِنَّ اللَّهَ  
كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا

بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے  
کہ امانتوں کو ان لوگوں کے سپرد کرو  
جو ان کے اہل ہیں اور جب بھی لوگوں  
کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل و انصاف  
سے فیصلہ کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ  
تمہیں بہت ہی اچھی بات کی نصیحت  
کرتا ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ سب کچھ

سننے والا ہے چیز دیکھنے والا ہے۔

(النساء: ۵۸)

ادائے امانت کا مفہوم یہاں بہت وسیع ہے، اپنی ذمہ داریوں کو محنت  
اور دیانت سے ادا کرنا، حکومت کے عہدوں پر تقرر کے لیے کنبہ پروری اور



دوست نوازی کے بجائے صرف اہلیت و قابلیت کو معیار قرار دینا بھی اس حکم کی تعمیل میں داخل ہے۔ اس کے ساتھ ہی فرمایا کہ جب تم عدالت کی کرسی پر بیٹھو اور لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ کرنے لگو، تو عدل و انصاف کے اصولوں کو قطعاً نظر انداز نہ کرو۔ اِنَّ اللّٰهَ نَعِيْمًا يَعِظُكُمْ بِهٖۙۙ میں اپنے بندوں کی جس طرح دینوازی فرمائی گئی ہے، کون ہے جو اس نکتہ کو سمجھے اور جھوم نہ اٹھے۔ فرمایا تمہارے رب کریم نے یہ نصیحتیں جو تمہیں کی ہیں۔ یہ تمہارے لئے از بس مفید اور باعث برکت ہیں۔ جب تک تم ان ہدایات پر کار بند رہو گے، تمہارا آفتاب اقبال نصف النہار پر چمکتا رہے گا۔

جی تو چاہتا ہے بوستان نبوت کے رنگین اور مہکتے ہوئے پھولوں کے گلہ سے بھی پیش کروں، لیکن وقت کی تنگ دامانی اس کی اجازت نہیں دیتی صرف دو ارشادات رسالت پر اکتفا کرتا ہوں شاید کسی غافل کی آنکھ کھل جائے۔  
حضرت معقل بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے اللہ کے پیارے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔

مَا مِنْ عَبْدٍ يَسْتَوْعِيهِ	یعنی وہ بندہ جس کو اللہ تعالیٰ کسی
اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ رَعِيَّةً	رعیت کا والی بناتا ہے اور وہ اس
يَمُوتُ يَوْمَ يَمُوتُ وَ	حالت میں مرتا ہے کہ وہ اپنی رعیت
هُوَ عَاشٍ رَعِيَّتَهُ إِلَّا	کے ساتھ دھوکہ اور فریب کر رہا ہے،
حَمًّا اللَّهُ عِنْدَ	تو اللہ تعالیٰ اس پر بہت سزا کر دیتا
الْجَنَّةِ	ہے۔

حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں :

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى  
اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
صِنْفَانِ مِنْ أُمَّتِي لَنْ  
تَنَالَهُمَا شَفَاعَتِي إِمَامُهُ  
ظُلُومٌ غَشُومٌ وَكُلُّ  
عِيْنِي حَضْرَةُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَظَرَتْ  
فَرَمَا مِيرِي أَمْتِ كَ دَوَائِي كَرُوهُ هِي  
جَن كُو مِيرِي شَفَاعَتِ نَصِيْبِ نَهِيْسِ  
هَوَكِي . وَهُ فَرَمَانِرُو اِجُو ظَالِمٍ اَوْر خَائِنٍ هُو  
اَوْر وَهُ شَخْصٌ جُو دُجُو كَرْنِ دَالَا اَوْر دِيْنِ

غَالِ مَارِقِ - کی صدوں کو توڑنے والا ہونا۔

کثیر آیات اور صد ہا احادیث سے صرف چند چیزیں آپ کے سامنے کی گئی ہیں، ہر حق شناس پر یہ بات اظہر من الشمس ہو گئی ہوگی کہ عدل کا جو جامع نظریہ اسلام نے پیش کیا ہے، اس کی نظیر دنیا کے قدیم و جدید وسایر اور مجموعہ ہائے قوانین پیش نہیں کر سکتے۔ صرف اسلامی نظامِ عدل کی برتری گذشتہ زمانوں تک محدود نہیں بلکہ انسانیت کا کارواں چودہ سو سال بعد بھی اس مقام پر نہیں پہنچ سکا جس پر نبی امی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیضِ نگاہ اور حسن تربیت سے عرب کے اکھڑ مزاج جاہل بدو پہنچ گئے تھے۔

یہ تو ہوا اس مسند کا نظری پہلو، اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جو قوم قرآن کی آغوش میں پروان پڑھی، جس کے قلب و نگاہ کو آفتابِ نبوت نے روشن کیا، ان کی عملی زندگی کیسی تھی۔ عدل و انصاف کے قرآنی نظام کو انہوں نے کس طرح اپنے معاشرہ میں نافذ کیا۔

بڑے اہتمام کے ساتھ تاریخِ اسلام کے صرف چند ورق آپ کے سامنے

کھول کر رکھتا ہوں، حجۃ الوداع کے موقع پر حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم زمانہ جاہلیت کی تمام قبیح رسوم کا قلع قمع کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

وَإِنَّ رَبَّ الْجَاهِلِيَّةِ  
مَوْضُوعَةٌ وَإِنَّ أَوْلَ  
رَبِّ أَبَدُءُ بِهِ رَبِّ أَعْمَى  
الْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ  
وَإِنَّا دِمَاءُ الْجَاهِلِيَّةِ  
مَوْضُوعَةٌ وَإِنَّ أَوْلَ  
دَمٍ أَبَدُءُ بِهِ دَمَ عَامِرِ  
بْنِ رَبِيعَةَ بْنِ الْحَارِثِ  
بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ۔

میں جاہلیت کے تمام سود کو کالعدم قرار  
دیتا ہوں اور سب سے پہلے میں اپنے  
چچا عباس کے سود کو کالعدم قرار دیتا ہوں  
نیز عہد جاہلیت میں جو خونریزیاں ہوئیں  
میں ان کو بھی کالعدم قرار دیتا ہوں اور  
سب سے پہلے میں اپنے چچا زاد ربیعہ  
بن حارث کے بیٹے عامر کا خون کالعدم  
قرار دیتا ہوں۔

اس سے بھی زیادہ ایمان افروز اور روح پرور منظر اس وقت دکھائی دیتا ہے  
جب اللہ تعالیٰ کا پیارا رسول اس دار فانی سے رخصت ہونے والا ہے، رفیق  
اعلیٰ سے ملنے کا وقت آ گیا ہے۔ مسجد نبوی میں مسلمانوں کا ہجوم ہے، حضور بیماری  
کی حالت میں تشریف لاتے ہیں۔

أَيُّهَا النَّاسُ مَنْ كُنْتُ  
جَلْدُتَهُ ظَهْرًا فَهَذَا  
ظَهْرِي فَلْيَسْتَقِدْ مِنْهُ  
وَمَنْ كُنْتُ شَمْتُ لَهْ

اے لوگو! اگر میں نے کسی کی پیٹھ پر کبھی  
کوئی درہ مارا ہے تو یہ میری پیٹھ حاضر  
ہے۔ وہ مجھ سے بدلہ لے سکتا ہے۔ اگر  
میں نے کسی کو بُرا بھلا کہا ہے تو میری

عَرَضًا فَهَذَا عَرَضِي  
 فَلَيْسَتْ قَدْ مِثِّي وَ مَنْ  
 أَخَذَتْ لَهُ مَالًا فَلِذَا  
 مَالِي فَلْيَأْخُذْ مِنْهُ  
 وَلَا يَخْشَى الشَّحْنََاءَ  
 فَهِيَ لَيْسَتْ مِنْ  
 شَأْنِي -

آبرو حاضر ہے، وہ اس سے انتقام  
 لے سکتا ہے۔ اگر میں نے کسی کا مال چھینا  
 ہے تو میرا مال حاضر ہے، وہ اس سے  
 اپنا حق لے سکتا ہے، اور تم میں سے  
 کوئی یہ اندیشہ نہ کرے کہ اگر کسی نے  
 انتقام لیا تو میں اس سے ناراض ہوں  
 گا، میری یہ شان نہیں ہے۔

آپ خود سوچئے کہ جب اللہ تعالیٰ کا پیارا حبیب اور اہل ایمان کے ایمان  
 کی جان محمد مصطفیٰ علیہ الطیب التہیۃ واجمل الثناء اپنی ذات اقدس کو اپنے خاندان  
 کو اور اپنے اقربا کو قانون شرعی سے بالاتر نہیں سمجھتا تو قیامت تک آنے والا  
 کوئی کلمہ گو خواہ اس کا سیاسی یا ادبی مقام کتنا ہی اونچا ہو، اپنے آپ کو قانون  
 سے بالاتر سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔

عہد رسالت میں متعدد ایسے واقعات ہوئے کہ معزز اور طاقت ور قبیلہ کے کسی  
 فرد نے کسی کمزور پر دست تعدی دراز کیا، لیکن جب عدل کا وقت آیا، تو حضور صلی  
 اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان امتیازات کو پرکاش کیا اور وقت بھی نہ دی۔  
 حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نصر کی بیٹی ربیع نے ایک لڑکی کے وانت  
 توڑ دیئے۔ ربیع کے گھر والوں نے اس لڑکی سے عفو و درگزر کی درخواست کی۔  
 لیکن اس کے گھر والوں نے معاف کرنے سے انکار کر دیا، انھوں نے معاوضہ  
 دے کر صلح کرنا چاہی، لیکن یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہوئی۔ بارگاہ رسالت میں

اگر انھوں نے فریاد کی اور عرض کیا کہ ہم تو ربیع سے اپنی بچی کا قصاص ہی لیں گے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ربیع، اس کے باپ اور اس کے خاندان کی وجہت و وقار کو نظر انداز کرتے ہوئے فیصلہ فرمایا کہ ربیع سے قصاص لیا جائے حضرت انس کہتے ہیں، میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! کیا ربیع جیسی شریف زادی کے وراثت توڑ دیئے جائیں گے، حضور نے جواب دیا، كِتَابُ اللَّهِ الْقِصَاصُ۔ (اے انس! قصاص لینا اللہ کا حکم ہے)، اس میں ہیر پھیر ممکن نہیں۔ پچنانچہ جب اس عورت کے خاندان والوں نے عدل و انصاف کی اس بالادستی کو دیکھا، تو ان کا غصہ فرو ہو گیا اور انھوں نے خوش دلی سے ربیع کی خطا معاف کر دی۔

اسی طرح عہد رسالت کا ایک مشہور واقعہ ہے، جسے آپ بارہا سن چکے ہوں گے۔ بنی مخزوم کی ایک عورت نے کسی کا زیور چرا لیا، حضور نے اس پر چوری کی حد قائم کرنے کا حکم دیا۔ مہاجرین نے حضرت اسامہ کو سفارش بنی بنا کر بھیجا اسامہ کی بات سن کر فرط غضب سے حضور کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا۔ فرمایا، اے اسامہ! کیا تو اللہ تعالیٰ کی حد کے قائم کرنے کے بارے میں سفارش کرتا ہے۔ تم سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ان قوموں کو ہلاک کر دیا جن میں اگر کوئی شریف زادہ چوری کرتا تو اس کو معاف کر دیتے اور اگر کوئی ضعیف یا کمزور شخص چوری کا ارتکاب کرتا تو اس پر حد قائم کی جاتی۔

اقسیم عدل و انصاف اور کثوٰر فضل و احسان کے فرمانروا نے فرمایا،

وَ اِنَّ لِّوَالِدِ لِّكَ فَاطِمَةً  
بِنْتِ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ  
خدا کی قسم! بفرضِ محال اگر میری اپنی  
لختِ جگر فاطمہ بھی اس جرم کی مرتکب

لَقَطَعَتْ يَدَهَا۔ ہوتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔

صَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَعَلَىٰ آلِهِ أَفْضَلَ الصَّلَاةِ وَأَجْمَلَ

التَّسْلِيَمَاتِ۔

عہدِ فاروقی میں حضرت عمرو بن عاص مصر فتح کرتے ہیں، حضرت فاروقِ اعظم نے انھیں وہاں کا گورنر مقرر کر دیا۔ ان کا ایک لڑکا جس کا نام محمد تھا۔ اسے گھڑ دوڑ کا بڑا شوق تھا۔ ایک مصری نے ان کے ساتھ گھوڑا دوڑایا اور جیت گیا۔ مصر کے فاتح اور گورنر کے بیٹے کو بڑا غصہ آیا اور اسے کئی بید رسید کئے اور کہا: خُذْهَا وَأَنَا ابْنُ الْأَكْرَمِينَ۔ (کہ اور بید کھاؤ۔ تم مجھے نہیں پہچانتے میں بڑے معزز و محترم آباؤ اجداد کا پشیم و چراغ ہوں۔) مصری مار کھانے کے بعد داری کے لیے مدینہ طیبہ پہنچتا ہے، اور عدالتِ فاروقی کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ اس کی فریاد سن کر حضرت فاروقِ اعظم اپنا قاصد مصر روانہ کرتے ہیں، تاکہ وہ عمرو بن عاص اور ان کے بیٹے محمد کو ساتھ لے کر فوراً حاضر ہو۔ چند روز کے بعد دونوں مدینہ طیبہ پہنچ گئے اور عدالتِ فاروقی میں پیش کئے گئے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا شاگردِ رشید اور جانشین، حضرت عمر فاروقِ فاتحِ مصر کے بیٹے اور ایک عام مصری کے مقدمہ کی سماعت کر رہا ہے۔ آپ نے بلند آواز سے کہا: این المصری؟ (وہ فریاد کرنے والا مصری کہاں ہے؟) وہ حاضر ہوتا ہے اور اس کے ہاتھ میں اپنا درہ دیتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ فاضلِ بربہا ابنِ الْأَكْرَمِينَ، کہ معزز و محترم آباؤ اجداد کے اس پشیم و چراغ کو کوڑے لگاؤ، جس طرح اس نے تجھے کوڑے لگائے تھے، وہ کوڑے لگا رہا ہے۔ عمرو بن عاص اپنے بیٹے کو پٹتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، لیکن کسی کو مجالِ دم زدن نہیں۔ فاروقِ اعظم

فرماتے جاتے ہیں: "اے مصری! اور مار، اور مار،" جب مصری اپنے دل کی بھڑاس نکال چکا، تو آپ نے کہا:

اب ذرا فاتح مصر کی بھی خبر لو۔ ان کے بیٹے نے تجھے مارنے کی  
جرات اس لیے کی کہ وہ اپنے آپ کو مصر کے فاتح اور گورنر کا بیٹا  
سمجھتا تھا۔

مصری عدل و انصاف کے اس نرے منظر کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ عرض  
کرنے لگا۔

اے امیر المؤمنین! جس نے مجھے مارا ہے میں نے اس سے بدلہ لے

لیا۔ اس میں عمرو بن عاص کا کوئی قصور نہیں۔

حضرت فاروق اعظم غصہ سے عمرو بن عاص کی طرف دیکھتے ہیں اور ایک جملہ  
ان کی زبان سے نکلتا ہے جس میں اسلامی فتوحات کا فلسفہ اور روح سمٹ کر آ  
گئی ہے:

يَا عَمْرُو! هَيْتِي تَعَبَدْتُمْ

اَلنَّاسَ وَ قَدْ وُلِدْتَهُمْ

اُمَمَاتُهُمْ اَحْرَادًا۔

اپنا غلام سمجھ لیا ہے۔

اسی طرح کا ایک اور تاریخ ساز واقعہ عہد فاروقی میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔

غسان کا آخری بار شاہ جبکہ بن ایہم اسلام قبول کرتا ہے اور فریضہ حج ادا کرنے

کے لیے مکہ مکرمہ آتا ہے۔ وہ بیت اللہ کا طواف کر رہا ہے۔ اس کی قیمتی چادر پر

ایک بدو اپنا پاؤں رکھ دیتا ہے۔ جبکہ مڑ کر دیکھتا ہے، غصہ سے بے قابو

ہو جاتا ہے اور اس بدو کو زور سے طمانچہ رسید کرتا ہے، جس سے اس کی ناک، زخمی ہوتی ہے اور اس کے اگلے دو دانت ٹوٹ جاتے ہیں، وہ بدو امیر المومنین کے پاس حاضر ہو کر فریاد کرتا ہے۔ آپ جبکہ کو بلاتے ہیں اور اسے کہتے ہیں کہ یا تو اس بدو سے معافی مانگ لو اور اسے راضی کر لو، ورنہ قصاص کے لیے تیار ہو جاؤ۔

جبکہ یہ بات سن کر حیران ہو جاتا ہے اور فرط حیرت سے پوچھتا ہے کہ کیا اس معمولی بدو کے لیے مجھ بادشاہ سے قصاص لیا جائے گا۔ آپ نے فرمایا: اسلام قبول کر لینے کے بعد اب تم دونوں یکساں ہو گئے ہو۔ اب برتری کا معیار صرف تقویٰ ہے۔“

جبکہ کہنے لگا کہ میں نے تو اسلام اس نبیال سے قبول کیا تھا کہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ وقار نصیب ہو گا۔ آپ نے فرمایا: ”جبکہ یہ نادانوں کی سی باتیں چھوڑ دو،“ اس نے جب دیکھا کہ امیر المومنین اس سے قصاص لینے پر مہربان ہیں، تو اس نے عرض کیا، مجھے آج رات سوچنے کی مہلت دیجئے۔ رات کو ہی وہ اپنے ساز و سامان اور ہمراہیوں سمیت وہاں سے بھاگ کر قسطنطنیہ چلا گیا اور عیسائی بن گیا۔

حضرت فاروق اعظم نے ایک بادشاہ کا مرتد ہونا گوارا کر لیا، لیکن قرآن کریم کی تعلیمات پر حرف نہ آنے دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ جس قرآن کی روشنی سے ہمارا عصۂ حیات منور ہے، وہاں شاہ و گدا میں کوئی فرق نہیں۔ اگر اسلام کو قوت و عظمت کا راز کسی بادشاہ یا بادشاہ زادے کے مسلمان ہونے میں مضیہ نہیں بلکہ اس کے ابدی اور انہی قواعد میں مضمر ہے، جہاں عدل و انصاف کے راستے میں



حائل ہونے والی ہر کاوٹ کو ریزہ ریزہ کر دیا جاتا ہے۔

خلافت راشدہ کے عہدِ ہمالیوں کے بعد بھی مسلمان خلفاء اور قاضیوں میں ایسی برگزیدہ ہستیاں بکثرت ملتی ہیں، جن کا وجود ظلمتِ کدہ عالم میں بھی ہدایت کا روشن مینارہ ہے۔

عباسی خلافت کا آفتاب اپنے شباب پر ہے۔ قاضی کو فہ شرح کی عدالت میں ایک غریب عورت حاضر ہوئی اور اس نے فریاد کی، مجھ پر ظلم کیا گیا۔ داد رسی فرمائیے۔ قاضی نے پوچھا: تم پر کس نے ظلم کیا ہے؟ اس خاتون نے کہا کہ امیر المؤمنین کے عم زاد موسیٰ بن عیسیٰ نے مجھ پر زیادتی کی ہے۔ فرات کے کنارے میرا ایک کچھوؤں کا باغ تھا جو مجھے اپنے باپ سے ورثہ میں ملا تھا۔ میں نے اور میرے بھائیوں نے اسے آپس میں تقسیم کر لیا۔ میں نے اپنی حد پر ایک دیوار تعمیر کر لی۔ شہزادہ موسیٰ نے میرے بھائیوں سے ان کا حصہ خرید لیا اور میرا حصہ بھی خریدنا چاہا۔ میں رضامند نہ ہوئی۔ رات کے وقت اس نے اپنے نوکر بھیج کر اس دیوار کو مسمار کرادیا۔ اب مجھے معلوم نہیں کہ میرا کونسا حصہ ہے۔ قاضی شریح نے اسی وقت اپنے ایک خادم کو حکم دیا کہ فوراً جاؤ اور امیر المؤمنین کے عم زاد موسیٰ کو عدالت میں حاضر کرو۔ وہ خادم گیا، قاضی کا حکم سنایا۔ موسیٰ غصہ سے پیچ و تاب کھانے لگا اور حکم دیا کہ پولیس افسر کو میرے پاس لاؤ، جب وہ آیا تو اسے کہا کہ فوراً قاضی شریح کے پاس جاؤ اور کہو کہ تم نے ایک عورت کی بات سن کر میرے خلاف وارنٹ جاری کر دیتے۔ یہ کسی طرح درست نہیں۔ پولیس افسر نے جانے سے معذرت کی۔ موسیٰ کے مجبور کرنے پر اسے جانا پڑا۔ جب وہ قاضی کے پاس گیا، اور موسیٰ کا پیغام سنایا تو

قاضی نے حکم سنایا کہ پولیس افسر اور اس کے سپاہیوں کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا جاتے۔ حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔ موسیٰ کو جب پتہ چلا تو وہ غصہ سے بے قابو ہو گیا۔ خود جیل میں گیا اور دروازہ کھول کر ان سب کو رہا کر دیا۔ جیل کے داروغہ نے تشریح کو صورت حال سے مطلع کیا۔ قاضی نے اپنے خادم کو کہا کہ اٹھو ہم بغداد جاتے ہیں۔ بخدا ہم نے خلیفہ سے درخواست نہیں کی تھی کہ وہ ہمیں قاضی بناتے، بلکہ خلیفہ نے مجبور کیا تھا، اور اس کی ضمانت دی تھی کہ اگر ہم اس کی پیشکش قبول کر لیں، تو ہماری عزت و وقار کا وہ خود ضامن ہوگا۔

قاضی جب عازم بغداد ہوا۔ امیر موسیٰ کو اطلاع ملی تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ دوڑا دوڑا پیچھے گیا۔ اور قاضی تشریح کی منتیں سمجھتے ہوئے لگا۔ قاضی نے کہا کہ جب تک تم میرے حکم کی تعمیل نہیں کرو گے، میں واپس نہیں جاؤں گا۔ اس نے یقین دلایا کہ وہ ان کے ہر حکم کی تعمیل کرے گا۔ چنانچہ آپ واپس کو فو آئے۔ اس عورت کو بلایا اور کہا کہ یہ تیرا مجرم موسیٰ تیرے سامنے کھڑا ہے۔ اب تم اپنا دعویٰ پیش کرو اس نے اپنی داستان سنائی۔ موسیٰ نے اس کی تصدیق کی۔ قاضی نے حکم دیا کہ جو تم نے اس سے چھینا ہے وہ واپس کرو اور اس کی دیوار از سر نو تعمیر کرو۔ موسیٰ نے تعمیل حکم کا وعدہ کیا۔ پھر قاضی نے عورت سے پوچھا۔ کیا تیرا کوئی اور مطالبہ ہے۔ عورت نے سراپا شکر و افسان بن کر کہا: میرا اور کوئی مطالبہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو برکت دے اور آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ قاضی نے کہا، اب تم جا سکتی ہو۔ جب وہ عورت واپس چلی گئی، اس وقت اپنی نشست سے اٹھے۔ شہزادے کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے پاس بٹھایا اور کہا: السَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا

الامیر، کوئی حکم ہو تو ارشاد فرمائیے۔

شہزادہ ہنس دیا اور کہا: میں آپ کو کیا حکم دے سکتا ہوں، قاضی نے کہا: اے شہزادے! مظلوم کی فریاد رسی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اس میں میں سر مو کو تاہی نہیں کر سکتا۔ شہزادہ سراپا ادب بن کر کھڑا ہو گیا اور کہا کہ بے شک جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرتا ہے بڑے بڑے جابر اور طاقتور لوگ بھی اس کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں۔

گبن اپنی تاریخ کی مشہور کتاب (رومن امپائر) کی چھٹی جلد میں لکھتا ہے کہ ایک دن سلطان محمود غزنوی اپنے دیوان میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی رعایا کا ایک غریب آدمی اس کے تخت کے سامنے مؤدب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اور شکایت کی کہ ایک تزکی سپاہی نے اس کو اس کے گھر سے نکال دیا ہے۔ اور اس کی بیوی پر قبضہ کر لیا ہے۔ محمود نے اس کی شکایت سن کر کہا، اب صبر سے کام لو، رونا چلانا چھوڑ دو، جب دوبارہ وہ آئے تو مجھے اطلاع دو۔ میں بنفس نفیس وہاں پہنچ کر تیری داد رسی کروں گا۔ تین روز بعد مجرم دوبارہ رات کو اس کے گھر میں داخل ہوا تو وہ بھاگا ہوا سلطان محمود غزنوی کے پاس آیا۔ سلطان چند سپاہیوں کو ہمراہ لے کر اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر مکان کے ارد گرد پہریدار متعین کر دیئے۔ تمام روشنیاں بجھا دی گئیں اور اعلان کر دیا کہ یہ نابکار گردن زدنی ہے، کیونکہ یہ موقع پر بدکاری کرتا ہوا پکڑا گیا ہے۔ جب اسے کیفر کردار تک پہنچا دیا تو پھر چراغ روشن کر دیئے گئے۔ مقتول کو دیکھ کر محمود نے سجدہ شکر ادا کیا۔ سجدہ سے سر اٹھانے کے بعد اس نے کہا کہ اگر گھر میں کھانے کے لیے کچھ ہے تو پیش کرو۔ اس غریب آدمی نے روکھی

سوکھی روٹی لاکر اس کے سامنے رکھ دی جس کو سلطان نے بڑی رغبت سے کھایا پھر محمود سے اس حیرت انگیز طریقہ کار کے بارے میں پوچھا گیا، تو سلطان نے جواب دیا: ”مجھے خیال گذرا، مبادا میرے کسی بیٹے نے ایسی جرات کی ہو۔ میں نے چیراغ گل کرنے کا حکم دیا تاکہ اگر اس حرام کاری کا مرتکب میرا کوئی بیٹا ہو تو شفقتِ پدری قیامِ عدل میں رکاوٹ نہ بنے۔ میرے انصاف کو نابینا اور بے رحم ہونا چاہیے۔ جب سے اس شخص نے اپنی داستانِ غم مجھے سنائی، مجھے اتنا دکھ ہوا کہ میں نے تین دن سے کوئی چیز نہیں کھائی۔“

آخر میں اسلامی ہند کی تاریخ کا ایک ورق آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں یہ واقعہ علامہ اقبال علیہ الرحمہ نے اپنے مخصوص انداز میں ”اسرار و رموز“ میں لکھا ہے کہ ”سلطان مراد نے اقلیمِ حند سے ایک ماہر معمار بلوایا اور اسے مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ جب مسجد تعمیر ہو چکی تو سلطان مراد اسے دیکھنے کے لیے آیا۔ بادشاہ کو مسجد کی عمارت پسند نہ آئی۔ اس نے غصہ میں آکر معمار کا ہاتھ کاٹ دیا۔ حضرت علامہ کے وقت انگریز الفاظ میں یہ قصہ سنئے :

جوتے خون از ساعدِ معمار رفت

پیش قاضی ناتواں و زار رفت

یعنی معمار کے بازو سے خون کی ندی جاری ہو گئی اور اس بے چارگی اور خشگی کی حالت

میں وہ قاضی کے سامنے پیش ہوا۔

گفت اسے پیغام حق گفتار تو

حفظ آیتن محمد کار تو

دھماکے نے کہا: اے قاضی! تیری گفتگو اللہ تعالیٰ کا پیغام ہے اور تیرا فرض منصبی آئین  
مصطفیٰ علیہ التبیۃ والتنار کی حفاظت کرنا ہے۔

سفتہ گوشس سطوت شاہاں نیم

قطع کن از روئے قرآن دعویم

میں بادشاہوں کی عظمت کا غلام نہیں ہوں۔ میرے دعویٰ کا فیصلہ قرآن کی رو سے کرو۔

قاضی نے اسی وقت ورائٹ جاری کئے اور بادشاہ کو اپنی عدالت میں طلب

کیا۔

زنگ شاہ از ہیبت قرآن پرید

پیش قاضی چوں خطا کاران رسید

(قرآن کی ہیبت و جلال سے بادشاہ کا زنگ فق ہو گیا اور خطا کاروں کی طرح

قاضی کی عدالت میں حاضر ہوا۔)

علامہ فرماتے ہیں: اس وقت ایک عجیب مسحور کن منظر تھا۔

ایک طرف فریادی دعوے گرے

ایک طرف شاہنشاہ گردوں فرے

(ایک طرف فریادی کھڑا ہے اور دوسری طرف صاحب شوکت و جبروت

بادشاہ ہے۔)

بادشاہ نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔ اور اپنی ندامت و نچالت کا اظہار

کیا۔

گفت قاضی فی القصاص آد حیات

زندگی گیرد بایں قانون ثبات

قاضی نے کہا کہ اب تم سے قصاص لیا جائے گا۔ اور اس قانون پر عمل کرنے سے ہی زندگی کو استحکام نصیب ہوتا ہے۔

عبد مسلم کمتر از احسار نیست

خون شدہ زخمیں تراز معمار نیست

عدالت کے سامنے غلام اور آزاد دونوں یکساں ہیں۔ معمار کے بازو سے بہنے والا خون اتنا ہی سُرخ ہے جتنا بادشاہ کا خون سُرخ ہے۔

چوں مراد این آئیہ محکم شنید

دستِ خویش از آستین بیرون کشید

بادشاہ مراد نے قرآنِ کریم کی جب یہ آیت سنی تو بر سرِ سیم خم کرتے ہوتے اپنا ہاتھ اپنی آستین سے باہر نکالا تاکہ اس کو کاٹ دیا جائے۔

مدعی را تاب خاموشی نماند

آئیہ بالعدل والاحسان خواند

یہ منظر دیکھ کر مدعی کو یار سے ضبط نہ رہا۔ فوراً اس نے یہ آیت پڑھی۔ اِنَّ اللّٰهَ

يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ اَلَا يَهْدِي

گفت از بہر خدا بخشید مشن

از برائے مشن بخشید مشن

دسمار کہنے لگا، میں نے اللہ تعالیٰ کے لیے اس کو بخش دیا، میں نے محمد مصطفیٰ

کے صدقے اس کو معاف کر دیا۔)

اس واقعہ کو ختم کرتے ہوئے علامہ فرماتے ہیں:

یافت مورے بر سلیمان نے نطفہ  
سطوتِ آئینِ پیغمبرِ نگر

(خاتم النبیین رحمۃ للعالمین کے آئین کی سطوت و ہیبت کا اندازہ لگاؤ کہ بیونٹی نے

سلیمان پر کامیابی حاصل کر لی۔)

پیشِ قرآن بندہ و مولے یکے ست

بوریا و مسندِ دیا یکے ست

وَ اٰخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ

عَلٰى رَسُوْلِهِ وَعَلٰى اٰلِهِ وَصَحْبِهِ اَجْمَعِيْنَ ط



حضور کا معاشی انقلاب  
صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ









انسان نہ صرف روح کا نام ہے نہ فقط جسم کا بلکہ دونوں کے مجموعے کو انسان کہا جاتا ہے، اس لیے نوع انسانی کا عالمگیر اور ابدی دین وہی ہو سکتا ہے جو روح اور جسم دونوں کے تقاضوں کو پورا کرے۔ جو دونوں کی نشوونما اور بالیدگی کا ضامن ہو۔ دونوں میں باہمی کش مکش اور محاذ آرائی کو ختم کرے اور ان میں ایسی ہم آہنگی پیدا کر دے کہ دونوں ایک ہی راہ پر ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں رہیں۔ مذہب کے نام پر نظامہائے حیات اس وقت موجود ہیں وہ مادی نظامہائے فکر سے مات کھا چکے ہیں ماننے والوں سے تقاضا نہیں کر سکتے کہ وہ بے راہروی کو چھوڑ دیں، ان کا مطالبہ صرف اتنا ہے کہ اس مذہب کا لیبل اپنے اوپر چسپاں کئے رکھیں اس کے بعد جو جی میں آئے کریں، شراب پیئیں، جو اکیلیں، قمار بازی کے لیے بے شک عالی شان کا زینو تعمیر کریں، شبیہ کلبوں میں داد عیش دیں، ننگے ناچ ناچیں حیوانی جذبات کی تسکین کے لیے بے شک وہ غیر حیوانی طریقے اختیار کریں جتنی کہ مرد، مرد کے ساتھ بر ملا شادیاں رچائیں، انھیں قانونی جواز اور عدالتی تحفظ میسر آجائے، وہ سودی کاروبار کریں، جس طرح جی میں آئے ضرورت مندوں کا خون

چوتے رہیں، مذہب کوئی مزاحمت نہ کرے گا۔ مغربی یورپ اور امریکہ وغیرہ میں عیسائیت کی بے بسی اور مجبوری کو دیکھ کر باشعور انسان کی آنکھوں سے خون کے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں۔

رہے موجودہ دور کے مادی نظام، تو ان کے علم برداروں کے نزدیک انسان کے انسانی پہلو کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ انہوں نے اس کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ رہا انسان کا حیوانی پہلو، تو اس میں بھی سرمایہ داری اور اشتراکیت کے نظاموں میں جو خوفناک تصادم برپا ہے اس نے انسانیت کا حلیہ بگاڑ دیا ہے بلکہ اس کی ہڈیاں پیس کر رکھ دی ہیں۔ دونوں فریق ایک دوسرے کو تھس تھس کرنے کے لیے اپنے جنگی ذخائر میں ہر آن مہلک ترین اسلحہ کا اضافہ کرتے جا رہے ہیں۔ جب بھی کسی نے بٹن دبایا، تو دنیا بھر میں ایک ایسا کھرام مچے گا جو مشرق و مغرب دونوں کو تباہ و برباد کر دے گا۔

نظام سرمایہ داری اگر انسان کی محنت اور عرق ریزی کو کوئی وقعت نہیں دیتا تو اشتراک کی کمیپ انسان کی حریت ضمیر اور آزادی فکر کو برداشت نہیں کرتا اور اسے آہنی زنجیروں میں جکڑ دینے کے درپے ہے۔

اس ہنگامہ دار و گیر میں کہیں امید کی کرن نظر آتی ہے تو وہ سید کائنات فخر موجودات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین فطرت ہے جسے ہم اسلام کے نام سے پہچانتے ہیں۔ میں یہاں بڑے اختصار کے ساتھ ان خطوط کا اجمالی تذکرہ کروں گا جو اس دین حنیف نے انسانی زندگی کو متوازن خوشحال، پاکیزہ اور بابرکت بنانے کے لیے پیش کئے ہیں۔

دیگر مذاہب کی طرح اسلام نے انسان کی جسمانی زندگی، اس کے تقاضوں اور اس کی مادی ضرورتوں کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا۔ یہ نہیں کہا کہ آخرت کی زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے ترک دنیا ناگزیر ہے۔ اپنے ماننے والوں کو جنگلوں، پہاڑوں، ویران جزیروں میں بھاگ جانے کی ہرگز اجازت نہیں دی۔ اسلام کے نزدیک انسان میں مستور ممکنہ قوتیں فقط اسی وقت بیدار ہوتی ہیں جب وہ کش مکش حیات میں بھرپور حصہ لیتا ہے۔ اس کی توانائیوں کی آزمائش کے لیے حادثات سے ٹکرانا ضروری ہے زندگی کی گراں باریوں سے نجات حاصل کر کے کسی گوشہ عافیت میں پناہ لینا مومن کے لیے جائز نہیں، اس کے ہادی برحق نے وضاحت سے فرمادیا: "لَا دَهْبَانِيَّةً فِي الْاِسْلَامِ" اس لئے قرآن کریم اور احادیث نبوی میں بڑے شوق آفریں انداز میں کسب مال کتاب دولت اور حصول منفعت کی دعوت دی گئی ہے۔

ارشاد گرامی ہے :

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ  
فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ  
وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ  
یعنی جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو  
زمین میں بھیل جاؤ اور اللہ تعالیٰ کے  
فضل کو تلاش کرو۔

پیناچہ اس آیت میں مال کو فضل الہی فرما کر اس کی عزت افزائی کی گئی ہے۔

اسی طرح سورہ فاطر میں ارشاد ہے :

وَتَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ  
مَوَآخِرَ لِّتَبْتَغُوْا مِنْ  
فَضْلِهِ لَعَلَّكُمْ  
یعنی تو کشتیوں کو دیکھتا ہے کہ وہ پانی  
کو چہ کر جا رہی ہیں تاکہ تم اس کا  
فضل تلاش کرو اور تاکہ تم اس کا شکر

یہاں بھی مال کو اپنا فضل فرمایا ہے۔ سورہ نسا میں مال کو زندگی کا سہارا کہا گیا، اور ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے اموال احمقوں اور نادانوں کے سپرد نہ کر دو تاکہ وہ سوئے تصرف سے تمہیں زندگی کے اس سہارے سے محروم نہ کر دیں۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَلَا تَوَدُّوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالِكُمْ  
الَّتِي جَعَلَ اللهُ لَكُمْ  
قِيَامًا۔

تم اپنے اموال نادانوں کو نہ دو جسے  
اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے سہارا  
بنایا ہے۔

احادیث طیبہ میں بھی مسلمانوں کو کسبِ حلال کی رغبت دلائی گئی ہے حضور  
کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

طَلَبُ الْحَلَالِ وَاجِبٌ عَلَى  
كُلِّ مُسْلِمٍ ط

رزقِ حلال کی تلاش ہر مسلمان پر  
فرض ہے۔

ایک اور مقام پر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

طُوبَى لِمَنْ طَابَ كَسْبُهُ  
وَصَلَحَتْ سَرِيرَتُهُ وَ  
كَرُمَتْ عَلَانِيَتُهُ وَعَزَل  
عَنِ النَّاسِ شَرًّا۔

یعنی وہ انسان بڑا فیروزِ بخت اور اجند  
ہے جس نے پاکیزہ مال کمایا، جس کا  
باطن نیک اور جس کا ظاہر محترم ہے  
اور اس نے لوگوں کو اپنی شرانگیزی  
سے محفوظ کر دیا۔

ایک صحابی کے ہاتھ کو دیکھا کہ وہ محنتِ مزدوری کرنے سے سوج گیا ہے۔

ارشاد فرمایا:

تِلْكَ يَدٌ يُجِبُّهَا  
اللَّهُ وَرَسُولُهُ.  
یعنی کسب رزق میں مزدوری کرنے  
سے سوچ جانے والا ہاتھ وہ ہاتھ  
ہے جسے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول  
پسند فرماتا ہے۔

ان آیات اور احادیث سے واضح ہو گیا کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو کسب  
مال سے روکتا نہیں ہے بلکہ رغبت دلاتا ہے اور ان کی جدوجہد کو عزت و  
احترام کی نظر سے دیکھتا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ مال کمانے کی کھلی اجازت  
نہیں دے دیتا، بلکہ اکتسابِ مال کے بعض ذرائع کو جائز قرار دیتا ہے اور بعض  
کو ناجائز۔ وسائلِ معاش میں جائز اور ناجائز، حلال اور حرام کی اساس یہ ہے کہ  
تمام وہ ذرائع جن میں وہ دوسرے شخص کی ضرورت، مجبوری سادہ لوحی یا ناتجربہ  
کاری سے ناجائز فائدہ اٹھایا گیا ہو یا دھوکہ دہی یا جبر سے کسی کا مال ہتھیایا  
گیا ہو۔ وہ تمام وسائل شرعیات میں ممنوع اور خلاف قانون ہیں، سود، جوا،  
ذخیرہ اندوزی، رشوت، بلیک مارکیٹنگ اور دیگر ہر قسم کی دھاندلیاں اسلام  
کے نزدیک حرام ہیں۔ ان ذرائع سے کمایا ہوا، روپیہ اگر خدا کی راہ میں بھی خرچ کر  
دیا جائے تو اس کی پذیرائی نہیں ہوتی۔ ایسے رزق سے جسم میں جو قطرہ خون بنتا  
ہے اور جو گوشت پوست کی صورت اختیار کرتا ہے، ارشادِ مصطفوی کے مطابق  
وہ جہنم میں جلیا جاتے گا۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ حضور سرورِ دو  
عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا يَغِيظَنَّ جَامِعُ الْمَالِ مِنْ  
 غَيْرِ حِلِّهِ أَوْ قَالَ مِنْ غَيْرِ  
 حَقِّهِ فَإِنَّهُ إِنْ تَصَدَّقَ  
 بِهِ لَمْ يُقْبَلْ مِنْهُ وَمَا  
 بَقِيَ كَانَ زَادَةً إِلَى النَّارِ۔  
 وہ آدمی جو حرام ذریعہ سے مال جمع کرتا  
 ہے وہ خوش نہ ہو، اگر وہ اس سے  
 خیرات بھی کرے گا تو وہ ہرگز قبول  
 نہیں کی جائے گی اور جو باقی رہے گا  
 وہ جہنم کے لیے زادِ راہ ثابت ہوگا۔

يَا كَعْبَ بْنَ عَجْرَةَ إِنَّهُ  
 لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ لَحْمٌ  
 نَبَتَ مِنْ سُحْتِ ط  
 لے کعب بن عجرہ، وہ گوشت جو حرام  
 رزق سے پیدا ہوا ہو وہ جنت میں  
 داخل نہیں ہوگا۔

دولت کی کثرت اور فراوانی قلب و ذہن میں بسا اوقات بڑے ناخوشگوار  
 تاثرات پیدا کر دیتی ہے کم ظرف انسان دولت کو ہی شرفِ انسانی کا معیار سمجھنے  
 لگتے ہیں۔ ہر وہ شخص جو دولت میں ان سے فروتر ہو، ان کی نگاہوں میں گھٹیا اور  
 حقیر دکھائی دینے لگتا ہے۔ دولت کی حرص تیز تر ہو جاتی ہے، وہ دولت آفرین  
 ہاتھوں کو صحیح معاوضہ دینا بھی گوارا نہیں کرتا۔ وہ اپنی دولت کے بل بوتے پر محسوم  
 عصمتوں کو داغدار اور محترم حقوق کو زک پہنچانے سے باز نہیں آتا۔ وہ اپنے آپ  
 کو سب سے زیادہ زیرک اور دانشور شمار کرنے لگتا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ فتور  
 بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ خدا کے نزدیک وہی برگزیدہ خلاق ہے اور وہ جو کچھ بھی کرتا ہے  
 بارگاہِ الہی سے اسے سندِ جواز حاصل ہے۔ وہ ملکی دولت کے سارے سوتوں کا  
 رُخ زور و جبر سے یا مکر و فریب سے اپنی طرف پھیرنے میں سرگرم ہو جاتا ہے۔

اس کی آتش جوع ہر دم بھڑکتی رہتی ہے، اس کی تشنہ لہی میں ثروت کی بے پناہ کثرت کے باوجود کوئی کمی نہیں ہوتی۔ اسلام ایسے انسان کو اپنے معاشرہ میں ہرگز گوارا نہیں کرتا۔ وہ اپنے ماتنے والوں کی ابتداء سے ہی ایسی تربیت کرتا ہے۔ اور ان کو ایسی راہ پر گامزن کرتا ہے کہ اس کی زندگی میں ایسا کوئی مرحلہ نہ آئے جب وہ دوسرے انسانوں کی شرافت اور احترام کو صرف دولت کے معیار پر پرکھنے کا خوگر ہو جائے۔ وہ تمام وسائل جن کی وجہ سے دولت کا بہاؤ کسی فرد واحد یا معاشرہ کے ایک مخصوص طبقہ کی طرف مڑ جاتا ہے، اسلام نے ان کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے۔ وہ ممالک جہاں سرمایہ داری کا عفریت اپنے ہم وطنوں کا خون چوس رہا ہے اور ضرورت مندوں کی ہڈیوں کو چبا رہا ہے، اگر ان کے حالات کو آپ بنظرِ نادر دیکھیں گے تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ دولت کی اس غیر متوازن بلکہ ظالمانہ تقسیم میں ان وسائل معاش کا ہی عمل دخل ہے جنہیں اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ جو قوم یا ملک کے باشندے اسلامی وسائل معاش کی اس تقسیم پر ایمان رکھتے ہیں اور حرام ذرائع سے ایک پائی کمانا بھی جرم تصور کرتے ہیں، وہاں کے معاشرہ میں دولت کی یہ ظالمانہ تقسیم آپ کو نظر نہیں آئے گی۔

دوسرے ازموں کے برعکس اسلام کا انداز اصلاح یہ نہیں کہ پہلے غلامت کے ڈھیروں کو جمع ہونے کی کھلی چھٹی دی اور جب اس کی عفونت سے دماغ پھٹنے لگے تو ان غلامت کے ڈھیروں کو دور کرنے کی مجنونانہ مہم میں تخریب کاری کو روا رکھنا شروع کر دیا۔ ابتداء میں مرض کا سدباب نہ کیا جب جسم کے ہر حصے کو وہ متاثر کر چکیں تو پھر اس کے علاج کے لیے قطع و برید کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اسلام ان



راستوں کو ہی بند کر دیتا ہے اور ان دروازوں کو ہی مسدود قرار دیتا ہے جہاں سے اس قسم کی خرابیاں معاشرے میں داخل ہوتی ہیں اگر ایک سو دو کو کسی ملک میں حتمی طور پر بند کر دیا جائے، تو وہاں چند دنوں میں سرمایہ داری کا ظالمانہ نظام دم توڑ دے گا۔ اگر رشوت، جو بازی، ذخیرہ اندوزی کی لعنتوں سے کوئی قوم اپنا دامن بچالے تو معاشی ناہمواریاں اور خوفناک نشیب و فراز کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہے گا۔ اسلام نے وہ تمام راہیں بند کر دیں جن کے ذریعے سرمایہ داری کو غذا پہنچتی ہے اور اس کا دیوانسانی شرافت کے مقدس اور نورانی میناروں کو پامال کرنے کی تدبیریں سوچنے لگتا ہے۔

پاکستان میں بھٹو حکومت کے برسراقتدار آنے سے پہلے بانئیس خاندانوں کے خلاف بڑا شور مچایا گیا۔ ان کو وطن کا غدار، غریبوں کے حق غصب کرنے والا، محنت کش طبقہ کا خون چوسنے والا اور معلوم نہیں کن کن القابات و خطابات سے نوازا گیا، لیکن اس تحریک کے علمبرداروں کو یہ ہجرت نہ ہوتی کہ وہ ان اسباب و عوامل کا تجزیہ کریں، جن کی وجہ سے بانئیس خاندان معرض وجود میں آئے۔ بیس سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود پاکستان کی معاشی حالت زبوں سے زبوں تر ہوتی چلی گئی پہلے صرف بانئیس خاندان تھے اب کئی سو بلکہ کئی ہزار اس قسم کے مگر مچھ پیدا ہو گئے ہیں جو عوام کی ہڈیوں کو چبانا اپنا پیدا نشی حق تصور کرنے لگے ہیں۔ جب تک حکومت ایسے بالغ نظر اور تعلیمات اسلامی پر یقین محکم رکھنے والوں کے ہاتھوں میں نہیں آئے گی اصلاح احوال کی کوئی صورت ممکن نہیں۔

حضور سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم پر جو کتاب مقدس نازل ہوئی تھی۔

اس میں بار بار سرمایہ دارانہ ذہن کی سفاکیوں، فتنہ انگیزیوں اور مفسدہ پردازیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے :

فَاِذَا ارَدْنَا اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً  
 اَمْرًا مَّا نَشْرَفِیْهَا فَفَسَقُوْا  
 فِیْهَا فَحَقَّ عَلَیْهَا الْقَوْلُ  
 فَدَمَّرْنَا هَا تَدْمِیْرًا

اور جب ہم ارادہ کرتے ہیں کہ ہلاک کر دیں کسی بستی کو (اس

کے گناہ ہونے کے باعث) تو (پیسے) ہم نہیں کے ذریعہ

وہاں کے عیسوں کو ذکی کا حکم دیتے ہیں مگر وہ (اشا) نافرمانی کرنے لگتے

یہ اس میں پس واجب ہو جاتا ہے ان پر عذاب کا فرمان

پھر ہم اس بستی کو جڑ سے اکھڑ کر رکھ دیتے ہیں۔

سورہ سبا میں ہے کہ دولت کی فراوانی کے باعث ان کے امرا و اعیان کے

ذہن اتنے بانجھ ہو گئے تھے کہ جو انبیاؑ اپنی صداقت کی روشن نشانیاں لے کر مبعوث

کئے گئے تھے اور جن کی آمد کا مقصد صرف یہ تھا کہ انھیں ان بد کاریوں کے ہولناک

انجام سے بروقت متنبہ کریں۔ انھوں نے ان کی دعوت کو ٹھکرا دیا اور اپنی غلط فہمی

کا برملا اظہار کر دیا کہ ان کے پاس دولت کی فراوانی ہے، ان کے بیٹوں کی تعداد

کافی ہے، کوئی طاقت انھیں سزا نہیں دے سکتی۔ ارشادِ ربانی ہے :

وَمَا اَرْسَلْنَا فِی قَرْيَةٍ  
 مِنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالُ

یعنی جب ہم کسی بستی میں کوئی ڈرانے

والا بھیجتے ہیں۔ تو وہاں کا دولت مند

طبقہ برملا کہہ دیتا ہے کہ اے رسولو!

ہم تمہاری دعوت قبول کرنے سے انکار

کرتے ہیں۔ ہمارے پاس دولت کے

مُتَرَفُوْهَا اِنَّا بِمَا

اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ

وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ

أَمْوَالَهُمْ وَأَوْلَادَهُمْ وَمَا  
 نَحْنُ بِمُعَذِّبِينَ ۝  
 انبار ہیں اور اولاد کثیر ہے ہمیں کوئی عذاب  
 نہیں دیا جاسکتا۔

اس لیے اسلامی معاشرے میں سرمایہ داروں کے پینے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں،  
 لیکن اس کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت کے ساتھ برسرِ پیکار ہونے کی جو حماقت  
 اشتراکیت نے کی ہے، اسلام کا دامن اس سے بھی یکسر منزہ ہے۔ روس میں اشتراکی  
 انقلاب کو برپا ہوئے پچاس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ انفرادی ملکیت کو ختم کرنے  
 کے لیے بڑے ہی پاڑے بیلے گئے ہیں اور مظالم کی انتہا کر دی گئی ہے۔ صرف روس  
 میں نجی جائیداد کو اپنے قبضے میں کرنے کے لیے کروڑوں روسیوں کا خون بہایا گیا  
 ہے لیکن انسانی فطرت کو مسخ کرنے یا بدلنے کی مہم میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔  
 اسلام جس طرح عقیدہ، تقریر اور تحریر کی آزادی کی ضمانت دیتا ہے۔ بلکہ اس کو عزت اور  
 احترام کی نظر سے دیکھتا ہے، اسی طرح وہ انسان کی حریتِ عملی پر بھی بے جا پابندیاں  
 لگانے کا قائل نہیں جب تک کوئی شخص اسلام کی وضع کردہ حدود کو پامال نہیں  
 کرتا، وہ اپنی تخلیقی، تعمیری قوتوں کو بروئے کار لانے میں بالکل آزاد ہے، اور  
 اسلام اس کو اس آزادی کی ضمانت دیتا ہے۔ اور وہ اپنے عمل سے جو جائز ثمرات  
 حاصل کرے گا۔ اس کی حفاظت کا اس سے عہد کرتا ہے۔ اگر مملکت اسلامیہ کا  
 کوئی شہری قواعد و ضوابط کی پابندی کرتے ہوئے جائز اور حلال ذرائع سے دولت  
 کماتا ہے، تو اسلام ایسے شخص کو معاشرہ کا بہترین فرد شمار کرتا ہے۔ لیکن اس طرح  
 کی کمائی ہوئی دولت کو بھی ایسے حکیمانہ انداز سے ایک ہاتھ سے لے کر متعدد اشخاص  
 میں بانٹ دینا ہے کہ دولت کی فراوانی سے جن بڑے نتائج کے ظہور کا خطرہ ہوتا ہے،

ان کا سدباب بھی ہو جاتا ہے اور کسی کی دل شکنی اور دل آزاری بھی نہیں ہوتی اور کسی کے جوش عمل میں بھی کوئی ضعف پیدا نہیں ہوتا اسلام کا نظام وراثت و وصیت وہ ہے جس میں متوفی کی متروکہ، منقولہ اور غیر منقولہ دولت اس کے بیٹوں، اس کی بیٹیوں، اس کی بیوی، اس کے ماں باپ اور بعض حالتوں میں کئی دوسرے قریبی رشتہ داروں میں بٹ جاتی ہے۔ وصیت کے ذریعے وہ اپنی دولت متروکہ کا ایک تہائی حصہ غیر وارثوں کو بھی دے سکتا ہے۔ اسلام ہرگز یہ اجازت نہیں دیتا کہ صرف بڑا بیٹا جمدی جائیداد کا وارث ہو، اور باقی اولاد کو محروم کر دیا جائے یا صرف بیٹوں کو وراثت میں حصہ ملے اور بیٹیوں کو محروم کر دیا جائے یا کوئی شخص کسی تنگ میں آکر اپنے وارثوں کو محروم کر دے اور غیر وارث کو ساری جائیداد کا مالک بنا دے جس طرح یورپ کے "مہذب و شائستہ" لوگ ساری جائیداد اپنے کتوں اور بیٹیوں کے نام وصیت کر جاتے ہیں اور اپنے وارثوں کو محروم کر دیتے ہیں۔

ہر ملک میں خواہ معاشی طور پر ترقی یافتہ ہی کیوں نہ ہو، ایک طبقہ ایسا ضرور ہوتا ہے، جو بعض ناگزیر وجوہات کے باعث افلاس و تنگدستی کا شکار ہوتا ہے، ایسے لوگوں کی کفالت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے صاحب حیثیت لوگوں پر ڈالی ہے۔ جہاں اپنی عبادت کا ذکر کیا ہے، وہاں حاجت مند کی اعانت کرنے کا حکم بھی دیا ہے اور متعدد مقامات پر اس کی تصریح کی ہے کہ اسلام کی نظر میں صرف رسوم عبادت کو بجالانا ہی نیکی نہیں ہے بلکہ صدقہاں سے ایمان لانا اور اللہ تعالیٰ کی محبت کے لیے اپنے رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں میں

مال تقسیم کرنا یہ حقیقی نیکی ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ  
 قَبْلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ  
 وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ  
 وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ  
 وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَ  
 آتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي  
 الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ  
 وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ  
 وَفِي الرِّقَابِ -

نیکی بس یہی نہیں کہ نماز میں تم اپنا  
 رخ مشرق اور مغرب کی طرف پھیر لو  
 بلکہ نیکی کا کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص  
 ایمان لائے اللہ تعالیٰ پر اور روز  
 قیامت پر اور فرشتوں پر اور کتاب  
 پر اور سب نبیوں پر اور اپنا مال اللہ تعالیٰ  
 کی محبت کے باعث رشتہ داروں،  
 یتیموں، مسکینوں، مسافروں، مانگنے  
 والوں کو دے اور غلاموں کو آزاد کرائے

سورہ مدثر میں بڑے موثر پیرائے میں اس حقیقت کو ایک نئے انداز سے پیش  
 کیا گیا ہے کہ اہل جنت اہل جہنم سے پوچھیں گے: "مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقْوٍ" تمہیں کون سا  
 جرم دوزخ میں لے گیا۔ تو وہ جواب دیں گے: "قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ  
 الْمُصَلِّينَ وَ لَمْ نَطْعَمِ الْمَسْكِينِ" کہ ہم اس جرم کی پاداش میں دوزخ  
 کا ایندھن بنا دیئے گئے کہ ہم اپنے پروردگار کی جناب میں سجدہ نہیں کیا کرتے تھے  
 گویا قرآن کریم کی نظر میں نماز ادا نہ کرنا اور کسی غریب کی ضروریات زندگی کو بہم نہ  
 پہنچانا دونوں یکساں نوعیت کے گناہ ہیں۔

بلکہ سورہ ماعون میں بڑی وضاحت سے بتا دیا کہ جو شخص یتیموں کو توہین کرتا  
 ہے۔ ان کو اپنے ہاں سے دھکے دے کر نکال دیتا ہے اور مساکین و غربا کی بنیادی

ضرورتوں کو بہم پہنچانے کی ترغیب نہیں دلاتا، وہ قیامت پر یقین ہی نہیں رکھتا۔  
 اَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ فَذَلِكَ الَّذِي يَدْعُ  
 الْيَتِيمَ وَلَا يَحِضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے رزق سے غریبوں کی امداد نہیں کرتے اور  
 ان کی ضرورت کی بہم رسانی میں اپنا فرض ادا نہیں کرتے، ان کے بارے میں قرآن  
 حکیم کے دل دہلا دینے والے ارشادات سماعت فرمائیے، ارشاد ہے:

خُذُوهُ فَغُلُّوهُ ثُمَّ الْجَحِيمَ	اس (نابکار) کو پکڑ لو۔ اس کی گردن میں
صَلُّوهُ ثُمَّ فِي سِلْسِلَةٍ	طوق ڈال دو، پھر اسے سزا دیتی ہوئی آگ
ذَرَعَهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا	میں سینک دو پھر اسے ست گز بے
فَأَسْلِكُوهُ إِنَّهُ كَانَ كَاذِبًا	زنجیر میں جکڑ دو۔ یہ بد بخت، خداوند عظیم
يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ	پر ایمان نہیں تھا۔ اور نہ ہی وہ غریبوں
وَلَا يَحِضُّ عَلَىٰ طَعَامِ	کو خوراک مہیا کرنے کی ترغیب دیا کرتا تھا۔
الْمِسْكِينِ۔	

ان آیات میں جو رعب اور جلال ہے اس سے دل کانپ اٹھتا ہے اور  
 رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایک منصف مزاج انسان پر یہ حقیقت آشکارا ہو  
 جاتی ہے کہ اسلام نے انسان کی مادی ضروریات کو انتہائی اہمیت دی ہے اور  
 جو شخص اپنے ضرورت مند بھائیوں کی امداد کی طرف متوجہ نہیں ہوتا وہ قیامت کا  
 منکر ہے اور اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان نہیں رکھتا، اور اس کا ان برکتوں میں کوئی  
 حصہ نہیں جو اسلام کے زیر سایہ انسان کو نصیب ہوتی ہیں۔ اسلام نے صرف پند

موعظت پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ قانونی طور پر ضرورت مند لوگوں کی کفالت کو اسلامی معاشرہ پر لازم قرار دے دیا ہے۔ جس کی ادائیگی ہر شخص پر حسب حیثیت لازم ہے۔ اس کے علاوہ مختلف اسالیب سے ضرورت مند لوگوں کی امداد کا دلوں میں شوق پیدا کر دیا۔ کہیں فرمایا کہ ان لوگوں کو امداد کے لیے جو تم خرچ کرتے ہو، وہ گویا تم اپنے پروردگار کو قرض دے رہے ہو جو تمہیں یقیناً واپس ملے گا۔ کہیں فرمایا کہ تم اگر اپنے ضرورت مند بھائیوں کی امداد کے لیے ایک روپیہ خرچ کرو گے، تو اللہ تعالیٰ اس کے عوض کم از کم دس گناہ تمہیں عنایت فرمائے گا اور زیادہ کی کوئی حد نہیں۔ ذرا اس آیت کو بھی گوش ہوش سے سماعت فرمائیے۔ اس آیت کو سننے کے بعد اور اس کو سمجھ لینے کے بعد دل میں ایسا دلولہ اٹھتا ہے کہ ہر چیز اپنے ضرورت مند بھائیوں کی امداد کے لیے لٹا دینے کو جی چاہتا ہے۔

وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ	یعنی ان لوگوں کی مثال جو اپنے مال اللہ
أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ	کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ایسی ہے
كَثَلِ حَبْثَةٍ أَنْبَتَتْ	جیسے ایک دانہ ہو جو اُگے اور اس میں
سَبْعَ سَنَابِلٍ فِي كُلِّ	سات خوشے لگیں اور ہر خوشہ میں سو
سُنْبُلَةٍ مِائَةِ حَبَّةٍ وَ	دانے ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ اس سے
اللَّهُ يُضْعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ وَ	بھی زیادہ کر دیتا ہے جس کے لیے چاہتا
اللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ	ہے۔

یہی وہ پاکیزہ تعلیمات تھیں، یہی وہ صحیح تربیت تھی، یہی وہ قرآن کا اعجاز تھا اور یہی وہ اسلام کا روح پرور نظام تھا جس نے ان قوموں کی کایا پلٹ دی

جنہوں نے اس کو قبول کیا اور ان ملکوں کو جنتِ نظیر بنا دیا جہاں اس کا برکتوں والا پرچم لہرایا۔

قرآنِ کریم کی اعجازِ آفرینی آج بھی اپنے شباب پر ہے۔ اسلام کی برکتوں اور سعادتوں کا چشمہ شیریں آج بھی ابل رہا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ادائے رحمت للعالمین اتنی وسیع ہے کہ ستم رسیدہ، افلاس گزیدہ انسانیت کو اس کے نخلِ عاطفت میں پناہ مل سکتی ہے بشرطیکہ ہم منافقت کو ترک کر دیں۔ شک وارتیاب کی دلدل سے اپنے آپ کو نکال لیں۔ ایمانِ صادق اور یقینِ محکم سے ان تعلیمات کو اپنالیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوبِ کریم، رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہمارے لیے بلکہ ساری دنیا کے انسانیت کے لیے نازل فرمائی ہیں جس مبارک ہستی کا ہم یومِ میلاد منا رہے ہیں اس کے ساتھ محبت اور عقیدت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کے لاتے ہوئے دین پر خود عمل پیرا ہوں اور دوسروں کے لیے راہِ حق پر گامزن ہونے کا دلکش نمونہ پیش کریں۔ اس محسنِ انسانیت کو دینِ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھنا۔ اس کے احکام کی تبلیغ کے لیے کون سا سم ہے، جو محبوبِ رب العالمین نے برداشت نہیں کیا، کونسی منیبت ہے جسے گوارا نہیں کیا، حضور کے مقدس پاؤں میں کانٹے چھبے، حضور کو شہید کرنے کے لیے کفار نے انگنت منصوبے بنائے، اپنے وطن سے نکالا، بارہا مدینہ طیبہ پر چڑھائی کی، ان جنگوں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے صحابہ اور عزیز رشتہ دار شہید ہوتے، ان تمام مصائب و آلام کو اس رحمتِ عالمیان نے بخوشی گوارا کیا تاکہ اللہ تعالیٰ کا نام اونچا ہو اور اس کا دین پھیلے تاکہ



انسانیت کی نکتہ اور زبوں حالی کا دور ختم ہو اور صبح سعادت طلوع ہو۔ اگر ہم اللہ تعالیٰ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا دم بھرتے ہیں، حضور کی غلامی کے رشتہ پر ناز کرتے ہیں تو ہمارا یہ فرض اولین ہے کہ ہم سب راعی اور رعایا، حضور کے اس یوم میلاد کو اس عزم کے ساتھ منائیں کہ ہم دین حق کی جو شمع اس سہانی گھڑی فروزاں کی گئی تھی، اس سے اپنی تاریک دنیا کو بھی منور کریں گے، ظلم، جہالت، گمراہی کا اندھیرا جہاں جہاں خمیہ زن ہے، اس کا قلع قمع کر دیں گے۔ آج کی مادیت گزیدہ انسانیت کو اسلام کے تریاق کی اشد ضرورت ہے لیکن یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک پاکستان اسلامی تعلیمات سے بہرہ ور ہو کر اخلاقی بلندی، روحانی بالیدگی اور معاشی خوشحالی کا مرقع زیبانہ بن جائے۔



اسلام کا سیاسی نظریہ

فصل

بیعت صدیقی







آفتابِ نبوت کے طلوع ہونے سے پہلے جہاں کہیں کوئی حکومت قائم تھی وہاں ملوکیت کا نظام اپنی جملہ خرابیوں کے ساتھ نافذ تھا۔ بعض ممالک میں فوجی قوت اور مادی طاقت بادشاہوں کا سہارا تھی اور بعض ممالک میں بادشاہ نے اپنے بارے میں اپنی رعایا کے قلوب و اذہان پر تصور قائم کر رکھا تھا کہ ان کے بادشاہ، ان کے معبودوں کی اولاد ہیں اور ان کے احکام کا بجالانا اپنے خداؤں کے احکام بجالانے کی طرح ان پر لازم ہے۔ ایران، چین، جاپان اور کئی دیگر ممالک میں رعایا اپنے حکمرانوں کو صرف خراج ہی ادا نہیں کرتی تھی، بلکہ ان کی بندگی اور پرستش کو بھی اپنے لیے اخروی نجات کا ذریعہ یقین کرتی تھی۔

مقصد یہ تھا کہ ان کی رعایا صبر اور سکون کے ساتھ ان کے جور و ستم کو برداشت کرتی رہے، ان کی لوٹ کھسوٹ کے سامنے دم تک نہ مارے، ان کے شہستانِ عدس و نشاط کی رونقوں میں اضافہ کرنے کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہ کرے! ان بادشاہوں کے بصرِ حقوق تھے، جن کی ادائیگی ان کی رعایا پر ضروری تھی۔ ان پر اپنے عوام کی طرف سے کوئی فرائض عائد نہ ہوتے تھے، جن کے بارے میں وہ ان سے

باز پرس کر سکیں۔ رعایا تنگ آکر ایک ظالم اور ستم شعار بادشاہ کے خلاف تو بغاوت کر سکتی ہے لیکن اپنے معبود کے خلاف سرکشی کا تصور کسی پرستار کے ذہن میں پیدا نہیں ہو سکتا۔

شرق و غرب میں جتنی شہنشاہیاں قائم تھیں۔ ان میں تین چیزیں مشترک ہیں :

۱ - بادشاہ کے منہ سے نکلی ہوئی مہربانیاں ایک قانون ہے، جس کی خلاف ورزی جرم ہے۔

۲ - بادشاہ ہر قسم کے قانونی مواخذہ سے بالاتر ہے۔ وہ بیگناہوں کے کشتوں کے پستے لگا دے، وہ لوگوں کے مال و دولت پر ڈاکے ڈالتا ہے، وہ لوگوں کی عصمتوں کو برباد کرتا ہے۔ اس سے کوئی بھی باز پرس نہیں کر سکتا۔

۳ - بادشاہ کا جانشین اس کا بیٹا یا اس کا قریبی وارث ہی ہو سکتا ہے۔ شاہی خاندان کے علاوہ کوئی شخص بھی قصر شاہی پر نہیں بیٹھ سکتا۔ خواہ علم و فضل، معاملہ فہمی، عاقبت اندیشی میں وہ اپنی نظیر نہ رکھتا ہو۔

اس غلط نظام کے باعث کروڑوں لوگ ایک آدمی کے رحم و کرم پر اپنی زندگیاں بسر کرتے۔ وہ اس نظام کی سنگدلیوں سے شکوہ بلب ضرور تھے، لیکن انھوں نے اسے ایک ناگزیر حقیقت کے طور پر قبول کر لیا تھا۔ ان کے ذہن میں اس نظام سے رستگاری حاصل کرنے کا کبھی حوصلہ ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔

اسلام کے جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں میں خوش آمدت تبدیلیاں برپا کیں، جہاں ملکیت کے نظام کو بھی درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ اس نے اپنے سیاسی نظام میں ملک اور بادشاہ کا لفظ ہی خارج کر دیا، کیونکہ ان لفظوں سے بھی خود سری، مطلق العنانی اور حاکم حقیقی ہونے کی بو آتی ہے۔ اس نے خلیفہ کا لقب، سربراہ مملکت کے لیے پسند فرمایا، جو ان تمام غلط تصورات سے بالاتر ہے۔ جس کا معنی نائب ہے۔ اور نائب وہ ہوتا ہے جو اپنے ملک کی منشا اور مرضی کے مطابق اپنے اختیارات کو استعمال کرے۔ اس لفظی تبدیلی میں ہی حکمران طبقہ کے ناروا اور غیر محدود اختیارات پر ضرب کاری لگا دی، اور ان سے وہ تمام حقوق سلب کر لئے جن کے بل بوتے پر وہ مخلوق خدا پر مشفق ستم کیا کرتے تھے۔

دوسری تبدیلی یہ کہ حکم، سلطان وقت کا نہیں چلے گا، بلکہ اللہ تعالیٰ کا چلے گا، جو سب کا خالق و مالک ہے۔ خلیفہ کا کام بادشاہ حقیقی، رب العالمین کی منشا کے مطابق ملک میں امن و امان برقرار رکھنا عدل و انصاف کی بالادستی قائم کرنا، حقوق و فرائض میں ہم آہنگی کو ہر لحظہ پیش نظر رکھنا۔ تیسری تبدیلی یہ ہوئی کہ مسند حکومت کسی کی ذاتی جاگیر نہیں کہ اس کے بعد اس کا بیٹا یا دوسرا کوئی قریبی وارث اس پر متمکن ہو جائے، بلکہ منصف لوگوں کا حق ہے۔ اپنے میں سے جس کو وہ ان فرائض کی انجام دہی کے لیے موزوں خیال کریں، اسے اپنا امیر اور سربراہ مملکت چن سکتے ہیں۔

حضور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے نظام حکومت میں یہ دور رس انقلابی تجاویز اور پھیران کو عملی جامہ اس وقت پہنایا، جب کہ شرق و غرب میں

کوئی مفکر اور دانشور ایسی تبدیلی کے بارے میں سوچنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ نبی برحق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لَا قَيْصَرَ وَلَا كِسْفِي كَالرَّزْهِ خَيْرَ اَعْلَانِ اس وقت کیا، جب مشرق میں وسیع و عریض ممالک پر کسریٰ کی شہنشاہی کا پرچم لہرا رہا تھا اور مغرب میں قیصر کی عظمت کے ڈنکے بج رہے تھے۔ کیا کوئی انسان اس وقت یہ سوچ بھی سکتا تھا کہ بہت جلد وہ دن طلوع ہونے والا ہے، جب کہ نہ قیصریت رہے گی اور نہ کسرویت۔ نبی رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے دل نشین ارشادات سے اور اپنی تینیس سالہ پاکیزہ زندگی سے اپنے مانتے والوں کے دلوں میں ان نقوش کو راسخ کر دیا۔ انھیں اپنے آقا کے ارشادات پر یقین محکم تھا۔ ان کا یہ ایمان تھا کہ سیاست کی پہلی بساط الٹا دی جائے گی، اب انسانوں کو بھٹیروں بکریوں کا ریوڑ سمجھنے والے بادشاہ ان پر حکومت نہیں کریں گے، بلکہ جس کو اب وہ مناسب سمجھیں گے، اس منصب پر فائز کر دیں گے۔

سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی موجودگی میں ہی ایک اسلامی ریاست معروض وجود میں آچکی تھی، جو حجاز، یمن اور دیگر ملحقہ علاقوں پر مشتمل تھی۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ پیرس کی تحقیق کے مطابق اس اسلامی سلطنت کا رقبہ دس لاکھ مربع میل تھا۔ جنہوں نے اپنی جانشینی کے لیے نام لے کر کسی کو نامزد نہیں کیا، بلکہ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ کے فرمان الہی کے مطابق امیر کے انتخاب کو مسلمانوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا تاکہ وہ جس کو اس منصب کا اہل خیال کریں اسے منتخب کریں۔

نظام حکومت کے بارے میں مسلمانوں میں سے دو مختلف مکتب فکر قدیم زمانہ

سے موجود ہیں۔ ایک مکتب فکر اہل سنت کا ہے، جو امت کا سوادِ اعظم ہے اور ایک دو ممالک کے علاوہ تمام اسلامی ممالک میں ان کی غالب اکثریت ہے۔ دوسرا مکتب فکر شیعہ حضرات کا ہے، جنہیں ایران میں عدوی کثرت ملتا ہے، عراق میں بھی ان کی تعداد نصف کے لگ بھگ ہے۔ دیگر تمام اسلامی ممالک میں وہ اقلیت میں ہیں۔

اہل سنت کا مسلک وہی ہے جو اسلام کی انقلابی روح کا آئینہ دار ہے اس میں ریاست کی ذمہ داری اس شخص کو سونپی جاتی ہے، جس کو امت مسلمہ اپنی سربراہی کے لیے پسند کرے۔ اس میں سیدنا علی اور حضرت سیدہ کی اولاد میں سے ہونا ضروری نہیں۔ اس میں میراث کا نظام بھی جاری نہیں ہوتا، یہی وہ چیز ہے جو اسلامی نظام سیاست کو دیگر سیاسی نظاموں سے ممتاز کرتی ہے۔ لیکن شیعہ حضرات کا یہ نظریہ ہے کہ خلافت مصالح عامہ میں سے نہیں تاکہ اسے عوام کے غور و تدبر کے سپرد کر دیا جائے اور اس کی تعیین کا اختیار امت کو دیا جائے بلکہ یہ دین کا ایک کن ہے اور اسلام کا ایک بنیادی مسئلہ ہے اور نبی کے لیے جائز نہیں کہ خلیفہ کے تقرر میں غفلت برتے یا اس کے تقرر کی ذمہ داری عوام کے سپرد کر دے۔

بَلْ يَجِبُ عَلَيْهِ تَعْيِينُ	یعنی نبی پر واجب ہے کہ وہ امام کا
الْإِمَامِ لَهُمْ وَيَكُونُ	تعیین کرے، اور امام ایسا ہونا چاہیے
مَعْصُومًا مِنَ الْكِبَائِرِ وَ	کہ اسے کبائر ہر قسم کے گناہوں
الصَّغَائِرِ	سے معصوم ہو۔

اور یہ بستی سیدنا علی المرتضیٰ کی ہے۔ پھر یہ بطور ورثہ حضرت سیدہ کی اولاد



میں منتقل ہوتی چلی جاتی ہے، اور ہر امام نص سے مقرر ہوتا ہے۔

اس نظریہ کے عملی پہلو کو چند لمحوں کے لیے رہنے دیجئے۔ اس کے نظری پہلو پر غور فرمائیے، آپ کو ماننا پڑے گا کہ اگر یہ نظریہ اسلام کا نظریہ ہے تو یہ قطعاً کوئی جدید اور انقلاب آفرین نظریہ نہیں بلکہ اسی پرانے نظام ملکیت کی ایک نئی شکل ہے۔ اسی ملکیت کو مذہبی تقدس کا لباس پہنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اگر وہاں قیصر کی اولاد، قیصر کی جانشین ہو سکتی ہے اور دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا، تو یہاں بھی سیدنا علی اور حضرت سیدہ کی نسل سے ہی کوئی شخص اس مرتبہ پر فائز ہو سکتا ہے، کسی غیر کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ خود اس مسند پر متمکن ہو جائے یا قوم، زمام اقتدار اس کے ہاتھوں میں کپڑا دے۔

اس نظریہ کا عملی پہلو شیعہ کے لیے بھی بڑی پریشانیوں اور ہولناک نتائج کا باعث ثابت ہوا۔ بہت جلد ان میں مذہبی تفرقہ بازی کا دروازہ کھل گیا۔ ہر فرقہ دوسرے فرقہ کو گمراہ بلکہ خارج از اسلام قرار دینے لگا۔ اس طرح یہ مسکد خلف اور متضاد اور متحارب گروہوں میں بٹتا چلا گیا۔ ان کا پہلا اختلاف تو خود سیدنا علی کے بارے میں ہے۔ ایک فرقہ کہتا ہے کہ جن نصوص سے آپ کی امامت ثابت ہے، ان میں آپ کے ایسے اوصاف بیان ہوئے ہیں جو بجز آپ کے کسی میں نہیں پائے جاتے۔ اس رائے کے قائلین زید یہ کہلاتے ہیں۔ جن لوگوں نے آپ کو چھوڑ کر شیعیں کو اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے، ان کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ نصوص کے سمجھنے میں اور ان کی تطبیق میں ان سے غلطی ہوئی ہے۔ زید یہ نہ شیعیں سے برأت کا اظہار کرتے ہیں، اور نہ ان کی امامت پر زبان طعن دراز کرتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ سب سے افضل سیدنا علی اور شیخین مفضل ہیں، لیکن افضل کی موجودگی میں مفضل امام مقرر ہو سکتا ہے۔ دوسرا فریق کہتا ہے کہ جن نصوص سے آپ کی جانشینی ثابت ہے اس میں آپ کا نام لے کر تعیین کی گئی ہے۔ اس لیے آپ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو خلیفہ مقرر کرنا ضلالت و گمراہی ہے۔ سیدنا علی کے بعد پھر وہ بٹ گئے بعض کہتے ہیں کہ امامت سیدہ طاہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اولاد میں منحصر ہے اور ہر امام کا نام نصاً ثابت ہے بعض کہتے ہیں کہ سیدہ طاہرہ کی نسل سے امام کا ہونا تو ضروری ہے لیکن ہر ایک کا مخصوص ہونا ضروری نہیں۔ بلکہ اس خاندان کے شیوخ اپنے میں سے کسی ایسے شخص کو منتخب کر سکتے ہیں جو عالم، زاہد، سخی اور شجاع ہو۔ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لوگوں کو اپنی امامت قبول کرنے کی اعلانیہ دعوت بھی دے۔ یہ نظریہ حضرت زید کا ہے، جو حضرت امام علی زین العابدین کے فرزند ہیں اور امام محمد باقر کے برادر گرامی ہیں۔ حضرات حسنین کریمین کے بعد امام مخصوص کون ہے؟ اس میں پھر ان کا باہمی اختلاف ہے بعض نے ان کے بھائی حضرت محمد بن حنفیہ کو امام مانا ہے۔ جیسے جیسے یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا، ان میں بھی امام کے بارے میں اختلاف پیدا ہونے لگے اور یہ بھی کئی فرقوں میں بٹ گئے اسی طرح زیدیت میں بھی باہمی انتشار پیدا ہو گیا۔

اب رہے امامیہ! تو ان کی کہانی بھی کسی سے کم عبرتناک نہیں۔ ان کے نزدیک سیدنا علی کی وصیت سے حضرت حسن، پھر امام حسین، پھر امام زین العابدین پھر امام محمد باقر، پھر آپ کے صاحبزادے جعفر صادق، اس کے بعد پھر یہ دو حصوں میں بٹ گئے بعض نے آپ کے فرزند حضرت اسماعیل کو اور بعض نے حضرت موسیٰ کاظم

کو امام منصوب مانا ہے۔ امامیہ اثنا عشریہ جو بڑی سختی سے اس عقیدہ پر قائم تھے کہ امام منصوب اور معصوم ہونا چاہتے، وہ بھی مشکل گیارہویں امام حضرت حسن عسکری تک پہنچے۔ آگے وہ بھی اس سلسلہ کو دراز نہ کر سکے اور آخر کار انھیں امام غائب کا سہارا لینا پڑا جو بقول ان کے پانچ سال کی عمر میں اپنے دشمنوں کے خوف سے ایک غار میں پناہ گزیں ہو گئے۔ یہ واقعہ ۲۶۰ھ کا ہے۔ اس وقت سے لے کر آج تک وہ روپوش ہیں۔ ان کی تشریف آوری کی مختلف تاریخیں وقتاً فوقتاً مقرر کی جاتی رہیں۔ لیکن امام تشریف نہ لائے بشیعہ حضرات صد ہا سال تک مغرب کے وقت اس مزارِ عومر غار کے دہانے پر اکٹھے ہوتے رہے۔ فریادیں کرتے رہے، ملتیں مانتے رہے، لیکن بے سود۔

ہمیں ان کے عقیدہ پر اعتراض کا حق نہیں وہ جو چاہیں عقیدہ اختیار کر لیں، کیونکہ ہر شخص اپنے عقیدہ کی جزا و سزا کا خود ہی متحمل ہوتا ہے، لیکن یہ سوچنے کا حق تو ہمیں بہر حال ہے کہ جن اغراض عالیہ اور مقاصد رفیعہ کی تکمیل کے لیے منصوب اور معصوم خلیفہ کا بالفعل وجود لازمی اور ضروری قرار دیا گیا تھا، تقریباً گیارہ صدیوں سے امام غائب ہیں، کیا ان اغراض و مقاصد کی تکمیل ہو رہی ہے؟ جن نصوص کا سہارا لے کر اس عقیدہ کی عمارت تعمیر کی گئی تھی، کیا اب وہ منسوخ یا معطل ہو گئی ہیں۔ اتنے اہم اور ضروری کام کو قدرت نے یوں مسلسل کیوں نظر انداز کر رکھا۔ ان کی غیر موجودگی میں امت گمراہی کے گڑھے میں گرتی چلی جا رہی ہے۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا امام منتظر امت مسلمہ کی حسہ حالی کا مشاہدہ فرما رہے اور روٹھے بیٹھے ہیں۔ ہمیں تو یہ گتھی سلجھتی نظر نہیں آتی۔

پھر غور طلب امر یہ ہے کہ ہر زمانہ میں ایک منصوص اور معصوم امام کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی؟ کیا حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دین کا کام اوصورا اور نامکمل چھوڑا تھا، جس کی تکمیل کے لیے سیدنا علیؑ تشریف لائے؟ کیا علی المرتضیٰ سے کوئی کمی رہ گئی تھی العیاذ باللہ جس کی تکمیل کے لیے سیدنا امام حسن مجتبیٰ نے کی۔ ہمارا تو یہ ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا محبوب کریم دین کی تکمیل کرنے کے بعد شریعت مطہرہ کا محل مضبوط بنیادوں پر تعمیر کرنے کے بعد رفیق اعلیٰ کی طرف مراجعت فرما ہوا اس کی تصدیق خود رب السموات والارضین نے حجۃ الوداع کے موقع پر میدان عرفات میں یہ آیہ کریمہ نازل کر کے فرمادی۔

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي  
وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا

یہ دین قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے۔ باقی رہا لحظہ پھیلتی ہوئی اسلامی دنیا میں اس کا نفاذ، ہر داخلی انتشار اور بیرونی بیچارے سے اس کا تحفظ، یہ امت کی اجتماعی ذمہ داری ہے اور جس کو وہ موزوں اور اہل خیال کرے یہ خدمت انجام دینے کے لیے اس کو منتخب کر لے۔ اگر وہ عزم و یقین کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتا رہتا ہے تو فیہما۔ ورنہ اس کو معزول کر کے کسی دوسرے شخص کو یہ خدمت سپرد کی جاسکتی ہے۔ اگر ایران کے شیعہ نظام اسلام کے نفاذ کے لیے جناب آیت اللہ خمینی کو اپنا راہنما اور امام مقرر کر لیتے ہیں۔ اور ان کی جاندار اور ویدہ و رقیادت میں شمشادہ کی لعنت سے نجات حاصل کر لیتے ہیں اور اسلامی بنیادوں پر ایک پاکیزہ معاشرہ قائم کرنے کا آغاز کر سکتے ہیں، حالانکہ

خمینی کی امامت کسی نص سے بھی ثابت نہیں۔ وہ معصوم بھی نہیں اور دو دمان سیادت سے بھی نہیں اور ابھی امام منتظر غار میں ہی قیام فرمایا ہے۔ اگر آج کل ایک شخصیت امام کی غیر موجودگی میں یہ کارنامہ انجام دے رہی ہے تو ۲۶۰ھ سے لے کر ۱۳۹۹ھ تک اسلامی معاشرہ اتنا بنجر اور بانجھ تھا کہ ان میں کوئی مرد کار اس فریضہ کو انجام دینے کے لیے ظاہر نہیں ہوا۔ دل اس کو تسلیم کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔

واقعات کی روشنی میں اگر ان آراء و افکار کا وقت نظر سے تجزیہ کیا جائے تو ماننا پڑتا ہے کہ تقرر خلیفہ کے بارے میں جمہور امت (اہلسنت) کا نظریہ ہی صحیح ہے۔

دین فطرت کے اصول و قواعد اسی کی تصدیق کرتے ہیں۔

سرور عالمیاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی امت کو ایک کتاب مبین، ایک جامع نظام حیات اور ایک نوخیز مملکت عطا فرمائی، جس میں پھیلنے کی بے پناہ قوتیں موجود تھیں جس مقصد گرامی کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضور کو مبعوث فرمایا تھا، اس کی تکمیل ہو چکی تھی۔ رفیق اعلیٰ کی طرف رجوع کرنے کی گھڑی قریب آرہی تھی۔ بظاہر مصلحت کا تقاضا تو یہ تھا کہ حضور کسی کو اپنا جانشین مقرر فرما دیتے۔ حضور جسے بھی مقرر فرما دیتے، سب صدقِ دل سے اسے قبول کر لیتے لیکن اگر ایسا کیا جاتا تو سیاست کی سنگلاخ اور اداس وادیوں میں روح پرور تبدیلیوں اور خوش آئند انقلابات کے جو گلشن نگاہ مصطفوی نے سجائے تھے۔ ان کا حسن ماند پڑ جانا، جس عمل کو سند بناتے ہوئے ہر حاکم جس کو چاہتا اپنا جانشین بنا لیتا۔ یوں جمہوریت کی روح نشوونما پانے سے پہلے ہی کچل دی جاتی۔ اس لیے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت پر بلکہ ساری نوع انسانی پر کرم فرماتے ہوئے کسی

کو نامزد نہیں کیا، لیکن ایسے اشارات ضرور فرمادیئے جن سے ہر ذمی فہم حضورؐ کا مدعا باسانی سمجھ سکتا۔ چنانچہ آخری علالت میں جب نقاہت زیادہ ہو گئی اور مسجد میں جا کر امامت کرنا مشکل ہو گیا تو کریم آقا نے ارشاد فرمایا:

مُرُوا أَبَا بَكْرٍ فَلْيُصَلِّ ۖ

یعنی ابوبکر کو حکم دو کہ وہ لوگوں کو نماز

پالتاس۔ پڑھیں۔

حضرت صدیقہ نے عرض کی۔ یا رسول اللہ! ابوبکر بڑے نرم دل ہیں، جب وہ آپ کے مصلی پر کھڑے ہوں گے تو ان پر گریہ و رقت طاری ہوگی اور لوگ ان کی قرأت کو نہ سن سکیں گے۔

قَالَ مَرُّوا أَبَا بَكْرٍ فَلْيُصَلِّ ۖ

حضور نے سختی سے حکم دیا کہ ابوبکر کو کہو

پالتاس فانكُنْ

وہ لوگوں کو نماز پڑھائے۔ بے شک

صَوَاحِبَ يُوسُفَ ۖ

تم وہی عورتیں ہو جنہوں نے یوسف

کو بہکانا چاہا تھا۔

حضور کے اس ارشاد سے اہل فہم کے لیے یہ سمجھنا دشوار نہ رہا کہ اس موقع پر صدیق کو خصوصی طور پر اپنے مصلیٰ پر کھڑا کرنا اور تمام حلقہ بگوشان اسلام کو جن میں سیدنا علی اور خاندان بنی ہاشم کی دوسری عظیم المرتبت ہستیاں بھی تھیں ان سب کو آپ کی اقتدار میں نماز ادا کرنے کا حکم دینا اس بات کی طرف اشارہ ہے اور یہ نیابت ایک دفعہ یا دو دفعہ نہیں، بلکہ حضور کی موجودگی میں سترہ نمازوں کی آپ نے امامت کرائی اور حضور اس منظر کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہے، حضرت صدیقہ سے ہی مروی ہے:

لَبَّأَتْ قُلَّ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى  
 اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
 دَعَا عَبْدَ الرَّحْمَنِ بْنَ  
 أَبِي بَكْرٍ وَقَالَ  
 اسْتِنِي بِكَتِفِي حَتَّى أَكْتُبَ  
 لِأَبِي بَكْرٍ كِتَابًا لَا يُخْتَلَفُ  
 عَلَيْهِ فَذَهَبَ عَبْدُ الرَّحْمَنِ  
 لِيَقُومَ فَقَالَ اجْلِسْ أَبِي  
 اللَّهُ وَالْمُؤْمِنُونَ أَنْ  
 يُخْتَلَفَ عَلَى أَبِي بَكْرٍ

جب حضور کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم  
 کی طبیعت زیادہ ناساز ہوئی تو حضور  
 نے عبد الرحمن بن ابی بکر کو حکم دیا کہ وہ  
 کندھے کی ہڈی لے آئیں تاکہ ابوبکر  
 کے لیے میں لکھ دوں، تاکہ کسی کو  
 مجال اختلاف نہ رہے۔ عبد الرحمن  
 اٹھنے لگے، فرمایا! بیٹھ جاؤ لکھنے کی  
 ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ اور  
 مسلمان انکار کرتے ہیں کہ ابوبکر کے  
 بارے میں اختلاف کیا جائے۔

(طبقات ابن سلام)

آخر وہ جاں فرسالمہ آہی گیا جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام دلوں کو سوگوار،  
 روحوں کو بے قرار اور دیدہ ہاتے شوق کو اشکبار چھوڑ کر عالم فانی سے منہ موڑ کر  
 عالم بقا کی طرف روانہ ہوئے۔ مسلمانوں کے لیے یہ لمحے قیامت سے کم نہ تھے۔  
 جس کو ایک لمحہ دیکھنے بغیر ان کو قرار نہیں آتا تھا، کیا وہ روئے زیبا انھیں پھر کبھی  
 نظر نہ آئے گا۔ یہ تصور کر کے وہ کانپ جاتے، ان کے دلوں پر کلہاڑے چلنے  
 لگتے۔ بعض تو اپنے ہوش و حواس بھی فرط غم سے کھو بیٹھے تھے۔

سنح، مدینہ طیبہ کے نواح میں ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ حضرت صدیق  
 اپنے اہل خانہ کے ہمراہ وہاں رہائش پذیر تھے۔ بارہ ربیع الاول ۱۱ھ صبح کی

نماز مسجد نبوی میں ادا کی۔ اس روز حضور کا مزاج گرامی سنبھلا ہوا تھا۔ آپ واپس  
 سب سے چلے گئے۔ چاشت کے وقت سائے ارتحال پیش آیا۔ ایک صحابی دوڑتے ہوئے  
 گئے اور جا کر آپ کو اس روح فرسا حادثہ کی اطلاع دی۔ آپ فوراً واپس لوٹے۔  
 وہاں پہنچے تو دیکھا، صحابہ کی حالت غیر ہے۔ حضرت عمر خصوصاً اپنے آپ میں  
 نہیں۔ حجرہ مبارکہ میں حاضر ہوئے جہاں رحمت عالم کا جسدِ اطہر رکھا ہوا تھا چہرہ  
 مبارک سے چادر ہٹائی، جبین سعادت پر بوسہ دیا، دل نیاز کیش کی طرف سے بارگاہ  
 جہنم میں پہنچا اور عقیدت پیش کیا اور باہر آگئے۔ صحابہ کے مجمع میں ایک مختصر سی  
 تقریر فرمائی، جس سے صحابہ کرام کو کچھ صبر و قرار نصیب ہوا۔ دین کے غیر محفوظ مستقبل  
 کے بارے میں جو اندیشے انھیں پریشانی سے تھے، ان کو تسکین ہو گئی۔  
 اسی آثار میں ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا، جس سے آکر یہ خبر سنائی کہ سفیف بنی  
 ساعدہ میں انصار جمع ہیں اور وہ سعد بن عبادہ (رئیس قبیلہ خزرج) کو اپنا امیر  
 بنانے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور اب سب ان کی بیعت کرنے والے ہیں۔ آپ ہی  
 بتائیں، کیا ابو بکر اور عمر یہ سن کر بھی وہاں بیٹھے رہتے اور سفیف میں نہ جلتے اور  
 انصار کو اپنی من مانی کرنے دیتے۔ اگر اس فیصلہ کو عملی جامہ پہنا دیا جاتا اور حضرت  
 سعد کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے تو اس کے نتائج کتنے تباہ کن ہوتے۔ شاید آپ  
 میں یہ ہمت ہو کہ آپ با دِ صرصہ کے تند جھونکوں کو گلشنِ اسلام کی بیخ کنی کی اجازت  
 دے دیں اور اس منظر کا بخوشی مشاہدہ کرتے رہیں، لیکن ابو بکر و عمر یقیناً ایسا نہیں  
 کر سکتے تھے۔ یہ باغ، ان کے محبوب آقا نے لگایا تھا۔ اپنے خونِ ناب سے  
 اپنے پاک آنسوؤں سے اس کی آبیاری کی تھی اور اسے جواں کیا تھا۔ اپنے مشد



کی معیت میں انھوں نے بھی اپنی زندگیاں، اپنی توانائیاں اور جملہ صلاحیتیں اس دینِ حق کو پروان چڑھانے میں صرف کی تھیں۔ ان کا ایمان انھیں مجبور کر رہا تھا کہ یہاں مت بیٹھو، بلکہ ایک لمحہ سناٹے کے بغیر اس خطرے کے مقام پر پہنچو جہاں نوزائیدہ اسلام کو خطرہ درپیش ہے۔ اسلام سے قلبی تعلق اور اپنے آقا سے جو عہد وفا انھوں نے باندھا تھا، دونوں کو کشاں کشاں وہاں لے گیا۔ آپ کا قطعاً ارادہ نہ تھا کہ آپ اپنی خلافت کی بیعت لوگوں سے لیں۔ آپ نے تو ایک فتنہ کی آگ بھڑک اٹھنے کی وحشت ناک خبر سنی تھی، اس کو بچانے کے لیے وہاں تشریف لے گئے تھے۔ حالات نے اچانک ایسا رخ اختیار کیا کہ اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہ رہا کہ آپ لوگوں کی بیعت کو قبول کریں۔ ایک لمحہ کی تاخیر کئی محشر بپا کر سکتی تھی۔

چودہ صدیوں کے بعد آج یہ الزام لگانا کہ آپ حضور کو یونہی چھوڑ کر چلے گئے، انھیں خلافت کا لالچ تھا۔ حضور سے محبت نہ تھی، یہ الزام انتہائی غیر ذمہ دارانہ ہے جس شخص نے اپنا تن، من، دھن سب کچھ اپنے ہادی برحق کے قدموں پر نثار کر دیا ہو، جس نے ہر پرخطر موقع پر اپنے آقا کا ساتھ دیا ہو، دنیا کی صحبت میں کوئی بھی جس کے صدق و وفا کا مقابلہ نہ کیا ہو، ایسی ہستی کے بارے میں اس قسم کا تصور بھی دل میں پیدا ہو تو اسے شیطان کی وسوسہ اندازی یقیناً کرنا چاہیے۔

ستیف زنی سادہ میں جو کچھ ہوا، حالت نے بس تیزی سے کروٹ لی۔ اور اس پر جو انٹرنیٹ نتائج مرتب ہوئے، ان کی تاریخی اہمیت ناقابل انکار ہے

اور اس تاریخی حیثیت نے اس واقع کو ایک چیتان بنا کر رکھ دیا ہے بطرح طرح کی روایات کا ایک طومار ہے، جس میں حق کو باطل سے جدا کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ یہاں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتے ہوئے ہم آگے بڑھیں گے۔ ہر قول حکایت کو روایت و درایت کی کسوٹی پر پرکھیں گے، تاکہ حقیقت کا رخ زیبائے کھر کر سامنے آجائے۔ رَبَّنَا عَلَيكَ تَوَكَّلْنَا

اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے ایک حقیقت کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں:

ہر زمانہ کا تالیف و تصنیف کا انداز جدا جدا ہوتا ہے۔ اگر ان خصوصیات کو ہمیشہ نظر نہ رکھا جائے تو ان کتب سے صحیح استفادہ نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ دیگر علوم کی کتب کی طرح تاریخ کی کتب جو مختلف زبانوں میں مرتب کی گئیں ان کا اسلوب نگارش بھی جدا جدا ہے۔ آج کل تاریخ کی کتب کہتے کا طریقہ یہ ہے کہ اگر ایک واقعہ کے بارے میں مختلف اقوال مروی ہوں تو مصنف ان میں سے اپنا پسندیدہ قول نقل کر دیتا ہے اور دیگر اقوال نقل کرنا اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتا۔ لیکن قدامت مؤرخین کا یہ اسلوب نہ تھا۔ انہیں ایک واقعہ کے بارے میں جتنے اقوال ملتے، وہ ان سب کو ضبطاً نقل کر لیا کرتے اور اس کو وہ اپنی علمی دیانت سمجھتے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ہر روایت کی سند بھی بتامہ نقل کر دیتے اور قاری سے یہ توقع رکھتے کہ وہ خود فیصد کر لے کہ ان میں سے کون سا قول صحیح ہے اور کون سا غلط۔ ہمارے طلباء جو آج کل کے مؤرخین کی تصنیفات کے مطالعہ کے عادی ہیں، وہ اس صورت حال سے

واقف نہیں۔ ہر قول جو وہ کسی کتاب میں دیکھتے ہیں اسے مصنف کے سر تھوپ دیتے ہیں کہ طبری نے اپنی تاریخ میں یا ابن اثیر نے الکامل میں یا ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں یوں لکھا ہے، بے شک لکھا ہے، لیکن ساتھ اس کی سند بیان کر کے اس نے اپنی مؤرخانہ ذمہ داری پوری کر دی، اب یہ فرض ہم پر عائد ہوتا ہے کہ ہم سوچیں اور صحیح و سقیم میں امتیاز کریں۔

اب چلتے ہم آپ کو سقیفہ بنی ساعدہ کی طرف لے چلتے ہیں، وہاں جو واقعات رونما ہوئے ان کے بارے میں مختلف روایات آپ کے گوش گزار کرتے ہیں۔ پھر آپ کی عقل سلیم کو زحمت دیں گے کہ وہ خود فیصلہ کرے کہ ان میں سے کون سی بات قابل اعتماد ہے۔

پہلے ہم آپ کی خدمت میں طبری کی روایت کا خلاصہ پیش کرتے ہیں، جس کی ابتداء انھوں نے یوں کی ہے:

حدثنا هشام بن محمد  
عن ابی مخنف... الخ

یعنی یہ واقعہ بیان کیا ہم سے ہشام بن  
محمد نے، اس نے ابو مخنف سے روایت کیا

اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کا اجتماع ہوا جس میں حضرت سعد بن عبادہ نے بھی شرکت کی بیماری کے باعث اپنے بیٹے کو اپنا منکلم بجایا۔ تقریر میں انصار کی خدمات کے طویل تذکرے کے بعد بتایا کہ انصار خلافت کے سب سے زیادہ حق دار ہیں حضور ان کی خدمات سے ہمیشہ خوش ہوتے اور جب یہاں سے نہت ہوئے تو بھی ان سے خوش تھے۔ سب نے ان کی تائید کی، اور فیصلہ کن

اندا میں کہا: ہم تمہیں اپنا خلیفہ مقرر کرتے ہیں۔ ابھی گفتگو کا سلسلہ شروع تھا تو اس امکان پر بحث چھڑ گئی کہ اگر مہاجرین نے اسے نہ مانا تو پھر کیا ہو گا۔ بعض نے کہا اس صورت میں ہم کہیں گے:

إِذَا هُنَّا أَمِيرًا وَهِنًا كُمْ  
 کہ ایک امیر ہم میں سے اور ایک تم  
 میں سے ہو۔

سعد نے سن کر کہا، یہ پہلی کمزوری ہے۔ ایک آدمی بھاگا ہوا حضرت عمر کے پاس آیا، سارا ماجرا کہہ سنایا۔ انھوں نے حضرت صدیق کو باہر بلایا اور سقیفہ کے حالات سے آگاہ کیا۔ دونوں بڑی سرعت سے ادھر روانہ ہوئے۔ راستہ میں ابو عبیدہ بھی مل گئے۔ ان کو بھی ہمراہ لے لیا۔ وہاں پہنچے تو حضرت عمر نے تقریر کرنا چاہی، لیکن حضرت صدیق نے فرمایا: پہلے مجھے کچھ کہہ لینے دو۔ آپ نے مہاجرین کے حقوق کا تذکرہ کیا۔ انصار کے مناقب بھی بیان کئے۔ آخر میں فرمایا:

فَنَحْنُ الْأَمْوَاءُ وَأَنْتُمْ  
 یعنی ہم مہاجرین امیر ہیں اور تم ہمارے  
 وزیر ہو۔

یہ سن کر حضرت جناب بن منذر اٹھ کھڑے ہوتے اور گویا ہوتے۔ انھوں نے انصار کو خوب اکسایا، کہ وہی امامت کے مستحق ہیں۔ انہیں چاہیے کہ اپنے موقف پر ڈٹے رہیں۔ یہ شہران کا ہے، ان زمینوں، باغات کے وہ مالک ہیں۔ یہاں تعداد میں وہ زیادہ ہیں، مہاجرین غریب الدیار ہیں۔ تم نے انہیں اپنے ہاں پناہ دینی ہے، اگر یہ اقتدار میں حصہ دار بننے پر اصرار کریں تو:

بِئْسَ الْأَمِيرُ وَ مِثْلُهُمْ  
 تو پھر ایک امیر ہم میں سے اور ایک

ان میں سے۔

حضرت فاروق اعظم نے فرمایا: دو تلواریں ایک نیام میں نہیں سما سکتیں۔  
 بخدا! اہل عرب تمھاری امامت کو ہرگز تسلیم نہیں کریں گے، جب کہ ان کے  
 رسول قریش سے ہیں۔ حضرت خباب پھر اٹھے اور انصار کو مہاجرین کے خلاف  
 خوب بھڑکایا اور یہاں تک کہہ دیا کہ اگر مہاجرین نے تمھارے اس دعوے کو  
 تسلیم نہ کیا تو انھیں مدینہ طیبہ سے جلا وطن کر دیں۔ حضرت فاروق نے بھی جواباً  
 دھمکی دی۔ حضرت ابو عبیدہ نے فرمایا:

يَا مَعْشَرَ الْاَنْصَارِ اِنَّكُمْ  
 اَوَّلُ مَنْ نَصَرُوا اَزْدًا  
 تَكُونُوا اَوَّلَ مَنْ يَبْدَلُ  
 وَغَيْرُ ط

اے گروہ انصار! تم نے سب سے  
 پہلے اللہ تعالیٰ کے رسول کی مدد اور  
 اعانت کی پس اب اس کو تبدیل  
 کرنے کا آغاز تم سے نہیں ہونا چاہئے۔

یہ سن کر بشیر بن سعد کھڑے ہوئے، کہنے لگے، اے گروہ انصار! ہم نے جو  
 خدمات انجام دی ہیں، ہم اس سے دنیاوی مفاد ہرگز حاصل کرنا نہیں چاہتے۔  
 ہمارا ارادہ تو فقط یہ ہے کہ ہمارا پروردگار ہم پر راضی ہو جائے اور حضور کے حکم  
 کی اطاعت کی توفیق مل جائے۔ (یہاں یہ بھی ذکر کیا کہ) اس نے خزیج کی  
 برتری سے بچنے کے لیے آپ کی بیعت کی۔

انہی دو صاحبان (ہشام اور ابی مخنف) نے ایک دوسری روایت میں کہا  
 ہے کہ حضرت سعد اپنی ہٹ پر پکے رہے اور کہا، بخدا! میں بیعت نہیں کروں گا  
 جب تک میری تزکیش کا آخری تیر بھی ختم نہ ہو جائے۔ یہاں یہ بھی مذکور ہے:

وَكَانَ سَعْدٌ لَا يُصَلِّي  
بِصَلْوَتِهِمْ وَلَا يُجَمِّعُ  
مَعَهُمْ وَيُحْجُّ وَلَا  
يُفِيضُ مَعَهُمْ ۝

یعنی سعد مسلمانوں کے ساتھ نماز بھی  
نہیں پڑھتے تھے۔ نہ ان کے ساتھ جمعہ  
ادا کرتے تھے، نہ حج کرتے تھے، نہ  
ان کے ساتھ افاضہ کرتے۔

طبری ص ۲۱ ج ۳

ان روایات کے مطالعہ سے قارئین کے دل میں انصار کے بارے میں بالعموم  
اور حضرت سعد بن عبادہ اور حباب بن منذر کے بارے میں بالخصوص طرح طرح  
کی غلط فہمیوں کا پیدا ہو جانا بعید از قیاس نہیں، یعنی سب صحابہ اقدار کے بھوکے  
تھے، اس کے لیے مرنے مارنے پر آمادہ ہو گئے۔ حباب نے وہا جبرین کو مدینہ طیبہ  
سے نکال باہر کرنے کی بھی بار بار دھمکیاں دیں اور اپنی قوم کو ان کے خلاف خوب  
بھڑکایا۔ حضرت سعد نے بھی پورا پورا زور لگایا کہ وہ خیف بن جائس اور جب اس  
مقصد میں کامیاب نہ ہوتے تو ساری عمر الگ تھلک بسر کر دی۔ غنہ اور ناراضگی  
کا یہ غام تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر باجماعت نماز ادا کرنے اور جمعہ پڑھنے  
کے روادار نہ تھے۔ قبیلہ اوس نے بے شک حضرت صدیق کی بیعت کی لیکن  
اس لیے نہیں کہ وہ اس منصب جلیل کے مل ہیں، بلکہ بنو خزرج کے حسد کے  
باعث انہیں گوارا نہ تھا کہ خلافت کا منصب انہیں ملے۔ انہیں اس کے سہ  
دل میں پیدا ہوسکتے ہیں اور اگر صورت حال، حقیقت ایسی ہی تھی تو پھر ان لوگوں کو  
تلاش کرنے میں ہماری مدد کیجئے، جن کے مناقب رفیعہ اور اوصاف جمیلہ سے قرآن  
کے صفحات بھرے پڑے ہیں، جن کی لہیت، جن کی خدا شناسی، جن کے جذبہ

ایشارہ خلوص پر نہ صرف امت مسلمہ کو بلکہ پوری انسانیت کو ناز ہے۔

لیکن جو اہل علم، علامہ ابن جریر اور ان کے معاصر مؤلفین کے اندازِ تالیف کو جانتے ہیں، وہ اس قسم کی غلط فہمیوں کا شکار نہیں ہوتے، انھیں علم ہے کہ ابن جریر نے اس روایت کو سند کے ساتھ ذکر کیا۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم راویوں کے بارے میں تحقیق کریں کہ ان کی مرویات پر کہاں تک اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ اس روایت کے پہلے راوی ہشام بن محمد ہیں۔ یہ کون ہیں اور ان کے استاد مکرم ابو مخنف کون بزرگوار ہیں۔ یہ علم ہو جائے تو غلط فہمی کی بدلیاں از خود چھٹ جائیں گی اور حقیقت عیاں ہو جائے گی۔

حافظ شمس الدین الذہبی اپنی کتاب میزان الاعتقاد فی نقد الرجال میں لکھتے ہیں کہ اس کا پورا نام ہشام بن محمد بن السائب البکلی ہے۔ علماء جرح و تعدیل نے ان کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کیا ہے :

قَالَ أَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ إِنَّمَا	یعنی امام احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ وہ
كَانَ صَاحِبَ سَمْرٍ وَ	قصہ گو اور نسب بیان کرنے والا
نَسَبٍ مَا ظَنَنْتُ أَنَّ	میں یہ خیال نہیں کرتا کہ کوئی شخص اس
أَحَدًا يُحَدِّثُ عَنْهُ	سے حدیث روایت کرتا ہے دارقطنی
قَالَ الدَّارِقُطِيُّ وَغَيْرُهُ	کہتے ہیں کہ وہ متروک ہے۔ ابن عساکر
مَتْرُوكٌ قَالَ ابْنُ عَسَاكِرَ	کی رائے ہے کہ وہ رافضی ہے۔ بغیر
رَافِضِيٌّ لَيْسَ بِثِقَةٍ ط	ثقہ ہے۔

(میزان الاعتدال ج ۳ - ۲)

اب ان کے استاد کے بارے میں سنتے۔ ابو مخنف کا نام لوط بن یحییٰ ہے۔

وَقَدْ كَانَ شَيْعِيًّا وَهُوَ  
ضَعِيفٌ عِنْدَ الزُّبَيْدِيِّ  
یہ شیعہ تھا اور ائمہ فن کے یہ ضعیف  
الحديث ہے۔

(البدایہ والنہایہ)

جس روایت کے دوران ہی اس قسم کے ہوں وہ روایت کیونکر قابل اعتنا ہو  
سکتی ہے۔

اسی کتاب کے صفحہ نمبر ۱۹۹ پر ایک دوسری روایت ہے جو صورت حال  
کا بالکل نیا نقشہ پیش کرتی ہے۔ روایت کی ابتداء میں تقریباً وہی حالات مذکور ہیں  
جب حضرات ابو بکر کو سفینہ بنی ساعدہ میں انصار کے اجتماع کی خبر ملی تو آپ حضرت  
عمر اور حضرت ابو عبیدہ کی معیت میں فوراً وہاں پہنچے۔ حضرت عمر اس مجمع سے  
خطاب کرنا چاہتے تھے، لیکن حضرت صدیق خود دویا ہوئے۔ آپ نے اپنے اس  
خطاب میں انصار کے حق میں جو آیات نازل ہوئی تھیں، اور جو ارشادات حضور  
کی زبان فیض ترجمان سے نکلے ہوئے تھے، انھیں ذکر کیا اور فرمایا کہ تمہیں علم ہے کہ  
ایک بار رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر سارے لوگ ایک  
وادی میں چلیں اور انصار دوسری وادی میں چلیں تو میں انصار کی وادی کو اختیار  
کروں گا۔ پھر کہا:

لَتَذَرَنَّ عَلِمْتَ يَا سَعْدُ  
أَنْ رَسُنَ اللَّهُ قَالَ وَ  
أَنْتَ قَاعِدٌ، قَرَيْشٌ  
اے سعد! تم خوب جانتے ہو تم اس  
وقت وہاں بیٹھے ہوئے تھے جب  
رسول اللہ نے یہ ارشاد فرمایا کہ خلافت



وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ  
 الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ مَا نَزَّلْنَا  
 مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِمْ  
 وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ  
 اور بدکار لوگ قریش کے بدکاروں کے  
 تابع رہیں گے۔

یہ سنتے ہی جیسے حضرت سعد کو ہوش آگیا ہو اور ان کی آنکھیں کھل گئی ہوں۔  
 آپ نے کہا:

صَدَقْتُ، فَذَحْنُ الْوُزْرَاءِ  
 وَأَنْتُمْ الْأُمَرَاءُ۔

اے ابوبکر! جو قول رسالت مآب  
 تو نے سنایا ہے یہ سچا ہے۔ میں  
 اپنے دعوے سے دست کش ہوتا  
 ہوں تم امرا ہو اور ہم تمہارے  
 وزرا ہیں۔

(تاریخ طبری ص ۱۹۹ ج ۳)

اس روایت میں نہ حضرت، جناب کی دھمکیاں ہیں اور نہ حضرت سعد کی  
 ہٹ دھرمی اور ضد کا کہیں ذکر ہے۔ ابتداء میں انصار کو یہ خیال گزرا کہ وہ خلافت  
 کے زیادہ حق دار ہیں۔ اسی لیے یہ اجتماع انعقاد پذیر ہوا، لیکن حضرت صدیق رضی اللہ  
 عنہ نے اپنے آقا کا ارشاد سنا کہ خلیفہ قریشی ہونا چاہیے اسی وقت وہ اپنے  
 ہر قسم کے مطالبے سے دست بردار ہو گئے۔ نہ تو تو نے میں میں، نہ کوئی جھگڑا، نہ اظہار  
 انانیت، اللہ تعالیٰ کے محبوب نے بڑی جانفشانیوں سے جو امت تیار کی تھی اس  
 سے اسی قسم کے رویہ کی توقع کی جاسکتی تھی جس امت کے سر پر خود خداوند عالم

خیر الامم کا تاج سجایا، اس کی یہی شان ہونی چاہیے تھی جس امت کی تعریف میں قرآن کے صفحات جگمگا رہے ہیں، اس سے اس کے بغیر کسی چیز کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا۔

علامہ ابن خلدون نے بھی اس رائے کی باریں الفاظ تائید کی:

لَمَّا قُبِضَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى	یعنی اللہ تعالیٰ کے رسول کریم صلی اللہ
اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ	علیہ وسلم نے جب رحلت فرمائی اور شریف
وَكَانَ أَمْرُ الشَّقِيقَةِ كَمَا	کا واقعہ ہوا، جیسے ہم نے پہلے بیان
قَدَّمْنَا أَجْمَعَ الْمُهَاجِرُونَ	کیا ہے تو تمام مہاجرین اور تمام انصاریوں
وَأَنْصَارُ عَلَى بَيْعَةِ ابْنِ	نے حضرت ابوبکر صدیق کی بیعت پر
بَكْرٍ وَلَمْ يَخَالِفِ السُّعْدُ	اتفاق کیا اور سعد کے بغیر کسی نے
إِنْ سَخَّ خِلَافَهُ فَلَمْ	مخالفت نہیں کی بشریکہ سعد کا انصاری
يُلْتَفِتَ إِلَى شَذْوَذِهِ	صحیح سند سے ثابت ہوتا ہے۔

(ابن خلدون صفحہ ۱۵۶ ج ۲)

امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں یہی روایت مخصوص سند کے ذریعہ سے نقل کی حضرت صدیق نے انصاریوں کی تعریف کے بعد حضرت سعد کو مخاطب کرنے ہوئے فرمایا:

وَلَقَدْ عَلِمْتُ يَا سَعْدُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَأَنْتَ قَاعِدٌ قَرِيشٍ وَلَا تَهْدِ النَّاسَ فَبِرَالنَّاسِ تَبِعَ لِبِرْهِمْ وَفَاجِرُهُمْ تَبِعَ لِفَاجِرِهِمْ

فقال له سعد صدقت فنحن الورداء وانتم

الامراء۔

یہ بعینہ وہی الفاظ ہیں جو اوپر مذکور ہوئے۔ ان کا ترجمہ وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

طبقات ابن سعد میں جو روایت ہے اس میں بھی ان امور کا تذکرہ تک نہیں

جو ہشام اور ابو مخنف کی مہربانی سے اس روایت کا حصہ بن گئے ہیں۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کے دونوں قبیلوں (اوس اور خزرج) نے، نیز جو

مہاجرین وہاں جمع ہو گئے تھے۔ ان سب نے حضرت صدیق اکبر کے دست مبارک

پر خلافت کی بیعت کر لی۔ پھر آپ مسجد نبوی میں واپس آئے۔ جن لوگوں نے سقیفہ

میں بیعت نہیں کی تھی، انھوں نے یہاں حاضر خدمت ہو کر بیعت کا شرف حاصل

کیا۔ اس طرح حضرت صدیق اکبر، حضور سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے

جانشین اور امت مسلمہ کے سربراہ چن لیے گئے۔ اس طرح سیاست کے میدان

میں جن انقلاب آفرین تعلیمات کا ذکر حضور نے بار بار فرمایا تھا، آج وہ لباسِ مجاہد

میں دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔

یہاں یہ امر تصفیہ طلب ہے کہ کیا سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے بیعت

کی یا نہیں۔ اگر بیعت کی تو برضا و رغبت یا جبر و اکراہ سے اسی وقت کی یا کچھ عرصہ

گزرنے کے بعد، ان استفسارات کا جواب سننے کے لیے ہر شخص بے چین

ہے۔

اگر ایک لمحہ کے لیے ہم ہر قسم کی روایات سے صرف نظر کر لیں، محض سیرت

مسنوی کی روشنی میں ان سوالات کا جواب تلاش کریں، تو ہم بڑی آسانی سے

اس فیصلہ پر پہنچ جائیں گے کہ آپ نے بیعت کی، اپنی خوشی سے کی اور اسی وقت لی۔ آپ کی لہیت، دین کے لیے آپ کا خلوص، امت مسلمہ کے لیے آپ کا جذبہ خیر اندیشی، آپ کی بے عدیل شجاعت، مزید برآں آپ کی ہمہ صفت مونسوف شخصیت ان تمام خرافات کے ابطال کے لیے کافی ہے۔ لیکن ہم ان روایات سے کلیتہً صرف نظر بھی نہیں کر سکتے۔ روایات کے اس ڈھیر سے نجات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ ہر قول کو روایت و درایت کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ جو بات کھری ثابت ہو اسے قبول کر لیا جائے اور جو پایہ اعتبار سے ساقط ہو اس کو نظر انداز کر دیا جائے۔ سب سے پہلے ناظرین کرام کی خدمت میں وہ روایت پیش کرتا ہوں جس کو شیخ مؤمنین نے بڑی شد و مد سے اپنی کتب میں بیان کیا ہے اور ہر ایک نے اسے مزید رنگین بنانے کے لیے پوری سعی کی ہے، بخدا، جو عایتنا کہ ایسے خرافات ذکر کر کے اپنا وقت بھی ضائع کروا اور قارئین کرام کے اوقات عزیز کو بھی غارت کروا، لیکن محبت کا نقاب اوڑھ کر ناموس اہل بیت کو پامال کرنے والوں نے جو اودھم مچا رکھا ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ حقیقت حال خواہ وہ انتہائی تلخ اور کربناک ہو، قارئین کو اس سے باخبر کیا جائے۔

ناسخ التواریخ کے صفحہ تاریخ الخلفاء کی جلد اول صفحہ ۸۲ سے یہ حکایت شروع ہوتی ہے جو کئی صفحات تک پھیلتی چلی گئی ہے۔

”دوسرے روز مسجد نبوی صحابہ کرام سے کچھ کچھ بھرمی ہے حضرت

عمر کے کفن پر حضرت ابو بکر قنفذ کو بھیجتے ہیں کہ وہ حضرت علی کو حانہ

دربار کریں۔ وہ جاتا ہے، پیغام پہنچاتا ہے حضرت علی اسے جہنم

دیتے ہیں، وہ واپس آجاتا ہے۔ اسے دوبارہ سختی سے حکم دیا جاتا ہے کہ وہ حضرت علی کو پکڑ کر لے آئے۔ حضرت پھر اسے دھمکار دیتے ہیں حضرت عمر ایک جھگڑا آپ کو پکڑنے کے لیے روانہ کرتے ہیں۔ وہ بھی ناکام لوٹتا ہے حضرت عمر غصہ سے بے قابو ہو کر خود جاتے ہیں اور خاتونِ جنت کے دروازے پر کھڑے ہو کر باواز بلند کہتے ہیں :

یا علی بیرون شو و بالخلفہ رسول	اے علی! باہر آؤ اور خلیفہ رسول خدا کی
خدا بیعت کن و گرنہ این خانہ را	بیعت کرو۔ ورنہ اس گھر کو جلا کر رکھ کر
بآتش پاک بسوزم فاطمہ برخاست	کر دوں گا۔ حضرت سیدہ اٹھیں فرمایا:
وقالت یا عمر! مالنا و ملک	اے عمر! ہمارا تیرا کیا واسطہ ہے۔ آپ
وقال افتحی الباب وادعی	نے کہ، دروازہ کھولو، ورنہ تمہارے گھر
احرقنا علیکم بیعتکم	کو تم پر جلا کر رکھ کر دوں گا۔ سیدہ
فقال یا عمر! اتقی	نے فرمایا: اے عمر! کیا تم خدا سے نہیں
اللہ تدخل علی بیعتی -	ڈرتے ہو میرے گھر میں داخل ہوتے ہو۔

حضرت عمر نے جب دیکھا کہ حضرت علی دروازہ نہیں کھولتے، تو حکم دیا کہ آگ اور لکڑیاں لائی جائیں۔ آپ نے دروازہ کو آگ لگا دی جب کچھ حصہ جل گیا، تو پاؤں کی ٹھوک مار کر اسے گرا دیا اور گھر میں گھس آئے۔ حضرت سیدہ نے فریاد کرنا شروع کی اور کہا: یا ابتساء یا رسول اللہ! پھر خطاب نے سیدہ کے پیلو پر تلوار سے ٹھوک لگائی۔ آپ نے دوبارہ فریاد کی۔ حضرت عمر نے آپ کے بازو مبارک پر زور سے

## تازیانہ مارا

حیرت ہے کہ شیرِ خدایہ سب کچھ دیکھتے رہے اور چپ رہے بس سے مس نہیں۔  
 اتنی ٹوہین اور ضربِ شدید کو دیکھ رہے ہیں اور ذوالفقارِ سید رمی کو جنبش تک نہیں  
 دیتے۔ انسان اپنے اوپر تو سختیاں بھی برداشت کر لیتا ہے، لیکن اپنی اہلیہ کے بارے  
 میں ناممکن ہے۔ خصوصاً جب کہ وہ حضور کی لختِ جگر سیدۃ النساء ہو۔

”حضرت سیدہ پھر التجار کرتی ہیں۔ اب حضرت علی کی آتشیں  
 غضب بھڑک اٹھتی ہے اور آپ حضرت عمر کو گریبان سے پکڑ کر زمین  
 پر پٹخ دیتے ہیں۔ حضرت ابو بکر کو پتہ چلتا ہے۔ وہ آپ کی امداد کے لیے  
 چند آدمی بھیج دیتے ہیں۔ آتے ہی یہ لوگ حضرت علی کے ہاتھ سے تلوار  
 چھین لیتے ہیں۔ پھر ان کو دلوچ لیتے ہیں۔ پھر آپ کے گلے میں رسی  
 ڈال لیتے ہیں اور آپ کو کشاں کشاں حضرت صدیق کی خدمت میں لے  
 جاتے ہیں۔ حضرت سیدہ مدافعت کے لیے اٹھ کھڑی ہوتی ہیں قبضہ  
 آپ پر حملہ کرتا ہے اور تازیانہ کی ایک ایسی ضرب بازو پر لگاتا ہے کہ  
 کہ اس کا سیاہ داغ وفات کے بعد بھی بازو مبارک پر باقی رہتا ہے۔  
 حضرت علی کو پکڑ کر حضرت صدیق کی خدمت میں پیش کیا جاتا۔ اس  
 وقت آپ بے حسرت کہتے ہیں کہ اگر میری تلوار میرے ہاتھ سے گرنے پڑتی  
 تو تم مجھے یوں کھینچ کر نہ لاسکتے۔ خدا اس قوم پر لعنت کرے، جنہوں نے  
 میری بیعت کی پھر میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ (العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ)

(خلاۃ منقول از ناسخ التواریخ ج ۱)

خطرہ کے وقت تو بزدلوں کے ہاتھ کا نپتے ہیں اور ان کی تلواریں گر پڑتی ہیں۔ سیدنا علیؑ تو شیرِ خدا ہیں جن کی ضربِ حیدری سے خیر کی سنگین دیواریں پاش پاش ہو گئیں، جن کی گرج سے بڑے بڑے بہادروں کے دل پھیٹ جایا کرتے تھے۔ احد اور حنین کے مشکل اوقات میں ان کے ہاتھ سے تلوار نہ گرمی بخندق کے لئے۔ یہ کام تھا کہ ہاتھ سے تلوار نہ گرمی۔ آپ کی

یہ باتیں سنا کر اس وقت کے مشیر پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ان کے ہاتھ سے تلوار گر پڑی۔ گویا دوسرے لفظوں میں اسے کو بزدلی کا طعنہ دیا جا رہا ہے۔ ایسی باتیں گھڑتے وقت اور آپؑ کی ذات والاصفات کی طرف منسوب کرتے وقت کچھ تو خدا کا خوف کرنا چاہیے۔ اسی پر بس نہیں تہین جاننا

ابوغفاری، مقداد، سلمان فارسی رضی اللہ عنہم کی زبان سے ایسے جملے کہلاتے ہیں جنہیں سن کر بچے بھی ہنسی ضبط نہ کر سکیں۔ یوں اس دوستی کے رنگ میں اسلام دشمنی کا حق ادا کیا جا رہا ہے اور ان سب نفوسِ قدسیہ کی عظمت کو داغدار کرنے کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔ لکھتے ہیں:

اس وقت ابو ذر نے کہا:

لیت السیوف قد عادت

اے کاش! دوبارہ تلواریں ہمارے

یہ دینا ثانیہ۔

ہاتھوں میں لوٹ آئیں۔

مقداد نے کہا:

لو شاء دعا علیہ ربہ

اگر علی مرتضیٰ چاہتے تو ابوبکر کے لیے

عزوجل۔

بدو عا مانگتے۔

سلمان نے کہا:

مولای اعلم بہا میرا آقا جن مشکلات میں مبتلا ہے وہ

ہو فیہ۔ خود ہی ان کو بہتر سمجھتا ہے۔

یہ کردار تو بنی اسرائیل کے حید سازوں کے کردار سے بھی زیادہ مضحکہ خیز ہے

یہ تین بزرگ جو بقول ان کے ایمان پر ثابت قدم رہے، ان کی قوتِ ایمانی کا تو یہ حال ہے، باقی رہے دوسرے صحابہ تو ان کو بیک جنبشِ قلم مرتد قرار دے کر خارج از اسلام کر دیا گیا۔

از ابی جعفر حدیث کفندقان حضرت امام باقر سے مروی ہے کہ

کان الناس اهل ردة حضور کے وصال کے بعد ان تین حضرات

بعد النبی صلی اللہ کے علاوہ باقی سب لوگ مرتد

تعالی الا ثلاثہ۔ ہو گئے۔

اسی پر دل کی حسرت پوری نہیں ہوتی بلکہ مزید رقمطراز ہیں:

”رات کی تاریکی میں حضرت علی نے حضرت سیدہ کو گدھے

پر سوار کیا اور حسنین کریمین کی انگلیاں اپنے ماتھ میں پکڑے ہوتے

ہر انصاری کے گھر لے جاتے ہیں۔ ان سب سے بیعت کرنے کی

درخواست کرتے ہیں۔ لیکن کہیں کامیابی نہیں ہوتی۔ مایوس ہو کر

خانہ نشین ہو جاتے ہیں، یہاں تک آپ کو زبردستی گھر سے نکال

کر جبراً بیعت کے لیے پیش کر دیا جاتا ہے۔ (سبحان اللہ

هذا بہتان عظیم۔) (منقول از تاریخ التواریخ)



معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ محققین بھی ان ہرزہ سرانیوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔  
 نہج البلاغت کے شارح علامہ شمیم بن علی بن شمیم بحرانی لکھتے ہیں:

واعلم انه قد اختلف  
 الناقداون بكيفية حاله  
 بعد وفات رسول الله صلى  
 الله تعالى عليه وسلم - و  
 روى المحدثون من  
 الشيعة وغيرهم اخبارا  
 كثيرة ربا خالف بعضها  
 بعضا بحسب اختلاف اهلهم.

جان لو، کہ سیدنا علی کی حالت کے  
 بارے میں نقل کرنے والوں کے  
 اقوال میں بڑا اختلاف ہے۔ شیعہ  
 محدثین اور غیر شیعہ محدثین نے متضاد  
 روایات بکثرت نقل کی ہیں جن سے  
 ان کی ذاتی خواہشات جھلک رہی ہیں۔

علامہ مذکور نے جہاں یہ واقعہ ذکر کیا ہے وہاں ان خرافات کو بیان  
 نہیں کیا۔ صرف یہ کہا ہے کہ

و بايع معهم علي  
 اكرهاا۔

یعنی جب نبوہاشم نے صدیق اکبر کی  
 بیعت کی تو شہرت علی نے بھی بیعت

۳۶ ج ۲، شرح نہج البلاغت ابن شمیم  
 کی، لیکن مجبوراً۔

اور و سر قول یہ منقول ہے:

ان عليا اعتم بيت  
 فاطمة فعلوا انه  
 مفرد و تركوه۔

حضرت علیؑ نے حضرت سیدہ کے گھر  
 میں پناہ لے لی صحابہ کو معلوم ہوا کہ  
 وہ تنہا ہیں تو انھوں نے آپ کو اپنے

حال پر چھوڑ دیا۔

(صفحہ ۲۶، ج ۲)

فروع کافی میں صرف اتنا ہے۔

جاء و اباہیر المؤمنین مکیھا امیر المؤمنین کو جبراً پکڑ کر لے آئے تو  
قبایح۔ (کتاب الروضہ ص ۸۵، ج ۲) آپ نے حضرت صدیق کی بیعت کر لی۔  
بہر حال علامہ میثم اور علامہ کلین کی تصریحات سے یہ بات تو ثابت ہو گئی کہ  
آپ نے صدیق اکبرؓ کی بیعت فرمائی۔ ان کا یہ اضافہ کہ حالت مجبوری میں آپ نے  
بیعت کی۔ کم از کم ہر اس شخص کے لیے ناقابل تسلیم ہے جو حضرت اسد اللہ الغالب  
کی جرأت، بسالت اور آئین جو انہر دی کی حقیقت کو سمجھتا بھی ہے۔ اور صدقِ دل  
سے اسے تسلیم بھی کرتا ہے، ان خود ساختہ روایات کے لیے یہ واقعہ کافی ہے کہ  
جب تمام لوگ حضرت صدیق اکبرؓ کی بیعت پر متفق ہو گئے تو ابوسفیان بن حرب کو  
یارائے صبر نہ رہا اور اس نے حضرت علی اور حضرت عباس کو طعن و تشنیع سے  
بھڑکانا چاہا۔ کہنے لگا:

فیم ابوبکر من امرکم  
این المستضعفان، این  
الذون یعنی علیا و  
العباس۔ ما بال هذا  
الامر فی اقل حی من  
قریش ط  
یعنی ابوبکر کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ تمہارا  
سربراہ اور امیر بنے۔ وہ دونوں کہ دور  
کہاں میں وہ دونوں ذلیل کہاں ہیں۔  
(یعنی علی اور عباس) کیا وہ ہے قریش  
میں جو سب سے چھوٹا قبیلہ ہے اس  
کا ایک فرد تمہارا حاکم بن جائے۔

پھر وہ حضرت علی کے مکان پر آیا اور آکر کہنے لگا کہ ہاتھ آگے بڑھائیے میں

آپ کی بیعت کرتا ہوں۔

والله ان شئت لاملاذنها  
 علی ابی فصیل یعنی ابا  
 بکر خیل و رجلا۔  
 بخدا اگر آپ حکم دیں تو میں ابو بکر سے  
 مقابلہ کرنے کے لیے اس میدان کو  
 شہسواروں اور پاپیادہ سپاہیوں سے

بھردوں۔

سیدنا علی نے اس کی یہ باتیں سن کر اسے جھڑکتے ہوئے کہا:

یا ابوسفیان ہرگز تو بے غرض  
 بنش نہ کنی، و جز بر ضرر اسلام  
 کوشش نہ فرمائی۔ من ہرگز بکلمات  
 تو مغرور نشوم و ہرگز فریب  
 تو در من نگیرد۔  
 اے ابوسفیان تو بغیر غرض کے حرکت  
 نہیں کرتا۔ تیرا مقصد صرف اسلام کو  
 ضرر پہنچانا۔ میں تیری باتوں سے ہرگز  
 مغرور نہیں ہوں گا، اور تو مجھے اپنے  
 دام فریب میں پھنسا نہیں سکتا۔

آپ کا ابوسفیان کی اس پیش کش کو مسترد کر دینا اور اس کی اس حرکت کو اسلام  
 دشمنی پر محمول کرنا، اس امر کا کھلا ثبوت ہے کہ آپ نے صدقِ دل سے حضرت  
 ابو بکر صدیق کی بیعت فرمائی تھی۔

سید امیر علی جو مشہور قانون دان، مسلمہ مؤرخ اور بنگال ہائی کورٹ کے  
 سب سے پہلے مسلمان جج تھے، اپنی شہرہ آفاق کتاب میں رقم طراز ہیں:

ترجمہ:

حضرت علی المرتضیٰ نے اپنی

اولوالعزمی، اور دین سے بے پناہ

وابستگی اور اپنے آقا کے ماننے  
 والوں کو ہر قسم کے انتشار سے بچانے  
 کے لیے آپ نے فوراً حضرت  
 ابوبکر صدیق کی بیعت کر لی۔ آپ  
 کو تین بار نظر انداز کیا گیا، اور آپ  
 نے ہر بار کسی اعتراض کے بغیر رائے  
 دہندگان کے انتخاب کو صدق  
 دل سے قبول کر لیا۔ آپ نے  
 اپنے کو کبھی بھی خلافت کے لیے  
 امیدوار کی حیثیت سے پیش  
 نہیں کیا۔ آپ کے احباب  
 کے جذبات کچھ بھی ہوں، آپ  
 نے اسلامی مملکت کے کاروبار  
 حکمرانی کو چلانے میں پہلے دو  
 خلیفوں کی ہر طرح امداد بھی کی  
 اور انھیں بہترین مشوروں سے  
 بھی نوازا۔ خلفاء نے بھی ہمیشہ  
 آپ کے مشورے کو عزت اور  
 قدر کی نگاہ سے دیکھا اور حادثہ

نبوی کی جو تشریح آپ نے کی،  
اس کو تسلیم کیا۔

سپرٹ آف اسلام ۲۹۳

مصنفہ سید امیر علی

قارئین کرام کو یہ علم تو ہو گا کہ سید موصوف شیعہ فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی اس وضاحت کے بعد ہر قسم کے شکوک و شبہات کا خاتمہ ہو جاتا ہے، اور ان روایات کی لغویت آشکارہ ہو جاتی ہے، جن میں رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کی عظمت کو داغدار کرنے کے لیے دانسیہ یا نادانستہ ناپاک کوششیں کی گئی ہیں۔

کتب اہل سنت میں جو روایات ثقہ اسناد سے مروی ہیں۔ میں اس مقالہ کا اختتام ان کے ذکر پر کرتا ہوں۔ ان کو پڑھ کر دل بے ساختہ تسلیم کرتا ہے کہ یہی حق ہے اور یہی بات سیدنا علی مرتضیٰ کی شانِ رفیع کے شایاں ہے۔

عن حبیب بن ابی ثابت      یعنی حبیب بن ابی ثابت سے مروی

قال کان علی فی بیتہ      ہے کہ علی مرتضیٰ اپنے گھر میں تشریف

اذ اتی وقیل له قد  
جلس ابو بکر للبیعة  
فخرج فی قمیص ما  
علیه ازار ولا رداء  
عجلا کراهیة ان یبطئ  
عنها فی بیعتہ ثم  
جلس الیہ وبعث  
الی ثوبہ فاناہ فتجلده  
ولزم مجلسہ۔

طبری مک، ج ۳،

فرماتھے۔ ایک آدمی آیا۔ اس نے عرض  
کی کہ حضرت ابو بکر بیعت لینے کے  
لیے مسجد میں تشریف فرما ہیں۔ اس  
وقت آپ نے صرف لمبی قمیض  
زیب تن فرمائی ہوئی تھی۔ جلدی اٹھ  
کھڑے ہوئے مبادا بیعت کرنے میں  
تاخیر ہو جائے۔ اگر بیعت کی اور وہیں  
بیٹھ گئے، کسی آدمی کو کپڑے لانے  
کے لیے بھیجا، د، گھر سے کپڑے لے  
آیا۔ آپ نے انھیں پہن لیا اور اسی  
مجلس میں تشریف فرما ہو گئے۔

اس سے بھی واضح وہ روایت ہے جو حافظ ابو بکر البیہقی نے اپنے جیل القدر  
اسانذہ حدیث کے واسطے سے حضرت ابو سعید الخدری سے روایت کی ہے۔

وصعد ابو بکر المنبر  
ونظر فی وجوه القوم  
ولم یر الزبیر، قال  
دعا بالزبیر فجاء، قال  
قلت، ابن عمہ رسول  
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
حضرت ابو بکر منبر پر تشریف فرما ہوئے  
حاضرین میں اکابر قوم کا جائزہ لیا۔  
حضرت زبیر نظر نہ آئے، انھیں بلائے  
کے لیے آدمی بھیجا، جب وہ آئے تو  
فرمایا، اے اللہ کے رسول کی پھوپھی  
کے فرزند اور اے اللہ کے رسول کے

حواری کیا تم مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنا چاہتے ہو۔ آپ نے عرض کی اے خلیفہ! رسول اللہ! ناراض نہ ہوں۔ آپ اٹھے اور بیعت کر لی۔ حاضرین پر دوبارہ نظر دوڑائی سیدنا علی دکھائی نہ دیتے۔ آپ کی خدمت میں بلانے کے لیے آدمی بھیجا آپ فوراً تشریف لائے ابو بکر صدیق نے فرمایا: اے اللہ کے رسول کے چچا کے فرزند! اور اے حضور کے پیارے داماد! کیا آپ مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے بھی جواب میں کہا کہ اے اللہ تعالیٰ کے رسول کے خلیفہ! اس تاخیر پر آپ ناراض نہ ہوں۔ اٹھے اور آپ نے بھی بیعت کر لی۔

وحواریہ، اردت ان تشق  
عصا المسلمین فقال  
لا تثریب یا خلیفۃ رسول  
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
وقام فبايعه، ثم  
نظر فی وجوه القوم  
ولم یر علیا فدعا  
بعلی بن ابی طالب فجاء  
فقال قلت ابن عم  
رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ  
علیہ وسلم وختنہ علی  
ابنتہ اردت ان تشق  
عصا المسلمین قال لا  
تثریب یا خلیفۃ  
رسول اللہ و بايعه۔  
(البدایہ والنہایہ ص ۲۲۹، ج ۵)

علامہ ابن کثیر نے اس مفہوم کی کئی روایات بھی یہاں نقل کی ہیں۔ پھر لکھتے ہیں:

وهذا الحق فان علی بن ابی  
یہی حق ہے کیونکہ سیدنا علی مرتضیٰ

طالب لم يفارق الصديق  
 في وقت من الاوقات  
 ولم ينقطع في صلوة  
 من الصلوات خلفه و  
 خرج معه الى ذى  
 القصره لما خرج  
 الصديق شاهراً سيفه  
 يريد قتال اهل الردة -  
 ذى القصره کے مقام تک ساتھ رہے۔  
 ایک لمحہ کے لیے بھی صدیق اکبر سے  
 کسی وقت جدا نہیں ہوتے۔ ساری  
 نمازیں آپ کی اقتدار میں ادا کرتے  
 رہے اور جب مرتدین کے ساتھ  
 جنگ کرنے کے لیے حضرت صدیق  
 اکبر اپنی تلوار اہراتے ہوئے نکلے تو  
 علی مرتضیٰ آپ کے ساتھ تھے اور  
 ذی القصرہ کے مقام تک ساتھ رہے۔  
 اللہ تعالیٰ ہمیں صراطِ مستقیم پر ثابِت قدمی سے چلنے کی توفیق عطا فرماتے  
 اور شیطان کی وسوسہ اندازیوں اور ہوا و ہوس کی پیرہ دستیوں سے اپنی  
 حفاظت میں رکھے۔

امین ثم امین

بجاء حبیبہ محمد النبی الامین  
 صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم







رضی اللہ تعالیٰ عنہ  
فاروق اعظم

اور

اہل بیت







اللہ تعالیٰ کے محبوب، رحمت و محبت کے رسول، اخوت و مروت کے داعی صلی اللہ  
تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے جریرہ عرب کا آتش کدہ گلزار خلیل بن گیا۔ جہاں حسد و  
نفرت کے انکارے دہک رہے تھے وہاں الفت و ایثار کے پھول کھل اٹھے، جہاں فتنہ و  
فساد کی آندھیاں چل رہی تھیں وہاں انس و پیار کی باد نسیم اٹھیلیاں کرنے لگی۔ خود بینی و  
خود پرستی کی جگہ ایثار و خلوص کا سکہ رواں ہو گیا، جہاں قدم قدم پر فسق و فجور کے عفریت  
زاو ڈھیر لگے تھے وہاں عفت و پاکبازی کے چمن آباد ہو گئے، جہاں خدا فراموشی کی ظلمتیں  
چھا رہی تھیں وہاں ذکر الہی کی تندیسیں فروزاں ہو گئیں۔

یہ انقلاب، بابرست انقلاب، ہمہ گیر انقلاب کیوں اور کیسے رو پذیر ہوا، اس لیے کہ  
اس انقلاب کا داعی، حسن و جمال کا مرقع زیبا تھا، وہ انسانیت کے مقام رفیع سے کما حقہ  
آگاہ تھا۔ انسانوں کے فکر و عمل میں جو المناک بگاڑ رونما ہوا تھا اس سے اسے از حد دلجو  
اور رنج تھا، ان خرابیوں کو دیکھ کر اس کے دل میں حقارت یا انتقام کے جذبات نہیں بلکہ

ہمدرومی اور خیر اندیشی کے تعمیری جذبات اُدا آتے تھے۔

اپنے حسن و نوازش سے، اپنے کمالات روح پرور سے، اپنی نوتے عفو و کرم سے، اپنی سیرتِ طیبہ کی تابانیوں سے اس نے اپنے حلقہٴ ارادت میں داخل ہونے والوں کے دلوں کو ہر قسم کے رذائل سے پاک کر دیا اور انہیں محبت کے بادۂ کفام سے سرشار کر دیا۔ یہ محبت وہ نہ تھی جس کی علامت آہ سرد و رنگ زرد بتائی گئی ہے، یہ وہ محبت تھی جس میں خلوص و ایثار کی چمک تھی جس کے حوصلے خیر شکن، جس کی ہمت باطل افکن اور جس کے عزم کی تپش سے فولاد بھی پھل جاتا تھا، اسی محبت نے ان کو بھائی بھائی بنا دیا تھا، اسی محبت نے ان کے دلوں میں ہمدرومی کا وہ لطیف اور توانا جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ اگر ایک کے پاؤں میں کانٹا چھتا تھا تو دوسرے کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں۔ اگر ایک کو کوئی گزند پہنچتی تو دوسرا تڑپ اٹھتا تھا، اسی الفت و موانست کی کیفیت کو قرآن حکیم نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

فَالْفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَاصْبِرْتُمْ بِنِعْمَةِ إِخْوَانِنَا۔ (پس اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور اس کی مہربانی سے تم بھائی بھائی بن گئے۔)

محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے درویشوں کے پاس ہی ساز و سامان تھا۔

ان کے دامن میں ایک ایسی دولت تھی جس کی ہر ملک کے انسانی معاشرہ کو ضرورت تھی اور یہ قدسی صفت انسان جہاں گئے بڑی دریا دلی سے اس دولت کو لٹاتے گئے۔

ان کی اس محبت کا مرکز ذاتِ حبیبِ کبریا علیہ الطیب التیۃ و اجمل الثنا تھی۔ یہ اس کے حسن و کمال کے دیوانے تھے، انہیں ان گلیوں سے پیار تھا جو ان کے محبوب کے

خرام ناز سے مشرف تھیں۔ انھیں ان درو دیوار سے عقیدت تھی جہاں ان کا دلر باقامت گزیر  
تھا، وہ پانی جو اس کے جسم اطہر کو چھو جاتا تھا فرط شوق سے وہ اسے اپنے چہروں پر اور اپنے  
سینوں پر مل لیا کرتے تھے۔ اسی کے باعث ان کے چہرے زشکِ آفتاب اور ان کے سینے  
مطلعِ انوار تھے۔

آج کے اس پُراشوب اور پُرخطر دور میں، جب کہ ہم ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح  
بکھر کر رہ گئے ہیں۔ وقت کا اہم تقاضا ہے کہ اسی درسِ محبت کی تلقین کی جائے، دل کے آئینہ پر  
سیگانگی اور نفرت کا جو غبار جم گیا ہے اسے صاف کیا جائے۔ ایک دوسرے کی پڑھی اچھالنے  
میں ہم نے کمال کر دکھایا، ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے، اب تو باز آجائیں، وہ امدتے ہوتے  
طوفان اگر ہمیں ان کی گھن گرج بھی سنائی نہیں دے رہی جو ہمیں بہا لے جانے کے لیے بجلی  
کی سی سرعت اور رعد کی سی تندی سے بڑھتے آرہے ہیں، کیا ہم بیانی اور سماعت دونوں سے  
تو محروم نہیں ہو گئے؟

یہ تندی، یہ تلخی، یہ بدگمانی اور غلط فہمی اسلام کے بدخواہوں اور ہمارے دشمنوں کی تلبیس و  
تزویر کا نتیجہ ہے۔ ہم اسلامی تاریخ کا مطالعہ بھی انہی کی فراہم کردہ عینک سے کرتے ہیں اس  
وجہ سے وہ نورانی عہد بھی گد لایا ہوا نظر آتا ہے۔ جب آفتابِ محمدی کا جلوہ بار تھا۔ اس کے  
نور سے بنیادیں اور پستیاں جگمگا اٹھی تھیں۔ جب چہرے بھی روشن تھے اور نورِ حق سے دل  
بھی منور۔ جو لوگ اس زہر آلود پر و پگنڈے سے متاثر ہو کر حیاتِ انسانی کے اس تابناک روز  
سعید کو دیکھتے ہیں انھیں مطلعِ غبار آلود ہی نظر آتا ہے اور ہادی برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم  
کے آغوشِ تربیت میں پروان چڑھنے والے قدسی صفات لوگوں کا کردار بھی گھٹاؤنا دکھائی  
دینے لگتا ہے۔ (نعوذ باللہ) ہمیں یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اغیار کے ساتھ نیکی اور مروت تو

بڑی دور کی بات ہے اور ان کا بڑا دوتا اپنوں کے ساتھ بلکہ اپنے نبی کے خاندان کے ساتھ بھی غیر منصفانہ ہی نہیں سگدلانا تھا۔

تعجب ہے کہ ہم قرآن کریم کو عظیم و خیر خدا کا کلام لائقین کرتے ہیں اور اس پر ایمان بھی رکھتے ہیں اور اس قرآن میں ہم بار بار پڑھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جو ظاہر و باطن کو حال و مستقبل کو جاننے والا ہے وہ فرماتا ہے کہ میرے محبوب کی یہ امت خیر الامم ہے۔ مہاجرین و انصار کے لیے اجر عظیم اور فردوس بریں کی نوید جانفزا ہے، ان کے سروں پر لقد رضی اللہ عن المؤمنین کا تاج زرنگار سجایا جا رہا ہے، لیکن ہماری سادگی کا یہ عالم ہے کہ اپنے دشمنوں، انہی دشمنوں جن کی سلیب کو ہلال نے سرنگوں کر دیا تھا، جن کے آتش کدوں کو اسلام کے اجر رحمت نے ٹھنڈا کر دیا تھا، کے پروپیگنڈے کو درست ماننے لگتے ہیں یہاں تک کہ سارے ارشادات ربانی اور آیات قرآنی اور ارشادات ربانی بھی ہمارے ذہن سے محو ہو جاتے ہیں۔ اگر ہمارے دشمن کا پروپیگنڈا سچ اور سچ ہے تو پھر کلام الہی کی صدا آیات غلط اور جھوٹی ہو جائیں گی۔ العیاذ باللہ۔

اور لطف یہ ہے کہ جس نے اسلام کی عینی زیادہ خدمت کی اعتراضات کی بوجھاڑ زیادہ اسی پر ہوتی۔ اسلام کی سطوت کا پرچم جس نے زیادہ اونچا لہرایا اسی کو اس معاندانہ اقرار بازی کا زیادہ ہدف بنا پڑا۔ خلفائے راشدین نے اپنے اپنے مبارک زمانہ میں اسلام کی جو خدمات جلیلہ انجام دیں ان کی نظیر نہیں ملتی، لیکن ستم یہ کہ وہی سب سے زیادہ مورد الزام ٹھہرے اور انہی پر من گھڑت جھوٹے الزامات تراشے گئے!

اس طریقہ کار سے دشمن دو فائدے حاصل کرنا چاہتا تھا ایک یہ کہ خود مسلمانوں میں اختلاف و انتشار کا دروازہ کھل جائے اور وہ جھوٹے چھوٹے متحارب گروہوں میں بٹ

کر کمزور ہو جائیں دوسرا یہ کہ دنیا بھر کے پیاسے اپنی تشنہ لہی کا علاج کرنے کے لیے غول در غول اس حشیمہ شیریں کی طرف اُٹے چلے جا رہے تھے وہ رک جائیں جب انھیں یہ سنایا جائے گا کہ اس نبی کے اولین شاگردوں کا یہ حال ہے تو وہ اس سے دور رہنے میں ہی اپنی عاقبت خیال کریں گے۔

حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اولین شاگردوں اولین مرید اور اولین فیض یافتہ صحابہ کرام آپس میں کس طرح شیر و شکر تھے، ان کی محبت و مودت کے رشتے کتنے مضبوط تھے۔ یہ موضوع بڑا شیریں، سرور انگیز اور روح افزا ہے۔

اس صحبت میں میں فقط "فاروقِ اعظم اور اہل بیت" کے موضوع پر اظہارِ خیال کروں گا۔ اس ضمن میں میں یہ عرض کروں گا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفہ ثانی، تمام اہل ایمان کے امیر فاتح ایران و روم، بانی مساجد و معابد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ و ارضاء عننا جن کے نام کی ہیبت سے سارے فرزند برانداز تھے جن کے سایہ سے ابلیس ترساں و لرزاں تھا۔ ایسی جلیل المرتبت ہستی کے دل میں اپنے مادی برحق، مرشدِ کریم علیہ الصلوٰۃ و التسلیم کے خانوادہ طاہرہ کی عظمت و محبت کا کیا عالم تھا۔ دوسری طرف اہل بیتِ اسلام کے اس فرزندِ جلیل کو کس احترام و تعظیم کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔

میں اس مضمون کو تین حصوں میں تقسیم کروں گا:

① عہد رسالت میں حضرت فاروقِ اعظمؓ اور اہل بیت کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔

② اپنے عہدِ خلافت میں ان کی تعظیم و توقیر کس طرح کیا کرتے تھے۔ ان حضرات کا رویہ آپ کے ساتھ کیا تھا۔



③ فاروق اعظم کی شہادت کے بعد ائمہ اہل بیت آپ کے بارے میں کن خیالات کا اظہار فرمایا کرتے تھے:

عہد رسالت پناہ، صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم،

اگر آپ یہ اندازہ لگانا چاہیں کہ کسی کے دل میں آپ کے لیے محبت، احترام اور خیرگالی کے جذبات کی نوعیت کیا ہے تو اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ یہ ملاحظہ کریں کہ وہ آپ کی عزت، آپ کی ناموری اور برتری کا کہاں تک خواہاں ہے؟ اور اس کے لیے کہاں تک سچے دل سے کوشاں ہے۔ یہی وہ معیار ہے جس سے کسی کے دل میں اپنی قدر و منزلت اور خلوص و محبت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

عہد رسالت میں بے شمار ایسے واقعات رو پذیر ہوئے جن سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ حضرت سیدنا فاروق اعظم کے دل میں حضرت سیدنا علیؑ کی بے پناہ محبت تھی اور آپ ان کو انتہائی عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ آپ کی عزت و برتری کے صدق دل سے خواہاں تھے اور اس کے لیے پورے خلوص سے کوشاں رہتے تھے، لیکن میں یہاں اس عہد کے صرف چند واقعات ذکر کرنے پر اکتفا کروں گا جن کے مطالعہ سے ہر منصف مزاج صحیح فیصلہ پہنچ سکے گا۔

حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی چار صاحبزادیاں تھیں، چاروں سر اپا نور اور پیکرِ یمن و سعادت تھیں حضور کو سب سے قلبی انس اور دلی محبت تھی لیکن ان سب میں خاتونِ جنت، بتول زہرا سیدۃ النساء حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا جو مقام تھا وہ بے مثل اور بے نظیر تھا۔ رافدوان عالم کن فکان عنیہ نساوۃ والسلام کو آپ سے حد درجہ کی الفت و محبت

تھی۔ ان کے یمانے سعادت پر جو انوار و تجلیات برستے تھے، ان کی شان ہی زالی تھی علم لدنی اور معرفت الہی کے جو چشمے آپ کی ذاتِ اطہر سے نکل کر ایک دنیا کو سیراب کرنے والے تھے، ان کی بدولت نگاہِ مصطفوی میں آپ کا خاص مقام تھا۔ جب بھی کاشائے نبوت میں شرفِ نیاز حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوتیں تو اللہ تعالیٰ کے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مکرآتے ہوئے انھیں خوش آمدید کہتے اور فرطِ مسرت سے اٹھ کر ان کا استقبال کرتے۔

حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی قسم کی نسبت بھی باعثِ سعادت دارین ہے پھر جس کو حضور کی اس لختِ جگر اور نورِ نظر کا رشتہ مل جائے اس کی عظمتِ شان اور رفعتِ مرتبت کا کون اندازہ لگا سکتا ہے اور اس سعادت کے حصول کے لیے کئی حضرات نے درخواست کی لیکن جواب ملا کہ یہ رشتہ حسبِ وحی الہی طے پائے گا۔

ایک روز حضرت ابو بکر صدیق، حضرت فاروق اعظم اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہم اکٹھے بیٹھے تھے۔ حضرت صدیق نے دونوں حضرات سے کہا کہ چلو، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس چلیں اور انھیں کہیں کہ وہ حضور سے یہ رشتہ طلب کریں اگر غربت اور افلاس کے باعث وہ یہ رشتہ طلب کرنے سے ہچکچا رہے ہوں تو ہمارے مال ان کے لیے حاضر ہیں۔ ہم ہر طرح ان کی مالی اعانت کریں گے۔ صاحبِ کشف الغمہ کے الفاظ یہ ہیں: فان منعہ قلہ ذات الید و اسیناہ و اسفعاہ۔

حضرت سعد نے کہا، اے ابو بکر! اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ بہتر کاموں کی توفیق بخشتا ہے اٹھو اللہ تعالیٰ کی برکت و مین پر توکل کرتے ہوئے علیؑ کے پاس چلیں۔

حضرت سلمان فارسی فرماتے ہیں کہ تینوں حضرات آپ کی تلاش میں مسجد سے نکلے گھر سے دریافت کیا آپ وہاں پر موجود نہ تھے۔ آپ اپنے اونٹ کے ذریعے پانی نکال کر

ایک انصاری کا باغ سیراب کرنے گئے تھے بسبب اس باغ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب حضرت علیؑ نے ان حضرات کو آتے ہوئے دیکھا تو پوچھا کیسے تشریف آوری ہوئی؟ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خیر و خوبی کی کوئی ایسی خصیلت نہیں جس میں آپ کو سبقت اور فضیلت حاصل نہ ہو حضورؐ کے ساتھ رشتہ میں صحبت میں اور تہجد اسلام میں جو آپ کا مقام ہے وہ بھی کسی پر مخفی نہیں۔ سردارانِ قریش نے حضورؐ سے حضرت فاطمہ کا رشتہ طلب کیا ہے لیکن کامیاب نہیں ہوتے، آپ اس سعادت کے حصول کے لیے کیوں عرض نہیں کرتے، مجھے قومی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول کریمؐ اس رشتہ کو آپ کے لیے روکے ہوئے ہیں۔

یہ سن کر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آنکھوں میں آنسو اُڑاتے۔ فرمایا: اے ابوبکر! آپ نے میرے پرسکون جذبات میں ہیجان پیدا کر دیا اور ایک خوابیدہ تمنا کو بیدار کر دیا۔ میں تیرے اس سعادت کے حصول کا متمنی ہوں، لیکن مفلسی اور تنگ دستی کے باعث اس خواہش کے اظہار کی جرأت نہیں کر سکتا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا:

لَا تَقْلُ هَذَا يَا أَبَا الْحَسَنِ فَإِنَّ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا عِنْدَ اللَّهِ  
تَعَالَى وَعِنْدَ رَسُولِهِ صَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ  
كَهَبَاءٍ مَنْشُورٍ۔

اے ابوالحسن! ایسا مت کہو، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم کے نزدیک

دنیا و مافیہا کی قدر و منزلت ایک ذرہ کے برابر بھی نہیں۔

پناہچہ ان حضرات کے مشورے اور توجہ افزائی سے سیدنا علیؑ بارگاہِ نبوت میں حاضر

ہوئے۔ ان کی عرضداشت تشریف قبولیت سے مشرف ہوئی۔ آپ فرماتے ہیں: میری خوشی کی

کوئی انتہا نہ رہی، میں جلدی سے باہر آیا تو حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کو منتظر پایا انھوں نے پوچھا کیا ہوا؟ میں نے جب یہ خوشخبری انھیں سنائی تو ان کو بے انداز فرحت اور مسرت نصیب ہوئی اور ہم اکٹھے مسجد میں گئے۔

فَرِحًا بِذَلِكَ فَرِحًا شَدِيدًا وَرَجَعًا مَعِيَ إِلَى الْمَسْجِدِ

میں نے یہ واقعہ کشف الغمہ جلد اول صفحہ ۲۷۸، ۲۸۳، ۲۸۴ سے نقل کیا ہے اور مصنف کی عبارت کے لفظی ترجمہ پر اکتفا کیا ہے۔

بعینہ انہی الفاظ کے ساتھ یہ واقعہ تاریخ جلد سوم جز اول کے صفحات ۳۷، ۳۸، ۳۹ پر مرقوم ہے۔

اس واقعہ کو پڑھنے کے بعد آپ کے دل میں اس کے سوا اور کیا تاثر پیدا ہو سکتا ہے کہ حضرت ابو بکر، اسی طرح فاروق اعظمؓ کی یہ قلبی آرزو تھی کہ یہ سعادت حضرت سیدنا علیؓ کو نصیب ہو، اس کے لیے ان حضرات نے ہی آپ کو مشورہ دیا، آپ کی حوصلہ افزائی کی۔ اور مالی اعانت کی پیش کش کی اور جب یہ سعادت آپ کو حاصل ہوئی تو اپنی انتہائی خوشی اور بے پایاں روحانی فرحت اور شدید مسرت کا اظہار کیا، کیا ایسی سعادت کے حصول کا مشورہ اپنے دشمن اور بدخواہ کو دیا جاتا ہے یا اُسے جو جان سے بھی عزیز تر ہو، ایسی لازوال سعادت کے حصول پر دوستوں کو خوشی ہوتی ہے یا دشمنوں اور بدخواہوں کو، آپ خود ہی فیصلہ فرمادیں! ایک اور واقعہ سماعت فرمائیے:

غزوہ خندق کے موقع پر عرب کا بہادر شہسوار اور نامور جنگجو عمر بن عبدودؓ دعوت مبارزت دے رہا ہے، سیدنا علیؓ رضی اللہ عنہ اس کی دعوت کو قبول کرتے ہوئے میدان میں اترتے ہیں۔ دونوں بہادر تھے، دونوں کی جنگی مہارت ضرب المثل تھی جب آمنے سامنے ہوئے

تو عمر بن عبدود نے کہا: میں تیرے جیسے کریم النفس کو قتل کرنا پسند نہیں کرتا نیز تیرا باپ میرا بھائی  
 دوست تھا۔ شیر خدا نے جواب دیا: لیکن میں تجھے قتل کرنا پسند کرتا ہوں۔ وہ اپنے گھوڑے  
 سے اتر آیا۔ دونوں بہادر ایک دوسرے پر حملہ کرتے رہے۔ اتنی گرداڑی کہ دونوں نظروں سے  
 اوجھل ہو گئے۔ اچانک شمشیر اسد اللہی بجلی کی سرعت سے چمکی اور اس پر گرمی، اس کے خود،  
 اس کے زرد کو کاٹتی ہوئی، اس کے جسم میں پیر گئی۔ وہ لڑکھڑایا اور دھڑام سے زمین پر آگرا۔  
 آپ نے اس کا سر کاٹا اور حضور کے قدموں پر لگا کر ڈال دیا۔ شکر اسلام نے شیر خدا کی اس  
 کامیابی پر نعرہٴ تکبیر بلند کیا۔ اس کامیابی پر حضرت صدیق اور حضرت فاروق کو کمال مسرت  
 ہوئی، فریاد مسرت سے دونوں اٹھے اور حضرت علیؑ کے سر مبارک کو آکر چوم لیا۔  
 فقام ابوبکر و عمر فقلا راس علیہ علی۔

(کشف الغمہ جلد اول ص ۲۴۳)

اظہار مسرت میں یہ وارفتگی دوست کے لیے ہوتی ہے یا اس کے لیے جس کے لیے  
 دل میں کدورت اور حسد و عناد کے جذبات پرورش پا رہے ہوں؟  
 اگر آپ عہد رسالت کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو صدی ایسے واقعات ملیں گے  
 جن سے ان حضرات کی باہمی محبت، خلوص، ایثار اور خیر اندیشی کے تابندہ جذبات کا علم ہوگا۔

## عہدِ فاروقی

آئیے! اب اس عہدِ ہمایوں کی طرف چلیں، جب اسلامی عنایت کا آفتاب نصف النہار  
 پر چمک رہا تھا جب ممالک اسلامیہ میں داخلی طور پر مکمل امن و سکون تھا اور ہر صبح مختلف جنگی  
 محاذوں سے نئی فتح و کامرانی کا مژرہ لے کر طلوع ہوتی تھی جب اسلام کا جامع نظامِ حیات

پوری آب و تاب سے نافذ تھا اور اپنے فیوض و برکات سے اسلامی قلمرو کے ہر گوشہ کو سیراب کر رہا تھا۔ یعنی جب امت مسلمہ کی زمامِ قیادت امیر المؤمنین حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دست مبارک میں تھی۔ آئیے دیکھیں اپنی شہرت و عروج کے اس رویش صفت امیر المؤمنین کے دل میں خانوادہ نبوت کی کتنی قدر و منزلت تھی، آپ کس طرح ان حضرات کا احترام اور عزت کیا کرتے تھے، کس طرح خلوص و شوق سے ان کی ہر طرح کی خدمت بجالایا کرتے تھے، اس کے پہلو بہ پہلو یہ بھی ملاحظہ کریں کہ ان ایام میں اہل بیت کرام کے آپ سے تعلقات کی نوعیت کیا تھی، ان واقعات کا سلسلہ اتنا طویل ہے کہ اس مختصر مقالہ میں اس کا ذکر ممکن نہیں۔ چیدہ چیدہ واقعات کی نشاندہی پر قناعت کرنا ہوگی۔ ان کے مطالعہ سے ہی بفضلہ تعالیٰ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی۔

حضرت سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ، حضرت فاروق اعظم کی مجلس شوریٰ کے رکن رہیں تھے جب بھی کوئی سیاسی جنگی یا فتنی سچیدہ سچیدہ پیش آتا آپ فوراً مجلس شوریٰ کا اجلاس طلب کرتے، ساری صورت حال اس مجلس کے سامنے رکھ دی جاتی، ہر شخص اپنی صوابدید کے مطابق بڑی آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کرتا۔ حضرت فاروق اعظم اسی فیصلہ کے مطابق عمل کرتے جو باہمی بحث و تمحیص سے طے پاتا۔ ان تمام مجالس میں سیدنا علی مرتضیٰ بھی شرکت فرماتے، بڑے خلوص اور شوق سے بحث میں حصہ لیتے اور اپنی رائے کا اظہار فرماتے۔ حضرت فاروق اعظم اکثر آپ کی رائے کو ترجیح دیتے۔

پہلا واقعہ میں ناسخ التواریخ کی تاریخ الخلفاء جلد دوم مطبوعہ تہران سے نقل کر رہا ہوں۔ ”پے درپے شکستیں کھانے کے بعد یزدجرد شہنشاہ ایران نے اپنی عظیم سلطنت کو بچانے کے لیے آخری بار سردھڑ کی بازی لگانے کا فیصلہ کیا۔ ایران کا شہر بہ کار، گرگ باران، دیدہ

سپہ سالار فیروزان جس کی جنگی مہارت اور شجاعت کی دھاک سارے ایران میں بھٹی ہوئی تھی،  
 نہاد میں مقیم تھا۔ یزدجرد نے اپنی مملکت کے باقی ماندہ تمام صوبوں میں یہ احکام بھیجے کہ  
 عربوں کو ہمیشہ کے لیے کھل کر رکھ دینے کے لیے ہر علاقے کے بہادر جنگجو فیروزان کے پرچم  
 تلے نہاد میں جمع ہوں، حکم سنتے ہی ایران کے دور دراز علاقوں سے ٹڈی دل لشکر ہر قسم کے  
 ساز و سامان سے لیس نہاد پہنچنا شروع ہو گئے۔ ڈیڑھ لاکھ کا لشکر جبار جمع ہو گیا۔ اس کے  
 علاوہ جنگی ہاتھیوں کی ایک کثیر تعداد بھی وہاں پہنچ گئی۔ مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے زور شور  
 سے تیاریاں شروع ہو گئیں۔ فیروزان کی امداد کے لیے ایرانی فوج کے دوسرے مشہور سالار  
 سروشان بن اسفندیار، سفار بن نرزاو، جہانید بن فیروز بھی وہاں پہنچ گئے، انھوں نے قسمیں  
 اٹھائیں کہ جب تک عرب غازیوں کو تیغ نہ کر دیں گے اور ان کے دین کو پامال اور  
 برباد نہ کر دیں گے، اس وقت تک وہ میدان جنگ سے منہ نہیں موڑیں گے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو جب ان کی تیاریوں کی اطلاع ملی تو فوراً مجلس شوریٰ  
 کا اجلاس طلب کیا۔ سب اراکین تشریف فرما ہوتے، اس نازک صورت حال سے عہدہ برآ  
 ہونے کے لیے گفتگو شروع ہوئی۔ سیدنا علی مرتضیٰ بھی اس اجلاس میں موجود تھے۔ حضرت  
 طلحہ، زبیر، عثمان اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنی اپنی تجاویز پیش کیں۔ بعض نے یہ  
 رائے دی کہ امیر المؤمنین خود تشریف لے جائیں اور اپنے لشکر کی قیادت کریں۔ آپ نے  
 حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا آپ کی رائے کیا ہے؟ آپ نے جن الفاظ سے اپنی رائے  
 کا اظہار کیا ناسخ التواریخ کے حوالے سے بعینہ نقل کر رہا ہوں۔

إِنَّ هَذَا الْأَمْرَ لَمْ يَكُنْ نَصْرُهُ وَلَا خِذْلَانُهُ بَكَثْرَةٍ

وَلَا بِقَلَّةٍ وَهُوَ دِينُ اللَّهِ الَّذِي أَظْهَرَهُ وَجَنَدُهُ الَّذِي

اعداء و امداء حتی بلغ ما بلغ و طلع حيث طلع ونحن  
 علی مرعوی من اللہ و اللہ منجز وعدہ و ناصر جنده  
 رالعرب الیوم و ان کانوا قلیلاً فہم کثیرون بالاسلام  
 و عزیزون بالاجتماع فکن قطبا و استدر الرحی  
 بالعرب و اصلہم دونک نار الحرب الی آخرہ۔

ترجمہ: اس امر یعنی اسلام کی فتح و شکست کا دار و مدار کثرت و قلت پر نہیں بلکہ  
 یہ اللہ تعالیٰ کا دین ہے جس کو اس نے غالب کر دیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے  
 جس کو اس نے تیار کیا ہے اور اس کی امداد فرماتی ہے۔ اسی وجہ سے وہ ترقی و  
 کامیابی کی اس منزل تک پہنچا ہے اور ہمارے ساتھ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے، اللہ  
 تعالیٰ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا اور اپنے شکر کی نصرت فرمائے گا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔  
 اہل عرب آج اگرچہ لمجاظ تعداد تھوڑے ہیں لیکن وہ اسلام کی برکت سے بہت زیادہ  
 ہیں اور اپنے اتفاق و اتحاد کے باعث یہ طاقتور اور غالب ہیں۔ (اے امیر المؤمنین!)  
 آپ قطب بن جایتے اور عربی شکر کی چکی کو چلائیے۔ یہیں سے کفار کو جنگ کی  
 آگ میں جھونکتے رہتے۔

اس کے بعد آپ نے اپنی اس حکیمانہ رائے کی حکمت بیان فرمائی۔  
 اس اندازِ کلم اور اسلوب بیان میں خلوص و محبت کا جو نور جگمگا رہا ہے اسے ہر چشم بینا  
 دیکھ رہی ہے۔

جو لوگ حضرت فاروق اعظم اور سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما کے تعلقات کو شیدہ،  
 مخاصمانہ بلکہ معاندانہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اس عبارت کے خط شیدہ



جملوں کو پھر غور سے پڑھیں۔ علی مرتضیٰ حضرت فاروق کے دین کو اللہ تعالیٰ کا دین، آپ کے شکر کو اللہ تعالیٰ کا شکر کہہ رہے ہیں۔ نیز بڑی وضاحت سے اعلان فرما رہے ہیں کہ یہ وہ شکر ہے جس کی مدد اور نصرت کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہوا ہے اور وہ اپنا وعدہ ضرور پورا فرمائے گا۔ آپ حضرت فاروق کو قطب فرما رہے ہیں جس کے ارد گرد چکی گھومتی ہے اگر وہ ذرا بھی اپنی جگہ سے سرک جائے گا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔

یہی عبارت خراج البلاغہ ص ۲۸۳ جلد اول مطبوعہ مصر میں موجود ہے۔

(۲) جب ایران کے تقریباً سارے علاقے فتح ہو گئے اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے خراسان پر لشکر کشی کی اجازت طلب کی تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اجازت دینے سے انکار کر دیا، کیونکہ مسافت بہت طویل تھی، راستہ میں لق و دوق صحرا، گھنے جنگل اور دشوار گزار پہاڑ تھے۔ آپ مسلمان مجاہدین کو اس تکلیف سے بچانا چاہتے تھے، لیکن جب حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے خراسان کی اہمیت بتائی اور اس کو فتح کرنے کا مشورہ دیا تو آپ کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے حضرت فاروقؓ نے خراسان پر حملہ کرنے کی اجازت دی۔۔۔

(ناسخ التواریخ، تاریخ الخلفاء جلد ۳ ص ۳۵)

(۳) اسی طرح شام و فلسطین میں پے در پے شکستیں کھانے کے بعد رومی سپہ سالاروں نے بھی ایک مقام پر اپنا لشکر جوار جمع کیا تاکہ مسلمانوں سے فیصلہ کن لڑائی لڑیں، اس کی اطلاع جب امیر المومنین کو ملی تو آپ نے اپنی مجلس شوریٰ کا پھر ہنگامی اجلاس طلب کیا۔ سب اراکین مجلس شریک ہوتے خوب گرما گرم بحث ہوتی۔ آپ نے خود میدان جنگ میں جانے کا عزم کیا تو سیدنا علیؓ نے اس کی تائید نہ کی۔ چنانچہ آپ نے ان کے مشورہ پر ہی عمل کیا۔ اس موقع پر بھی حضرت علیؓ کے ایمان افروز ارشادات آپ کی خصوصی توجہ کے

مستحق ہیں۔ آپ نے فرمایا:

قد توکل الله لاهل هذا الدين باعزاز  
الحرزة وشتر العورة والذى نصرهم وقليل لا يتصرفون  
ومنعهم هم قليل لا يمتنعون حتى لا يهوت - رنج بلاغہ ص ۲۴  
جلد اول

ترجمہ: یعنی اللہ تعالیٰ نے ملت اسلامیہ کی سرحدوں کی حفاظت اور ان کی کمزوریوں  
کی پردہ پوشی کا خود ذمہ لیا ہے۔ وہ ذات جس نے اس وقت ان کی نگہبانی کی  
جب وہ انگیحوں پر گئے جاسکتے تھے اور ان میں مقابلہ کی سکت نہ تھی اور جس نے  
اس وقت ان کی نگہبانی کی جب وہ قتل کیے تھے اور اپنا تحفظ خود کرنے سے قاصر تھے  
وہ خدام نہیں کیا زندہ ہے، وہ اب بھی ان کی مدد فرمائے گا اور ان کی حفاظت  
کرے گا۔

بہت سے واقعات ہیں سے صرف چند واقعات کے ذکر پر اکتفا کر رہا ہوں ان کے  
مطالعہ سے ہی چند امور بالکل واضح ہو گئے ہوں گے کہ حضرت علیؑ مجلس شوریٰ کے رکنِ کلین  
تھے۔ سبازیل مرحلہ پر اس کے اجلاسوں میں شرکت فرماتے بڑے خلوس اور جرات سے اپنا  
منورہ پیش کرتے۔ حضرت فاروق اعظمؓ کے دین کو اللہ تعالیٰ کا دین، آپ کے شکر کو  
اللہ تعالیٰ کا شکر یقین کرتے تھے اور صاف صاف اعلان کرتے تھے، یہ وہ لشکر ہے  
جس کی نصرت کا وعدہ خداوند و الجلال نے کیا ہے اور وہ اپنا وعدہ ضرور پورا فرمائے گا۔ نیز یہ  
بھی پتہ چل گیا کہ حضرت فاروق اعظمؓ آپ کے مشوروں کو قدر و وقعت کی نگاہ سے دیکھتے  
اور ان پر عمل کرتے۔

آپ صرف مجلس حربیہ (دار کونسل) کے ممبر ہی نہ تھے بلکہ مجلس قانون ساز میں بھی آپ برابر شریک ہوتے تھے اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ آپ کے فقہی اجتہادات اور شرعی آرا کو بھی بڑی اہمیت دیتے تھے۔

ایک دفعہ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ جو مغربی محاذ کے کمانڈر انچیف تھے کو اطلاع ملی کہ عیسائیوں کی دیکھا دکھی بعض مسلمان بھی شراب کی طرف راغب ہونے لگے ہیں۔ آپ نے امیر المؤمنین کو صورت حال سے آگاہ کیا اور پوچھا کہ ایسے لوگوں کو کیا سزا دینی چاہیے۔ حضرت فاروق اعظم کو بڑی فکر لاحق ہوئی۔ مجلس قانون ساز کے اعضاء کو طلب کیا گیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی تشریف فرما تھے اور آپ کے مشورہ کے مطابق شرابی کے لیے اسی درے کی سزا تجویز ہوئی جس پر تمام صحابہ نے اجماع کیا۔ آپ نے یہ حد مقرر کرنے کی وجہ ان الفاظ میں بیان کی:

ان السكران اذا سکر هذی واذا هذی افتری

واذا افتری فعليه ثمانون۔

ترجمہ: یعنی جو نشتے میں مدہوش ہوتا ہے وہ جو ہذیان بکتا ہے وہ افترابازی کرتا ہے اور جو افترابازی کرے اس کی سزا اسی درے ہے اس لیے شراب خور کی سزا بھی اسی درے ہوگی۔

حضرت فاروق اعظم نے یہی حکم حضرت ابو عبیدہ کی طرف لکھ بھیجا اور آج تک امت کا اسی پر عمل ہے۔

حضرت سیدنا علی کی اصابت رائے، اظہار رائے میں جرأت نیز بے پایاں خلوص اور محبت کے باعث حضرت فاروق اعظم کو آپ پر اس قدر اعتماد اور وثوق تھا کہ مملکت اسلامیہ

کے تمام اہم معاملات میں آپ سے ضرور صلاح مشورہ کیا کرتے۔ آپ اکثر یہ دعا مانگا کرتے:

اللہم لا بنقنی لمعضلة نيس لها على رضى الله عنه

الہی! مجھے اس وقت زندہ نہ رکھنا کہ جب کوئی مشکل درپیش آئے اور اس کو

حل کرنے کے لیے علی مرتضیٰ میرے پاس موجود نہ ہوں۔

یہ ساری باتیں باہمی محبت، باہمی اعتماد اور پیار کی ہیں ان روشن حقائق کو جب انسان

دیکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں رہتا، فَأَلْفَ بَيْنَ

قُلُوبِنَا فَاصْبِحْتُمْ بِبِعْمَتِهِ إِخْوَانًا.

ان واقعات سے کوئی فہم اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائے کہ حضرت فاروق اعظم معاملات

کو سمجھنے سے قاصر تھے یا مہات امور کو حل کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے۔ وہ بستی جن کی پیش کردہ

تجاویز (حرمت شراب، اہمات المؤمنین کا پردہ کرنا وغیرہ) کی تائید میں آیات قرآنی کا نزول

ہوا جن کی آراء کو فرمان خداوندی نے حکم اور قانون کا درجہ دیا۔ خود حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ و

آلہ وسلم جن سے مشورہ فرمایا کرتے تھے جن کے حسن تدبیر اور سیاسی بصیرت کی بدولت اسلامی

مملکت فرورس بریں کا نقشہ پیش کرتی تھی۔ ایسی بستی کے بارے میں ایسی غلط فہمی کا وہی تیسکا ہو سکتا

ہے جو خود عقل و دانش سے بے بہرہ ہو جس کی اپنی چشم خورد کو رہے۔

حکومت سے متعلقہ امور کے علاوہ بھی آپ خاندان نبوت کا ہر طرح ادب و احترام کرتے

چنانچہ جب بیت المال سے وظائف اور مشاہرات متعین کرنے کا وقت آیا تو بعض لوگوں

نے مشورہ دیا کہ کیونکہ آپ امیر المؤمنین اور خلیفہ الرسول ہیں اس لیے ان دفاتر میں آپ کا اور آپ

کے اہل خاندان کے نام سرفہرست ہونے چاہئیں۔ آپ نے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ فرمایا: سب

سے پہلے قبیلہ بنی ہاشم کے افراد کے نام لکھے جائیں گے، کیونکہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا

خاندان ذی اعتشام ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عم محترم حضرت عباسؓ، ان کے بعد حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے اسماء گرامی لکھے گئے، پھر دوسرے ہاشمیوں کے نام درج ہوئے و طائف اور نخواہوں میں بھی یہی ترتیب ملحوظ رکھی گئی بسبب سے زیادہ نخواہیں اصحاب بدر کے لیے مقرر کی گئیں حضرت حسنین کرمین اگرچہ غزوہ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے لیکن قرابت نبوی کے باعث ان کے و طائف اہل بدر کے برابر رکھے گئے۔

اگرچہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دل میں خاندان نبوت کا حد درجہ احترام نہ ہوتا تو آپ اپنا نام سرفہرست لکھواتے اور حضرات حسنین کے لیے بدریوں کے برابر وظیفہ مقرر نہ کرتے کیونکہ وہ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ کوئی شخص آپ پر اعتراض بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن آپ کے دل میں اپنے آقا اور مرشد کرمی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اور حضور کے خاندان کی جو محبت تھی، جو جذبہ نیاز تھا، اس کے پیش نظر آپ نے جو کچھ کیا، یہ عین صواب تھا۔

ایک اور ایمان پرور اور بصیرت افروز واقعہ سماعت فرمائیے، حضرت فاروق اعظم کے دل میں خاندان نبوت کی جو قدر و منزلت اور حضرت امام حسینؓ کی جو عزت اور محبت موجود تھی اس کو ثابت کرنے کے لیے اس کے بعد کسی اور دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

آپ کے عہد مبارک میں ایران اسلامی قلمرو میں داخل ہوا، یزدجرد شہنشاہ ایران کی شہزادی آپ کے دربار میں پیش کی گئی، اگرچہ آپ کے اپنے بچے موجود تھے جو صورت و سیرت میں، اخلاق و محامد میں اپنی مثال آپ تھے، اگر آپ چاہتے تو دختریزدجرد کو کسی اپنے بیٹے کو دے دیتے لیکن آپ کی نگاہ انتخاب صرف سیدنا امام حسین علیہ السلام پر پڑی اور حضرت مانی شہربانو کا عقد آپ کے ساتھ کر دیا گیا۔ اس واقعہ کو میں اصول کافی کے حوالہ سے ناظرین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں:

عَنْ أَبِي جَعْفَرٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَمَّا قَدِمَتْ بِنْتُ يَزْدَجَرْدَ  
 عَلَى عُمَرَ اشْرَفَ لَهَا عَذَارَى الْمَدِينَةِ وَاشْرَقَ الْمَسْجِدُ بِضَوْءِهَا  
 لَمَّا دَخَلْتَهُ وَلَمَّا نَظَرَ إِلَيْهَا عُمَرُ غَطَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ ائْتِي رُوحَ  
 بَاذَهْرَمَزُوقٍ وَقَالَ عُمَرُ أَتَشْتَمُنِي هَذَا، وَهَمَّ بِهَا وَقَالَ لَهُ أَمِيرُ  
 الْمُؤْمِنِينَ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَيْسَ ذَلِكَ خَيْرَ لَهَا رَجُلًا مِنَ الْمُسْلِمِينَ  
 وَاحْسِبْهَا بِفَعْنٍ وَخَيْرَهَا وَجَاءَتْ حَتَّى وَضَعَتْ يَدَهَا عَلَى  
 رَأْسِ الْحُسَيْنِ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَقَالَ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ مَا اسْمُكَ  
 فَقَالَتْ جِهَانُ شَاهُ فَقَالَ لَنَا أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ بِلْ شَهْرٍ بَانُوِيَه  
 ثُمَّ قَالَ لِلْحُسَيْنِ يَا أَبَا عَبْدِ اللَّهِ لَيْلِدَنَّ لَكَ مِنْهَا خَيْرٌ  
 أَهْلُ الْأَرْضِ فَوَلَدَ عَلَى بْنِ الْحُسَيْنِ.

ترجمہ: حضرت امام باقر فرماتے ہیں کہ جب یزدجرد کی بیٹی حضرت عمر کی خدمت میں  
 حاضر ہوئی تو مدینہ طیبہ کی عورتوں میں اسے دیکھنے کے لیے جھرمٹ کر آئیں مسجد اس کی  
 روشنی سے چمکنے لگی۔ حضرت عمر نے جب اس کی طرف دیکھا تو اس نے اپنا پہرہ  
 ڈھانپ لیا اور اپنی زبان میں کچھ کہا۔ حضرت عمر نے فرمایا: کیا یہ مجھے برا بھلا کہ رہی  
 ہے اور اس کو مارنے کا ارادہ کیا، یہ اصول کافی کے راوی کے الفاظ ہیں جو تحقیقت  
 سے بعید ہیں۔ حضرت علی نے فرمایا کہ ایسا نہیں آپ اسے اختیار دیجئے کہ مسلمانوں  
 میں کسی آدمی کو چرن لے اور پھر اسے مال غنیمت میں سے اس کا حصہ قرار دیجئے۔ حضرت  
 فاروق اعظم نے اسے اجازت دی، اس نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ حضرت امام  
 حسین رضی اللہ عنہ کے سر پر رکھ دیا۔ حضرت امیر المؤمنین نے پوچھا، تمہارا نام کیا ہے؟

اس نے کہا، جہاں شاہ آپ نے فرمایا نہیں بلکہ شہر بانو پھر آپ نے حضرت امام حسینؑ سے کہا، تیرا اس سے ایک بچہ پیدا ہوگا جو تمام اہل زمین سے بہتر ہوگا۔ چنانچہ حضرت شہر بانو کے بطن سے حضرت زین العابدین کی ولادت باسعادت ہوئی۔

اس سے معلوم ہوا کہ تمام حسینی سادات حضرت شہر بانو رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بطن سے ہیں مانی صاحبہ کا مشرف باسلام ہونا، خاندان نبوت کا فرد بننا اور حسینی سادات کی والدہ ماجدہ بننے کا فخر حاصل کرنا، حضرت فاروق اعظمؓ کی بے شمار برکات اور ان گنت احسانات میں سے ایک ہے۔ اس کے لیے ساری امت آپ کی ممنون ہے۔ سادات کرام کو اسے فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

ملا باقر مجلسی نے جلال العیون سے اس روایت کو نقل کیا ہے اور اسے قومی کہا ہے اور لکھا ہے کہ آپ کا مہربیت المال سے ادا کیا گیا۔ (جلال العیون ص ۷۹ مطبوعہ ایران)

### حضرت فاروق اعظمؓ کی شہادت کے بعد

سارے دس سال مسند خلافت پر متمکن رہنے کے بعد حضرت فاروق اعظمؓ نے ایک مجوسی کے ہاتھ سے جام شہادت نوش کیا۔ حضرت علی مرتضیٰ کو اس کا شدید صدمہ ہوا۔ آپ کو غسل دے کر کفنیایا گیا، اس وقت علی مرتضیٰ تشریف لائے، اس روح فرسا منظر کو دیکھ کر آپ کی زبان اقدس سے جو کلمات نکلے انھیں علماء اہل سنت نے اپنی کتب میں نقل کیا ہے، لیکن آپ محض طوسی کی تلخیص الثانی میں مذکور روایت ملاحظہ فرمائیے:

عن جعفر بن محمد عن ابیہ عن جابر بن عبد اللہ لما

غسل عمر و کفن دحل علی علیہ السلام فقال صلی اللہ علیہ

ما على الارض احب الى من انلقى الله بصحيفة هذا المسجى  
بين اظهركم۔ (تلخیص اشانی ص ۲۲۵ مطبوعہ نجف اشرف)

ترجمہ: یعنی حضرت امام جعفر صادق نے اپنے ولد بزرگوار سے اور انھوں نے جابر بن  
عبد اللہ سے روایت کی کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غسل دے کر کفن پہنایا گیا تو  
علی علیہ السلام تشریف لائے فرمایا: ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو، یہ شخص جو تمہارے  
سامنے کفن میں پٹیا ہوا ہے مجھے روئے زمین پر اس سے زیادہ کوئی اور چیز محبوب  
نہیں کہ میں اس جیسا صحیفہ عمل لے کر اللہ تعالیٰ کی ملاقات کروں۔

حقیقت یہ ہے کہ شانِ فاروقی کو پہچاننے کے لیے نگاہِ مرقوم کی ضرورت ہوتی ہے  
بہر کس و ناکس میں یہ صلاحیت نہیں کہ اس مقامِ رفیع کا اندازہ کر سکے۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت  
فاروقِ اعظمؓ کو سرفراز فرمایا تھا۔

سیدنا علی مرتضیٰ اپنے عہدِ خلافت میں اکثر حضرت فاروقِ اعظمؓ کا ذکر خیر فرمایا کرتے اور  
آپ کی تعریف و توصیف کا حق ادا کر دیتے۔ آپ نے ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ کی حمد اور حضور  
علیہ السلام کی ثنا کے بعد فرمایا:

ثم استخلف الناس ابا بكر ثم استخلف ابو بكر  
عمرو احسا السيرة وعدلاني الامة۔ (تاریخ التواریخ جزو دوم ص ۱۱۶)

ترجمہ: پھر حضور علیہ السلام کی رحمت کے بعد لوگوں نے ابو بکرؓ کو اپنا خلیفہ بنایا پھر  
حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ کو خلافت کے لیے تجویز کیا، ان دونوں اسرار کا  
کردار نہایت عمدہ تھا۔ دونوں نے امت میں عدل و انصاف قائم کیا۔



اسی جزو کے صفحہ ۲۲۲ پر حضرت امیر المؤمنین کا ایک مکتوب گرامی ہے جس میں آپ نے ہر اس کو مخاطب فرمایا ہے جو اس خط کو پڑھے اس میں ابتدائی پسند و نصح کے بعد حضور سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام عرض کرتے ہیں پھر فرماتے ہیں:

ثم ان المسلمين من بعدة استخلقوا اميرين منهم صالحين احيا السيرة و لحددا السنة.

ترجمہ: حضور کے وصال کے بعد مسلمانوں نے اپنے میں سے دو ایسے امیروں کو اپنا خلیفہ منتخب کیا جو صالح اور نیک کردار تھے، ان دونوں نے سیرت نبوی کو زندہ رکھا اور سنت مصطفوی سے سہموتجاوز نہ کیا۔

ایک اور موقع پر آپ فرماتے ہیں:

وتولى عمر الامر فكان مرضى السيرة ميمون النقبية.

ترجمہ: یعنی حضرت ابو بکر کے بعد حضرت عمرؓ منہ غلافت پر تشریف فرما ہوئے، آپ کا کردار بڑا پسندیدہ تھا اور آپ کا بخت بڑا مبارک تھا۔ (اسخ التواریخ ص ۳۲۳ جز سوم) نہج البلاغہ میں آپ نے بڑی فصاحت اور صراحت سے حضرت فاروق اعظم کے مناقب بیان فرماتے ہیں آپ کے عدل و انصاف، تقویٰ اور اتباع سنت کی بڑی تعریف کی ہے۔ آپ نے فرمایا:

لله بلاد فلان فقد قوم الاود وداوى العمد. خلف

الفتنة و اقام السنه ذهب نقى الثوب قليل العيب،

اصاب خيرها، وسبق شرها رادى الى الله طاعة و اتقاء

بحقہ - (نہج البلاغہ جلد اول ص ۲۸۵ مطبوعہ مصر)

ترجمہ: یعنی حضرت عمرؓ کے شہروں کو اللہ تعالیٰ برکت دے، آپ نے کجی کو درست کیا، بیماری کا علاج کیا، فتنہ و فساد کو پس پشت ڈالا، سنت نبوی کو قائم کیا۔ وہ یہاں سے پاک دامن رخصت ہوئے، ان کے عیب قلیل تھے، انھوں نے خیر کو پایا اور شر و فساد سے سبقت لے گئے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و تقویٰ کا حق ادا کر دیا۔

عبارت مذکورہ میں ”فلاں“ کا لفظ مذکور ہے۔ نہج البلاغہ کے شارحین نے وضاحت کی ہے کہ اس سے مراد حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ۔ چنانچہ علامہ ابن ابی الحدید اپنی شہرہ آفاق شرح میں لکھتے ہیں:

وفلان المکنی عنہ عمر ابن الخطاب وقد وجدت  
النسخة الذی بخط الرضی ابی الحسن جامع نہج البلاغہ و  
تحت فلان ”عمر“

یعنی فلاں سے مراد عمر بن خطاب ہیں کہتے ہیں میں نے وہ نسخہ دیکھا ہے جو علامہ رضی جامع نہج البلاغہ نے اپنے ہاتھ سے لکھا اس میں فلاں کے لفظ کے نیچے عمر لکھا ہوا ہے۔

ان کے علاوہ علامہ علی نقی فیض الاسلام نے اپنی شرح نہج البلاغہ میں اس جگہ لکھا ہے:

”خدا شہر ہائے فلاں (عمر بن الخطاب) را برکت دهد و نگاہ دارد“

ترجمہ: اللہ تعالیٰ فلاں یعنی عمر بن خطاب کے شہروں کو برکت دے اور ان کی نگہبانی فرمائے۔

ایک اور شارح نہج البلاغہ ملا صالح قزوینی لکھتے ہیں:

”کہ مراد عمرؓ است کہ بعد از او امیر خلافت از انتظام بیفتاد۔“

کہ فلان سے مراد حضرت عمرؓ ہیں کیونکہ آپ کے بعد خلافت کا نظم و نسق

درہم برہم ہو گیا۔

کمال الدین میثم بجرانی نے بھی اس شرح میں لکھا ہے:

والمنقول ان المراد بفلان عمر۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے اپنے عہد خلافت میں حضرت فاروق اعظمؓ کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اس کے متعلق یہ کہنا کہ آپ نے بطور توریہ یا تقیہ اس طرح کہا ہرگز قرین قیاس نہیں اور اگر یہ فرض کر لیا جاتے تو بارگاہ مرقومہ میں اس سے بڑھ کر کوئی گستاخی متصور نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح ایک دفعہ حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے حضرت امیر معاویہؓ کے خط کے جواب میں حضرت صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کو ان پاکیزہ اور دل افروز کلمات سے خراج تحسین پیش فرمایا:

وكان افضلهم في الاسلام كما زعمت وانصحهم ورسوله

الخليفة الصديق وخليفة الخليفة الفاروق. ولعمري ان

مكانها في الاسلام لعظيم وان المصاب بهما الجرح في الاسلام

شديد. يرحمهما الله وجزاهما باحسن ما عملا۔ (شرح نوح البلاغة

ابن میثم بجرانی)

ترجمہ: آپ کا یہ خیال درست ہے کہ اسلام میں سب سے افضل اللہ اور اس کے

رسول کے سب سے زیادہ مخلص حضرت صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ تھے۔ مجھے اپنی

بان عزیز کی قسم! اسلام میں ان دونوں کا مرتبہ بڑا عظیم تھا۔ ان کی وفاتِ حسرتِ آیات

سے اسلام کو گمراہی سے لگا۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں پر رحمت فرمائے اور جو نیک اعمال انھیں نے کیے ہیں اس کی انھیں جزا دے۔

حضرت علی مرتضیٰ کے بعد بھی ائمہ اہل بیت حضرت فاروق اعظم کی تعریف فرماتے رہے اب یہاں صرف ایک واقعہ بطور مثال پیش خدمت ہے:

ایک دفعہ حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کی خدمت اقدس میں عراق کے چاند آدمی حاضر ہوئے اور خلفائے ثلاثہ کی شان میں کچھ ناشائستہ گفتگو کی۔ جب وہ لوگ اپنے خبیث باطن کو ظاہر کر چکے تو آپ نے ان سے پوچھا کہ تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم ان مہاجرین اولین میں سے ہو جن کی شان میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے:

الَّذِينَ أَخْرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يُبْتَغُونَ  
فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا وَيَنْصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَئِكَ هُمُ  
الصَّادِقُونَ۔

ترجمہ: یہ مہاجرین وہ لوگ ہیں جنھیں ان کے گھروں اور مال و متاع سے نکال دیا گیا، یہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رضا کا طلب گار ہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں اور یہی لوگ سچے ہیں۔

انھوں نے جواب دیا، ہم اس گروہ سے نہیں ہیں۔

پھر آپ نے دریافت فرمایا، کیا تم ان میں سے ہو جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

الَّذِينَ تَبَوَّأُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ  
هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِمَّا أُوتُوا  
وَيُؤْتُونَ عَلَى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔

ترجمہ: وہ لوگ جو مہاجرین سے محبت کرتے ہیں اور اپنے دل میں اپنے مال و دولت کے کوئی کشش نہیں پاتے اور حالتِ افلاس میں بھی مہاجرین کو اپنے نفسوں پر ترجیح دیتے ہیں۔

ان لوگوں نے کہا: ہم اس گروہ سے بھی نہیں۔

حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان دونوں گروہوں میں سے نہ ہونے کا تم نے خود اعتراف کر لیا۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ تم مسلمانوں کے تیسرے گروہ میں سے نہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَالَّذِينَ آمَنُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ  
 لِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ  
 آمَنُوا۔

ترجمہ: وہ لوگ جو ان کے بعد آئے وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں بخش دے، اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی بخش دے جو ایمان کے ساتھ ہم سے پہلے گزر چکے ہیں اور اہل ایمان کے لیے ہمارے دلوں میں بغض مت ڈال۔

پھر آپ نے بڑے غضب ناک لہجے میں فرمایا:

أَخْرِجُوا عَنِّي فَعَلَ اللَّهُ بِكُمْ كَذَا۔

میرے پاس سے نکل جاؤ۔ خدا تمہیں ہلاک کرے۔ (کشف الغم جلد دوم)

صفحہ نمبر ۲۶۷

اللہ تعالیٰ جب کسی کو فرزند عطا کرتا ہے تو وہ اپنی سمجھ کے مطابق اس کے لیے بہترین نام تجویز کرتا ہے۔ عمل کی ہزار کوتاہیوں کے باوجود ہم آج بھی دین کے کسی باغی، اللہ تعالیٰ اور

اس کے پیارے رسولؐ کے کسی دشمن کا نام رکھنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوتے۔ ابوہب، ابوہبل،  
 ذنون یا ثمر کے نام کلیتہً متروک ہیں۔ ہم اپنے بچوں کے لیے کسی مقبول بارگاہِ الہی کا نام ہی پسند  
 کرتے ہیں۔

حضرت سیدنا علی مرتضیٰ اور آپ کی اولادِ امجاد جو حسن انتخاب میں اپنا جواب نہیں رکھتی  
 یقیناً انھوں نے بھی اپنی اولاد کے لیے انہی کے نام تجویز کیے ہوں گے جو انھیں از حد دلربا اور  
 پسند تھے اب ذرا اہل بیت کی اولادِ امجاد کے ناموں پر ایک سرسری نگاہ ڈالیں۔ آپ کو  
 پتہ چل جائے گا کہ انھیں حضرت فاروقِ اعظمؓ کے نام سے کتنی عقیدت و محبت تھی اور ان کے  
 دلوں میں آپ کی کتنی قدر و منزلت تھی؛

حضرت سیدنا علی مرتضیٰ کے ایک صاحبزادے کا نام عمر تھا۔ (جلال العیون،  
 کشف الغمہ)

سیدنا امام حسن علیہ السلام نے اپنے صاحبزادے کا نام عمر رکھا۔ (جلال العیون،  
 کشف الغمہ)

سیدنا امام زین العابدین نے بھی اپنے لختِ جگر کے لیے عمر کا نام تجویز فرمایا۔ (جلال العیون،  
 کشف الغمہ)

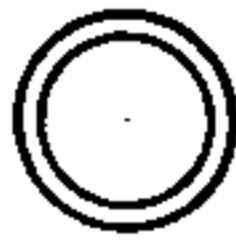
حضرت امام موسیٰ کاظم رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کے ایک نورِ نظر کا نام بھی عمر تھا۔  
 (جلال العیون، کشف الغمہ)

الذخرف طوارت نہ بتواتر تاریخ انسانی کے اس زریں اور درخشاں عہد کے صد ہا روح  
 پرور اور دل افروز واقعات بیان کرتا لیکن اب اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ اگر کسی کے دل کی آنکھ  
 اندھی ہو چکی ہے یا اس نے تعصب کی پٹی خوب کس کر بانڈھ رکھی ہے تو اس کی قسمت ورنہ

جس کے دل میں حق کو سمجھنے اور اس کو قبول کرنے کی کچھ صلاحیت موجود ہے بفضلہ تعالیٰ اب اس پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح آشکار ہو چکی ہوگی کہ خلفائے راشدین خصوصاً حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور اہل بیت نبوت رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین شکر تھے۔ سب ایک دوسرے پر صدقِ دل سے فریفتہ تھے۔ شمعِ اسلام پر سب پروانہ وار نثار تھے۔ ان سب نفوسِ قدسیہ کی مشترکہ کوششوں سے اللہ تعالیٰ کے دین کو غلبہ اور عزت نصیب ہوئی، باہمی شہیدگی اور دشمنی کے قصے سب جھوٹے ہیں، اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان سچا ہے جس میں کوئی مومن شک نہیں کر سکتا:

فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا.

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوبِ کریم علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کی برکت سے ان کے دلوں کو محبت اور پیار سے جوڑ دیا تھا اور اس کی مہربانی سے وہ بھائی بھائی بن گئے تھے۔





اسلام اور تصوف









سب سے پہلے ہم تصوف، اس کی حقیقت، اس کی غرض و غایت اور اس پر مرتب ہونے والے نتائج کا تذکرہ کریں گے۔ بعد ازاں اپنی اور بیگانوں کی طرف سے جو اعتراضات اس سلسلہ فقر و درویشی پر بڑی شد و مد سے کئے گئے ہیں اور اب بھی کئے جا رہے ہیں۔ ان کا بھی علمی اور تحقیقی تجزیہ کیا جائے گا تاکہ نوجوانوں کے اذہان و قلوب میں جو قلق اور اضطراب پایا جاتا ہے۔ ایک طرف ان کا بھی ازالہ ہو جائے۔ اور ساتھ ہی ایک اٹل حقیقت اپنی دلفریبیوں اور جلوہ سمانوں کے ساتھ بے نقاب ہو جائے۔

سب سے پہلے ہم لفظ تصوفی پر بحث کریں گے کہ اس کا مانہ اشتقاق کیا ہے۔ اس فن سے وابستہ لوگ اس کو کس مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔

ابوریحان البیرونی (۹۷۳ تا ۱۰۴۸ھ) کا نام محتاج تو اور نہیں۔ یہ بیک وقت ریاضی، طب، فلک، تقویم اور تاریخ میں یدِ طولی رکھتے تھے۔ انھوں نے کئی سال ہندوستان میں بسر کیے۔ سنسکرت میں مہارت حاصل کی۔ اور یہاں کے تمدن اور مذہبی افکار، اعمال کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ وہ کہتے ہیں:

”صوفی“ کا ماخذ سُوف ہے جو یونانی زبان کا لفظ ہے۔ سُوف کا معنی ”حکمت“ ہے اسی لیے حکیم اور دانشور کو فیلسوف کہتے ہیں۔ فیلا کا معنی محب اور سُوف کا معنی حکمت یعنی دانش و حکمت سے محبت کرنے والا۔ سُوف کے لفظ کو جب عربی میں ڈھالا گیا تو تحریف کے بعد صوفی ہو گیا، کیونکہ یونان میں حکما کا ایک ایسا گروہ تھا جن کا نظریہ تھا کہ وجود حقیقی صرف علت اولیٰ کے لیے ہے، کیونکہ وہی ماسویٰ مستغنی ہے باقی سب اس کے محتاج ہیں اسی لیے وجود حقیقی صرف وہی علت اولیٰ ہوگی، باقی اشیاء کا وجود حقیقی نہیں بلکہ خیالی ہے، کیونکہ مسلمانوں میں بھی بعض حضرات کا عقیدہ بظاہر ان سے قریب ہے۔ اسی مناسبت سے انھیں بھی صوفی کہا گیا۔

لیکن البیرونی کی یہ رائے قابلِ اعتنا نہیں چونکہ یونانی کتب کے عربی تراجم کا سلسلہ تیسری صدی ہجری کے نصف کے لگ بھگ شروع ہوا اور اہل عرب کے ہاں صوفی کا لفظ اس سے بہت پہلے مستعمل ہوتا تھا۔ جو صاحب سب سے پہلے صوفی کے لقب سے ملقب ہوئے وہ ابو الہاشم الکوفی تھے۔ جن کی وفات ۱۵۰ھ میں ہوئی تھی یعنی ترجمہ کے دور سے تقریباً ایک سو سال پہلے اس سے البیرونی کی رائے میں کوئی وزن نہیں۔ البیرونی اپنے اس رویہ پر اس لیے مصر ہیں کہ اگر اس کے علاوہ صوفی کا کوئی اور مادہ اشتقاق مانا جائے، تو اس میں حکمت و معرفت کی نسبت منفقود ہو جائے گی۔ اور یہ لفظ سطحی قسم کا ہو جائے گا۔ البیرونی نے صوفی کے لفظ کی تقدیس کو تو برقرار رکھا، لیکن انھیں یہ خیال نہ آیا کہ اس طرح وہ اسلامی تصوف کو یونانی علوم کا ریزہ جبین ثابت کر رہے ہیں۔ اور اس کی انفرادیت کو ختم کر رہے ہیں جو واقعہ کے بھی خلاف ہے اور تصوف کے مقام سے بھی بہت

فروتر۔ اس لیے البیرونی کے اس قول کو تمام مسلم محققین نے رو کر دیا۔ البتہ یورپ کے مستشرقین میں سے کئی لوگ انھیں اپنے ہمنوا مل گئے لیکن اس کی وجہ کچھ اور ہے جس سے قارئین واقف ہیں۔

بعض کے نزدیک صوفی، صفا سے ماخوذ ہے، کیونکہ یہ لوگ ظاہر اور باطن دونوں کی صفائی اور پاکیزگی کا از حد اہتمام فرماتے تھے اسی لیے ان کو صوفی کہا جانے لگا، لیکن صرف کے قواعد اس کی اجازت نہیں دیتے۔ اگر صفا کی طرف نسبت کو ملحوظ رکھنا ہوتا تو انھیں صوفی کے بجائے صفوی کہا جاتا۔ اشتقاق لغوی کے قواعد کو نظر انداز کرنا درست نہیں۔

بعض علماء نے صف کو صوفی کا ماخذ قرار دیا ہے کیونکہ جہاد اصغر ہو یا جہاد اکبر یہ لوگ ہمیشہ صف اول میں ظاہری اور باطنی دشمنوں کے سامنے سینہ سپر ہوتے ہیں لیکن قواعد اشتقاق اس قول کی بھی تغلیط کرتے ہیں صف کی نسبت سے انھیں صفی کہلانا چاہئے تھا نہ کہ صوفی۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ اصحاب صفہ کی نسبت سے انھیں صوفی کہا جاتا ہے کیونکہ وہ حضرات دنیا کے علائق سے اپنے آپ کو آزاد کر کے دن رات ذکر الہی اور احانت رسالت پناہی میں سرگرم رہتے تھے اور فقر و رویشی کی زندگی بسر کرنے والے لوگوں نے بھی دنیا کی لذتوں، آسائشوں اور دلچسپیوں کو طلاق دے دی ہے اور صرف رضائے الہی کے حصول کے لیے شب و روز سرگرداں رہتے ہیں۔ اس لیے انھیں اصحاب صفہ سے خصوصی نسبت ہے، اسی وجہ سے انھیں صوفی کہا گیا۔ بظاہر تو یہ وجہ بڑی معقول معلوم ہوتی ہے لیکن قواعد اشتقاق اس کی

اجازت بھی نہیں دیتے، اگر انھیں صف سے نسبت ہوتی تو صوفی کہا جاتا۔  
 بعض محققین نے اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ یہ لوگ صوف کا لباس  
 پہنتے تھے اس سے صوفی کا لفظ بنا ہے۔ قواعد کے لحاظ سے تو یہ نسبت درست  
 ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر صوفی صوف کا لباس پہنے، بڑے بڑے جلیل القدر  
 اصفیاء ایسے گزرے ہیں جو صوف کا لباس نہیں پہنتے تھے۔

امام قشیری مختلف آراء نقل کرنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں۔  
 "ولا يشهد لهذا الاسم اشتقاق من جهة العربية و  
 قياس و الظاهر انه لقب"

ترجمہ: یعنی صوفی کے لفظ کا ماخذ اشتقاق عربیت کے لحاظ سے اور قواعد  
 صرف کی رو سے معلوم نہیں ہوتا۔ سیدھی صاف بات یہ ہے کہ یہ اس فن کا  
 لقب ہے۔

علامہ ابن خلدون نے بھی قشیری کی اس رائے کو پسند کیا۔  
 صوفی کے لفظ کی لغوی تحقیق کے بعد اب ہم اصل مقصد کی طرف رجوع کرتے  
 ہیں کہ تصوف کا مفہوم کیا ہے۔ علامہ ابن خلدون اپنے مقدمہ میں علم التصوف کے  
 باب میں اس کی توضیح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

اصل التصوف العكوف على العيادة والانقطاع الى الله  
 تعالى والاعراض عن زخرف الدنيا وزينتها و  
 الزهد فيما يقبل اليه الجمهور من لذة و مال و  
 جاه... وكان ذلك عاما في الصحابة والسلف.

ترجمہ: تصوف کا معنی ہے عبادت پر ہمیشہ پابندی کرنا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف ہمہ تن متوجہ ہونا۔ دنیا کی زیب و زینت کی طرف سے روگردانی کرنا۔ لذت، مال اور جاہ جس کی طرف عام لوگ متوجہ ہیں اس سے کنارہ کش ہونا۔ یہ طریقہ صحابہ کرام اور سلف صالحین میں عام مروج تھا۔“

اکثر حضرات تصوف کی تعریف میں اخلاقی پہلو کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں۔ اور یہ نظریہ حلقہ صوفیاء میں بھی مقبول ہے۔ اس نظریہ کے مطابق جن حضرات نے تصوف کی تعریف کی ہے۔ ان میں سے چند نمونے پیش خدمت ہیں :

ابوبکر الکتانی (متوفی ۲۳۳) فرماتے ہیں :

”التصوف، خُلُقٌ وَمَنْ زَادَ عَلَيْكَ فِي الْخُلُقِ فَقَدْ زَادَ عَلَيْكَ فِي الصِّفَا“

”یعنی تصوف، خلق کا نام ہے جو خلق میں تجھ سے برتر ہوگا۔ وہ صفائی میں بھی تجھ سے برتر ہوگا۔“

ابو محمد الجری (متوفی ۳۱۱ھ) سے کسی نے تصوف کے بارے میں پوچھا۔ آپ نے فرمایا:

”الدُّخُولُ فِي كُلِّ خَلْقٍ سُنَى وَالْخُرُوجُ مِنْ كُلِّ خَلْقٍ رِثَى“

”یعنی ہر اعلیٰ اور عمدہ خلق میں داخل ہونا اور ہر ذلیل عادت سے باہر نکلنا“

تصوف ہے۔“

ابوالحسین النوری تصوف کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”ليس التصوف رسما وعلما و لكن خلق“

”تصوف نہ رسم ہے نہ علم بلکہ یہ خلق کا نام ہے“

دوسرے مقام پر انھیں کا ارشاد ہے :

”التَّصَوُّفُ الْحُرِّيَّةُ وَالْكَوْمُ وَتَرْكُ التَّكْلِيفِ وَالسَّخَاءُ“

(ترجمہ) تصوف، حریت، کرم، بے تکلفی اور سخاوت کا دوسرا نام ہے۔

اگرچہ اخلاقی نقطہ نظر سے تصوف کی یہ تعریف شرق و غرب میں مشہور بھی ہے اور مقبول بھی۔ لیکن اسے تصوف کی صحیح تعریف نہیں کہا جاسکتا۔ بہت سے لوگ جو مکارم اخلاق میں اپنی نظیر نہیں رکھتے انھیں صوفی نہیں کہا جاتا۔ یہ بات مسلم کہ تصوف کی بنیاد اخلاق کریمہ پر ہے۔ اور صوفی کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ مکارم اخلاق سے متصف ہو لیکن اسے تصوف کا حقیقی مفہوم نہیں قرار دیا جاسکتا۔

تصوف کی تعریف میں دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس کا معنی زہد ہے یعنی دنیا اور دنیا کی زیب و زینت اور لذات سے کلیتہً کنارہ کشی، یہ بجا کہ کہ صوفی کا دل دنیا سے بیزار ہوتا ہے، لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ زہد و تقشف اور چیرہ ہے۔ بعض لوگوں نے عبادت گزار کو صوفی کہا ہے۔ لیکن ان کا یہ قول بھی حقیقت سے بہت دور ہے۔ ایک شخص عبادت میں سرگرم ہوتا ہے، لیکن پھر بھی اسے صوفی نہیں کہا جاتا۔

ابن سینا نے اپنی کتاب ”الاشارات“ میں بڑی وضاحت سے زاہد عابد اور صوفی میں جو فرق ہے اسے بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

”جو شخص دنیا اور اس کی لذتوں سے منہ موڑے اسے زاہد کہتے ہیں

جو شخص ہر لمحہ عبادت میں مصروف رہے اسے عابد کہتے ہیں اور :

وَالْمُنْصَرَفُ بِفِكْرِهِ إِلَى الْقُدْسِ الْجَبْرُوتِ مُسْتَدِيماً

لشروق نور الحق في سرِّه يخص باسم العارف۔

یعنی جو شخص ہمیشہ اپنے فکر کو قدس جبروت کی طرف متوجہ رکھتا ہے

اور ہر لحظہ اپنے باطن میں نور حق کی تابانی کا آرزو مند ہوتا ہے۔ اسے

عارف کہتے ہیں اور ابن سینا کے نزدیک عارف ہی صوفی کہلانے کا

مستحق ہے۔“

زاہد اور عابد، زہد و عبادت کو اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ انھیں دوزخ سے

نجات ملے اور نعیم جنت کی سرمدی مسرتیں انھیں نصیب ہوں صوفی بھی دنیا کی

زینتوں اور لذتوں سے دامن کش رہتا ہے اور ہمہ وقت مصروف عبادت رہتا ہے

لیکن اس کے پیش نظر کوئی خوف یا طمع نہیں ہوتا وہ فقط اس لیے اللہ تعالیٰ کی

عبادت کرتا ہے کہ وہ اس کا محبوب و مطلوب ہے اور ہر قسم کی عبادت و نیاز مندی

کا مستحق ہے۔ حضرت رابعہ بصریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہ ارشاد اس حقیقت کو

واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔ ایک روز انھوں نے بارگاہِ الہی میں یوں

عرض کیا۔

اللَّهُمَّ إِن كُنْتُ أَعْبُدُكَ خَوْفًا مِنْ نَارِكَ فَأَلْقِنِي فِيهَا۔

اے اللہ! اگر میں تیری عبادت آتش دوزخ کے خوف سے کرتی ہوں تو مجھے

اس میں جھونک دے۔

وَإِنْ كُنْتُ أَعْبُدُكَ طَمَعًا فِي جَنَّتِكَ فَأَحْرَمْنِيهَا۔

اور اگر میں جنت کے لالچ کے لیے تیری جناب میں سر بسجود رہتی ہوں تو مجھے اس



بنت سے محروم کر دے۔

وَإِنْ كُنْتُ أَعْبُدُكَ لِوَجْهِكَ الْكَرِيمِ فَلَا تَحْصِنِي مِنْ

رُؤْيَيْتِهِ۔

اور اگر میں صرف تیری ذات کے لیے تیری عبادت کرتی ہوں تو اے میرے

محبوب! مجھے اپنے شرف دیدار سے محروم نہ رکھیو۔

معلوم ہوا کہ تصوف نہ صرف اخلاقِ حسنہ کا نام ہے، نہ صرف دنیا کی لذتوں اور مسرتوں سے کنارہ کشی کا نام ہے اور نہ صرف شب و روز مصروفِ عبادت رہنے کا نام ہے۔ اگرچہ وہ ان تمام چیزوں کو شامل ہے۔ لیکن وہ ان کے ماسوا اور چیز ہے۔

اس لیے ابھی ہمیں تصوف کی ایسی تعریف کی ضرورت ہے جس سے اس کی حقیقت تک رسائی حاصل ہو جائے۔

الوسعید الخراز (متوفی ۲۶۸ھ) سے ”صوفی“ کے بارے میں پوچھا گیا آپ

نے فرمایا:

مَنْ صَفَى رُبُّهُ قَلْبَهُ فَاَمْتَلَأَ قَلْبَهُ نُورًا وَمَنْ دَخَلَ

فِي عَيْنِ اللّٰذِي بِذِكْرِ اللّٰهِ۔

ترجمہ: یعنی جس کے دل کو اس کا رب پاک صاف کر دے اور اس کا دل نورِ الہی

سے لبریز ہو جائے اور جو شخص ذکرِ الہی شروع کرتے ہیں لہذا وہ سرور میں کھو

جائے۔

حضرت جنید بغدادی، تصوف کی تعریف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

التَّصَوُّفُ هُوَ أَنْ يُمِيتَكَ الْحَقُّ عَنْكَ وَيُحْيِيكَ بِهِ -

”یعنی تصوف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے تیری ذات سے فنا کر دے اور اپنی ذات

کے ساتھ تجھے زندہ کر دے“

ابوبکر الکنانی کی تعریف ایجاز اور جامعیت کا شاہکار ہے، وہ فرماتے ہیں:

«التَّصَوُّفُ: صَفَاءٌ وَمُشَاهَدَةٌ»

یعنی تصوف صفا یعنی تزکیہ اور مشاہدہ کا نام ہے۔

ان دو میں سے پہلی بات (صفا) سبب ہے اور دوسری بات (مشاہدہ)

غایت اور مدعا ہے۔ یہ تعریف بڑی جامع ہے اس میں سالک کی منزل کا بھی ذکر ہے اور اس راستہ کا بھی جو سالک کو اس منزل تک لے جاتا ہے۔

حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں اس حقیقت کو ذرا تفصیل

سے بیان فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں:

الظُّرُوقُ تَقْدِيمُ الْمَجَاهِدَةِ وَمَحْوِ الصِّفَاتِ الْمَذْمُومَةِ

وَقَطْعِ الْعَلَائِقِ كُلِّهَا وَالْإِقْبَالُ بِكُنْهِ الْهَمَّتِهِ عَلَى اللَّهِ تَعَالَى

مَهْمَا حَصَلَ ذَلِكَ كَانَ اللَّهُ الْمُتَوَلَّى لِقَلْبِ عَبْدِهِ الْمُتَكْفِلِ

لَهُ بِتَنْوِيرِهِ بِأَنْوَارِ الْعِلْمِ -

ترجمہ: اس منزل کا راستہ یہ ہے کہ پہلے مجاہدہ کر کے صفات مذمومہ کو مٹائے۔ تمام

تعلقات کو توڑ ڈالے اور پوری طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف متوجہ ہو جائے

جب یہ سعادت حاصل ہو جاتی ہے، تو اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے دل کا

متولی بن جاتا ہے۔ اور علم کے انوار سے اس کو منور کرنے کا ذمہ دار بن جاتا ہے۔

یہ ہے تصوف کا وہ مفہوم جس کو اولیاء اللہ اپنا مقصدِ حیات بناتے ہیں۔ ان کی ساری زندگی صفا اور تزکیہ کے کٹھن مرحلوں کو صدقِ دل سے طے کرنے کے لیے وقف رہتی ہے تاکہ آخر کار وہ مشاہدہ کی منزل میں خمیر زن ہونے کی سعادت حاصل کریں۔ اس طرح وہ انسانیت کے اس مقامِ رفیع کو پالیتے ہیں۔ جہاں "نفخت فیہ من روحی" کا سر نہاں غیاں ہوتا ہے اور وہ خلیفۃ اللہ فی الارض کی مسندِ جلیل پر متمکن ہوتا ہے۔

اس تصوف پر جس کے لغوی اور اصلاحی مفہوم کی تشریح آپ ابھی پڑھ چکے ہیں گزشتہ زمانہ میں بھی اور آج بھی اپنوں نے بھی اور بیگانوں نے بھی بدلیتی سے یا غلط فہمی کے باعث بڑی بے رحمی سے طعن و تشنیع کے تیروں کا میلنہ برسایا ہے، اور آج اس تحریک میں مزید شدت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں تک کہ عدل و تحقیق کا دامن بھی بسا اوقات ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ اس حالیہ شدت کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ مادی لذتوں کی طرف رجحان دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جو لوگ تصوف کے علمبردار بنے ہوئے ہیں ان میں سے چند ایسے بھی ہیں جو باعثِ رسوائی اسلاف ہیں یا اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے آثار کو دیکھ کر ابلیسی قوتیں ہر سال ہیں اور وہ مسلمانوں کو اس چشمہ حیات سے بدظن اور متنفر کرنے کا قبل از وقت پروگرام بنا رہی ہیں تاکہ مسلمان اس بیداری سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کے قابل نہ رہیں۔ وجہ کوئی بھی ہو نہیں سکتی حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے ان اعتراضات کا جائزہ لینا چاہیے انھوں نے اگر کسی واقعی حامی کی نشان دہی کی ہے تو اس کے ازالہ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے اور اگر انھوں نے

غلط اعتراضات کئے ہوں تو ان کا مسکت جواب دینا چاہیے۔

ایک بات میں ابترام میں ہی صاف طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ صوفیہ کی صفوں میں ایسے لوگ بھی درآتے ہیں جو بظاہر عابد و زاہد نظر آتے ہیں لیکن دراصل اپنے زہد و عبادت کو حصول مال و جاہ کا ذریعہ بناتے ہوئے ہیں لیکن مجھے تو بتائیے انسانی زندگی کا کون سا ایسا شعبہ ہے جہاں یہ کالی بھڑیں موجود نہیں علماء، اطباء، قضاة، تجار، صنعت کار سب جگہ پر ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنے طبقہ کے لئے ننگ و عار کا باعث ہیں۔ لیکن اگر ان کے وجود سے صحیح اور استباز لوگوں کی افادیت کم نہیں ہوتی تو جعلی صوفیوں کے ہتھکنڈوں سے صوفیاء کرام کی عظمت پر حرف نہیں آسکتا، ہم جن صوفیاء کے بارے میں کلام کریں گے وہ وہ لوگ ہیں جو صحیح معنی میں اس لقب کے اہل ہیں۔

### پہلا اعتراض

تصوف پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے اور اب بھی کیا جا رہا ہے کہ اس کا ماخذ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نہیں بلکہ یہ ایک اجنبی چیز ہے جسے اسلام میں زبردستی ٹھونس دیا گیا ہے۔ لیکن جب ان معترضین سے اس اجنبی مصدر اور منبع کے بارے میں استفسار کیا جاتا ہے تو بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آتی ہیں اور انسان تصویر حیرت بن کر رہ جاتا ہے کہ تصوف کے کسی معترض کی بات کو دقیق اور وزنی سمجھا جائے اور کسے لایعنی سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتے ان معترضین کا باہمی اختلاف اور کسی ایک منبع پر متحد

نہ ہونا ہی ان کے اس قول کے بطلان کے لیے کافی ہے۔ لیکن پھر بھی ہم تمام اقوال کا ایک ایک کر کے ذکر کرتے ہیں۔ اور اس کا علمی تجزیہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں وہ خود ہی حقیق و باطل میں امتیاز کر لیں گے۔

معرضین کا ایک طبقہ جس میں مستشرقین کے چند علماء بھی شامل ہیں یہ کہتا ہے کہ تصوف کا ماخذ ہندوؤں کے دید ہیں اور بڑے وثوق سے دعویٰ کرتے ہیں کہ تصوف میں چلہ کشی، ریاضت وغیرہ کے سارے طریقے ہندو جوگیوں اور سادھوؤں سے مستعار لئے گئے ہیں۔ اس طبقہ کے سرخیل ہارٹن (Horton) بلوشیٹ (Blochet) اور ماسی نیون (Massignon) ہیں۔ یہ لوگ بڑی بڑی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اور بڑے محقق اور مدقق شمار ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں ان صاحبان کو اس بے مقصد تکلف کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی کیا انھیں معلوم نہیں کہ مسلمان صوفیاء کے ہادی و راہبر نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے غارِ حرا میں چلہ کشی کی تھی۔ اور ذکر الہی پر مداومت کے متعدد احکام قرآن کریم اور احادیث نبوی میں بصراحت موجود ہیں اور یہ سب اس وقت ان کو میسر تھا جب کہ ہندوؤں کی تہذیب و تمدن کے بارے میں جزیرہ عرب کے باشندوں کو سطحی قسم کی معلومات بھی میسر نہ تھیں۔ اس لیے صوفیاء کرام کی ریاضتوں اور چلہ کشیوں کو ہندو جوگیوں کی طرف منسوب کرنا لغویت کی انتہا ہے۔ مزید برآں دونوں ریاضتوں کے مقاصد میں بعد المشرقین ہے۔

دوسرا طبقہ ان معترضین کا ہے جو مسلمانوں کے زہد و تقویٰ کو بدعت سے مانو سمجھتے تھے گولڈزبرگ Goldzberg اور اولبری O'Leary کے پایہ

کے مستشرق بھی یہ کہتے ہوئے نہیں تھکے کہ صوفیاء کا دنیا سے قطع تعلق و حقیقت گوتم بدھ کی تقلید ہے۔ جس طرح اس نے تخت و تاج کو ترک کر کے فقر و فاقہ کی زندگی اختیار کر لی تھی اسی طرح مسلمان صوفیاء نے بھی اپنے گھروں کے راحت و آرام کو ترک کر کے جنگلوں اور پہاڑوں کی غاروں میں آکر بسیرا کیا، لیکن اثنا بڑا الزام لگانے سے پہلے ان حضرات نے یہ غور کرنے کی زحمت بھی برداشت نہیں کی کہ گوتم بدھ خدا کے وجود کا منکر ہے۔ وہ نفس انسانی کو ہی سب کچھ خیال کرتا ہے۔ اس کے برعکس مسلمان اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی وحدانیت پر پختہ ایمان رکھتے ہیں اور یہ ریاضتیں مقصود بالذات نہیں، بلکہ بارگاہ الہی میں شرف باریابی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہیں۔

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اسلام کا تصوف دراصل فارسی تصوف کا آئینہ دار ہے۔ عرب ہر لحاظ سے فارس سے فروتر تھے۔ انھوں نے ان سے ہی کچھ لیا، فارسیوں کو دینے کے لیے ان کے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ اگر یہ لوگ اسلام سے پہلے کی بات کہہ رہے ہیں تو ہم اسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ لیکن ہم اس زمانہ سے کوئی رفرکار نہیں رکھتے۔ ہماری بحث اس تصوف سے ہے جو آفتاب اسلام کے طلوع ہونے کے بعد رونما ہوا۔ جب قرآن کریم کے فیضان سے عرب مسلمانوں کی جھولیاں علم و حکمت کے جواہرات سے بھر گئیں تو وہ اپنے گھروں سے نکل کر دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچے اور بڑی دریا ولی اور فیاضی سے انھوں نے ان جواہرات کو لٹایا تاریخ کا ایک اوفی طالب علم یہ کہنے کی جسارت نہیں کر سکتا کہ اہل فارس نے عرب مسلمانوں کو دینی، تہذیبی اور علمی اعتبار سے متاثر کیا۔

بلکہ یہ وہ عرب تھے جنہوں نے اپنے ظاہری فتوحات کے جھنڈے گاڑنے کے بعد اہل ایران کے عقائد، نظریات و افکار اور تہذیب و تمدن کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ جب اسلام کی برکت سے اہل فارس آتش پرستی کو چھوڑ کر خداوند احد و یکتا کے پرستار بن گئے۔ باقی اور کیا چیز تھی جس کے لیے مسلمان صوفی ان کے شکست خوردہ افکار سے در یوزہ گرمی کرتے۔ پروفیسر براؤن کا یہ کہنا سراسر خلاف حقیقت ہے کہ ایرانی افکار نے عربوں کو متاثر کیا۔ اور اسی سے ان کا تصوف ماخوذ ہوا۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ بہر حال اگر کہیں کچھ مشابہت پائی بھی جاتی ہے تو اس سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ اسلامی تصوف اہل فارس کے نظریات سے ماخوذ اور مستعار ہے۔ اسلام کا تصوف صرف اسلام سے ماخوذ ہے اور وہ ہر اعتبار سے بالکل الگ اور جداگانہ چیز ہے۔

مترجمین کے ایک گروہ کا یہ خیال ہے کہ اسلام کے تصوف پر نصرانی تصوف کا بہت بڑا اور گہرا اثر ہے۔ اس دعویٰ کی تائید کے لیے وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ عربوں اور عیسائیوں میں عہد قدیم سے باہمی روابط تھے۔ عرب ایک غیر متمدن اور جاہل قوم تھے جب کہ عیسائی دنیا علم و حکمت کے نور سے جگمگا رہی تھی اس لیے لازمی طور پر مسلمان صوفیوں نے عیسائی راہبوں سے تصوف سیکھا اور اس کو اپنایا ہم عرض کرتے ہیں کہ اسلام کی آمد سے پہلے کے بارے میں آپ کا یہ نظریہ درست ہے لیکن ہم اس زمانہ کی بات کر رہے ہیں جب کہ عرب کے ظلمت کدہ کو وحی الہی کے نور تاباں نے رشک صد طور بنا دیا تھا۔ اور ان ابجد ناشناسوں کو نہاں خانہ تقدیر کے اسرار و رموز سے آشنا کر دیا تھا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے خود اپنے ماننے والوں کو دنیا کی لذتوں میں کھوجانے سے سختی سے روکا تھا۔  
قرآن کریم کی صدہا آیات ہیں جو مسلمانوں کو زہد و تقویٰ کی تلقین کرتی ہیں اور دنیا  
کی بے ثباتی کا نقش لوح قلب پر ثبت کرتی ہیں۔ سورہ الحدید کی ایک آیت  
ملاحظہ ہو:

اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهُمْ زِينَةٌ وَ  
تَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ  
أَعْجَبَ الْبُقَارِبَاتُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ  
يَكُونُ حُطَامًا وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَغْفِرَةٌ  
مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَسَاعٍ  
الْغُورِ - آیت ۲۰ -

ترجمہ: تم خوب جان لو کہ دنیوی زندگی، محض لہو و لعب، زینت اور ایک  
دوسرے پر اترانے اور مال و اولاد میں زیادتی پر فخر کرنے کا نام ہے۔ جیسے مینہ  
ہے کہ اس کی پیداوار کاشت کاروں کو اچھی معلوم ہوتی ہے۔ پھر وہ چورا چورا  
ہو جاتی ہے۔ اور آخرت میں عذاب شدید ہے اور خدا کی طرف سے مغفرت  
اور رضا مندی بہت بہتر چیز ہے۔ اور نہیں ہے دنیا مگر دھوکے کا ماہان۔  
اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث بھی سماعت  
فرمائیے:

إِنَّمَا أَخَافُ عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِي مَا يَفْتَحُ عَلَيْكُمْ  
مِنْ زَهْرَةِ الدُّنْيَا وَزِينَتِهَا - (بخاری و مسلم)



ترجمہ: اپنے بعد میں تم سے جس چیز کے بارے میں ڈرتا ہوں وہ یہ ہے

کہ دنیا کی زینت اور کامیابی کے دروازے تم پر کھول دیئے جائیں گے۔

خود سوچتے کہ جس قوم کے پاس ان کی کتاب مقدس میں زہد و پرہیزگاری کے اتنے مؤثر مواضع موجود ہوں۔ انھیں ان پریشان حال راہبوں کی تقلید کی کیا ضرورت ہے۔ جو خود بے یقینی کی موتوں کے تھپیڑے کھا رہے ہیں۔ اسی طرح عبادت الہی کی تلقین و ترغیب میں قرآن کریم کی بے شمار آیات موجود ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے کسی اور واعظ کی ایک مومن کو کیوں ضرورت محسوس ہوگی۔ ارشاد ربانی ہے:

وَإِذْ كُذِّبَتْكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً وَدُؤُنَ

الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُنْ مِنَ

الْغَافِلِينَ۔ (الاعراف ص ۲۰۵)

ترجمہ: اپنے رب کو یاد کیا کر، اپنے دل میں عاجزی اور خوف کے ساتھ زور

کی آواز کی نسبت کم آواز کے ساتھ صبح اور شام اور غافلوں میں سے مت ہو جانا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا وَ

سَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا۔

ترجمہ: اے ایمان والو! تم اللہ کو خوب کثرت سے یاد کیا کرو۔ اور صبح و شام

اس کی تسبیح کرتے رہا کرو۔

قرآن کریم کی دوسری سورت کی یہ دل افروز اور روح افزا آیت بھی پڑھو۔

لیجئے:

فَاذْكُرُونِي اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَاَلَا تَكْفُرُونَ -

(البقرہ: ۱۵۲)

ترجمہ: تم مجھے یاد کیا کرو۔ میں تمہیں یاد کیا کروں گا۔ میرا شکر ادا کرو، اور

ناشکری نہ کرو۔

جب ذکر الہی کے لیے ایسی آیات موجود ہوں تو ان کے ہوتے ہوئے کسی مسلمان کا کسی غیر کی طرف متوجہ ہونا کم از کم ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔

مستشرقین جن کے غول کے غول اسلامی تصوف کو غیر اسلامی ثابت کرنے کے جنون میں جگہ جگہ ٹامک ٹویاں مارتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان میں چند ایسی شخصیتیں بھی ہیں جنہوں نے پہلے تو اپنے پیشروؤں کی تقلید کرتے ہوئے اسلامی تصوف کو غیر اسلامی افکار کا نتیجہ کہا لیکن مزید تحقیق کے بعد جب حقیقت ان کے سامنے واضح ہو گئی تو انہوں نے بڑی جرأت سے اپنے سابق افکار و نظریات سے رجوع کیا۔ یہی نکلسن جو پہلے تصوف کو عیسائیت کا عطیہ کہتے رہے بعد میں انسائیکلو پیڈیا آف ریسیجن اینڈ ایٹھک میں تصوف کے عنوان پر اظہار خیال کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ آج تک اسلامی تصوف کے آغاز اور نشوونما کے بارے میں غلط اندازے لگائے گئے ہیں۔ یہ کہنا کہ تصوف اسلام میں باہر سے آیا قطعاً قابل تسلیم نہیں، بلکہ روز اول سے ہی مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ تھا جو تلاوت قرآن اور مطالعہ حدیث میں مشغول رہتا تھا۔ اور ان کے تمام افکار و نظریات کا منبع قرآن و سنت کے بغیر کچھ بھی نہیں تھا۔

اکابر صوفیاء نے اپنی مستند کتب میں اس بات کو واضح طور پر لکھ دیا ہے

کہ صوفی کے لیے کتاب و سنت کے ارشادات پر عمل پیرا ہونا کامیابی کے لیے شرط اول ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ہر قسم کے شک و شبہ کے بطلان کے لیے کافی ہے۔ فرماتے ہیں:

ایں راہ کس یا بد کہ کتاب بروست راست گرفتہ باشد و سنت مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم بروست چپ۔ زر روشنائی ایں دو شمع میرود تانہ درمغاک شبہت افتد نہ درظلمت بدعت۔

(تذکرۃ الاولیاء شیخ عطار ص ۸)

ترجمہ: یہ راہ تو وہی شخص پاسکتا ہے جس کے دائیں ہاتھ میں قرآن پاک ہو اور بائیں ہاتھ میں سنت مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اور ان دونوں شمعوں کی روشنی میں وہ قدم بڑھاتا جاتے تاکہ نہ شبہات کے گڑھوں میں گرے اور نہ بدعت کے اندھیروں میں پھنسے۔

شیخ ابوبکر طمسانی فرماتے ہیں:

الطَّرِيقُ وَاضِحٌ وَالْكِتَابُ وَالسُّنَّةُ قَائِمٌ بَيْنَ  
أَظْهُرِنَا۔

(راستہ کھلا ہوا ہے اور کتاب و سنت ہمارے سامنے موجود ہے۔)

حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی ایک خط میں لکھتے ہیں:

اے برادر! در تفاوت مراتب فقرار اگر امروز خواہی کہ دربابی بجانب شریعت اونگاہ کن کہ شریعت معیارست عیارفتیر بر شریعت روشن میگردد۔

ترجمہ: اے بھائی! اگر تم فقراء کے مراتب کا پتہ آج لگانا چاہو تو ان کے  
ابتاع شریعت پر نظر کرو۔ شریعت معیار ہے۔ اس کسوٹی پر فقیر کی حقیقت واضح  
ہو جاتی ہے۔

صوفیاء کرام نے خود بھی کتاب و سنت پر عمل کیا اور اپنے حلقہ عقیدت میں  
داخل ہونے والوں کو بھی کتاب و سنت کی پیروی کی تاکید فرمائی مندرجہ بالا تصریحات  
کے علاوہ آپ قوت القلوب، رسالہ قشیریہ، کشف المحجوب، عوارف المعارف،  
فوائد الفوائد وغیرہ کا مطالعہ کریں۔ آپ کو ان کے ہر صفحہ پر کتاب و سنت پر عمل  
کرنے کی تلقین ملے گی۔ اس کے باوجود اگر کوئی شخص تصوف کو شریعت کے خلاف  
کہتا ہے تو اس کی اپنی مرضی۔

## دوسرا اعتراض

معتزین یہ بھی کہتے ہیں کہ تصوف جاہلوں اور ناخواندہ لوگوں کا مسلک ہے  
جو لوگ زیور علم سے آراستہ ہیں اور تحقیق و تدقیق کے میدان میں یدِ طولی رکھتے ہیں وہ  
تصوف کے قریب بھی نہیں پھٹکتے، یہ ایک ایسا الزام ہے جو الزام لگانے والے  
کی کم نظری اور لاعلمی پر دلالت کرتا ہے اکابر صوفیا اپنے اپنے زمانہ میں علم و فضل  
میں بھی اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ وہ اپنے ہم عصر علماء و فضلاء پر ہر لحاظ سے  
فوقیت رکھتے تھے۔ بلکہ تصوف کے میدان میں قدم رکھنے سے پہلے وہ علوم و فنون  
میں مہارت حاصل کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ حضرت غوث الاعظم حضرت خواجہ  
معین الحق والدین اجمیری، حضرت شہاب الدین سہروردی، غوث العالمین

شیخ الاسلام حضرت بہار الحق والدین زکریا ملتانی، حضرت بہار الدین نقشبند، حضرت  
 مجدد الف ثانی و امثالہم قدس اللہ سرارہم نہ صرف اقلیم درویشی کے شہنشاہ تھے  
 بلکہ کشور علم و فضل کے بھی تاجدار تھے۔ کون ہے جو ان حضرات اور ان کے جلیل  
 القدر خلفاء پر جہالت کی تہمت لگا سکے۔ ان کی تصانیف آج بھی اہل علم و تحقیق  
 سے خراج تحسین وصول کر رہی ہیں۔ حضرت فرید الدین مسعود گنج شکر، فرمایا کرتے  
 تھے کہ جاہل کبھی مسخر شیطان ہو جاتا ہے۔ اس کی نگاہ حقیقت اور سراب میں امتیاز  
 کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ وہ دل کی بیماریوں کی صحیح تشخیص اور مناسب علاج  
 نہیں کر سکتا۔

حضرت محبوب الہی نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے :  
 ”پیراں چناں باید کہ در احکام شریعت و طریقت و حقیقت عالم  
 باشد و چوں این چنین باشد او خود، هیچ نامشروع نفرماید“

(فوائد الفوائد)

ترجمہ: ”پیرایا ہونا چاہیے جو شریعت، طریقت اور حقیقت کے احکام کا علم  
 رکھتا ہو۔ اگر ایسا ہوگا تو وہ کسی ناجائز کے لیے نہ کہے گا۔“

حضرت محبوب الہی کا یہ احوال بھی تھا کہ وہ کسی ایسے شخص کو خلافت عطا  
 نہیں فرماتے تھے جو عالم نہ ہو۔ حضرت یحییٰ بن معاذ رازی کا قول ہے :

إِجْتَنِبْ صُحْبَةَ ثَلَاثَةِ أَصْنَافٍ مِنَ النَّاسِ الْعُلَمَاءِ  
 الْغَافِلِينَ وَالْفُقَرَاءِ الْهَدَاهِنِينَ وَالْمُتَصَوِّفَةِ الْجَاهِلِينَ۔

(کشف المحجوب)

ترجمہ: تین قسم کے آدمیوں کی صحبت سے اجتناب کیا کرو۔ ایسے عالموں سے  
جو غافل ہوں، ایسے فقروں سے جو دھوکے باز ہوں، اور ایسے صوفیوں سے  
جو جاہل ہوں۔

علامہ ابن جوزی، جو صوفیاء پر تنقید کرنے میں مشہور عالم ہیں وہ بھی یہ تسلیم کرنے  
پر مجبور ہیں کہ

”وَمَا كَانَ الْمُتَقَدِّمُونَ فِي التَّصَوُّفِ إِلَّا رُؤُوسًا فِي  
الْقُرْآنِ وَالْفِقْهِ وَالْحَدِيثِ وَالتَّفْسِيرِ“

ترجمہ: یعنی صوفیاء متقدمین علوم قرآن، فقہ، حدیث اور تفسیر میں امام ہوا

کرتے تھے۔

### تیسرا اعتراض

صوفیاء نے عیسائی راہبوں کی طرح دنیا سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی  
وہ نعمتیں جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی تھیں۔ ان سے وہ لطف اندوز  
ہونے سے دست کش ہو گئے تھے۔ حالانکہ حدیث پاک میں موجود ہے کہ ”لَا  
رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ“۔ اسلام میں رہبانیت کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔  
بے شک صوفیاء کرام ابتداء میں ہر قسم کے علائق سے دست کش ہو کر خلوت  
گزیں ہو جاتے ہیں اور اچھے کھانے، اچھے پہننے، رات کو آرام کرنے وغیرہ راحتوں  
کو ترک کر دیتے ہیں، لیکن ان کا مقصد حیات نہیں ہوتا بلکہ وقتی طور پر وہ تزکیہ قلب  
اور تربیت نفس کے لیے ان مجاہدات کو اختیار کرتے ہیں۔ اور جب وہ اس مقصد

میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نور عشق سے ان کے سینے منور ہو جاتے ہیں۔ مذموم عادات سے ان کی طبیعت پوری طرح متنفر ہو جاتی ہے اور محاسن اخلاق ان کی فطرت ثانیہ بن جاتے ہیں۔ تو پھر ستیزہ گاہ حیات میں اسلام کا پرچم تھامے ہوئے وہ قدم رنجہ فرماتے ہیں۔ ان کے تربیت یافتہ نفوس کے راستہ میں آلام و مصائب کی کوئی چٹان حائل نہیں ہو سکتی۔ ابلیس کی کوئی فسوں کاری ان کو متاثر نہیں کر سکتی بلکہ وہ عزم و ثبات کا پیکر بن کر تسلیم و رضا کے پرخار راستہ پر خراماں خراماں گزرتے چلے جاتے ہیں۔ اور وہ شخص جو اپنی زندگی اسلام کی سر بلندی کے لیے وقف کرنا چاہتا ہو اور دنیا کے گوشے گوشے میں اس پیغام حق کو پہنچانے کے لیے میدان میں نکلنا چاہتا ہو اس کے لیے ناگزیر ہے کہ پہلے وہ تزکیہ قلب اور تربیت نفس کے کٹھن مرحلہ کو کامیابی سے طے کرے۔ اگر اس میں ذرا بھی خامی باقی ہوگی تو اس کی ادنیٰ اسی لغزش اسلام کے وقار کو سخت نقصان پہنچانے کا باعث بنے گی۔

آج جب کہ ہم تبلیغ اسلام کے لیے تحصیل علم کو ہی کافی سمجھتے ہیں اور ریاضت مجاہدہ کو غیر ضروری بلکہ خلاف اسلام چیز قرار دیتے ہیں۔ تو ہماری تبلیغ کا رنگ ہی بدل گیا ہے۔ نہ کلام میں اثر ہے نہ وعظ و نصیحت کا کوئی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ اور ہماری اخلاقی کمزوریاں قدم قدم پر عیاں ہوتی ہیں۔ اور اسلام کی تضحیک کا باعث بنتی ہیں۔ آپ یوں سمجھتے کہ کفار کے ساتھ گھمسان کی لڑائی شروع ہے۔ آپ سپاہی بھرتی کرتے ہیں کیا آپ انھیں بھرتی کرنے کے بعد فوراً میدان جنگ کی طرف روانہ کریں گے۔ یا پہلے میدان جنگ سے بہت دور ایک چھاؤنی میں بھیجیں گے۔

جہاں وہ فوجی نظم و ضبط کے علاوہ اسلحہ کے استعمال کے ڈھنگ سیکھیں گے اور جب وہ تربیت کے اس مرحلہ کو مکمل کر لیں گے تب وہ اس قابل ہوں گے کہ انھیں میدان جنگ میں کسی محاذ پر متعین کیا جائے اگر آپ عجلت سے سپاہیوں کو فوراً جنگ میں جھونک دیں گے تو وہ دشمن کے بجائے اپنے دوستوں کو نقصان پہنچائیں گے۔ اور کوئی بعید نہیں کہ وہ خود ہی اپنی گولی کا نشانہ بن جائیں۔

عیسائیوں کے نزدیک رہبانیت مقصد حیات ہے۔ وہ ہمیشہ کے لیے دنیا سے الگ تھلک زندگی بسر کرنے میں ہی سلامتی اور نجات سمجھتے ہیں۔ صوفیاء کرام کے ہاں اس قسم کا قطعاً کوئی تصور نہیں۔ صوفیہ کرام کی سوانح حیات کا مطالعہ کیا جائے تو روز روشن کی طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انھوں نے دنیا کو ترک کرنے کی تلقین نہیں کی بلکہ دنیا کے ساتھ ساتھ اس کی محبت میں کھوجانے سے منع کیا ہے۔ انھوں نے شادیاں کیں۔ ان کے اہل خانہ رہے۔ ان کے ذاتی مکانات اور مزروعہ اراضی تھیں ان حقائق کی موجودگی میں ان پر رہبانیت کا الزام کیوں درست ہو سکتا ہے۔ اور یہ قرآن کریم کا حکم ہے اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کی ان الفاظ میں ثنا گسٹری فرماتا ہے۔

رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّالْبَيْعُ عَنِ ذِكْرِ اللَّهِ۔ یعنی یہ وہ مران پاکباز ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے انھیں نہ تجارت غافل کر سکتی ہے اور نہ خرید و فروخت۔

حضرت محبوب الہی کا ارشاد بھی سماعیت فرماتی ہے :

”ترک دنیا آل نیست کہ کسے خود! برہنہ کند مثلاً لنگوتہ بہ بندو



وغشیند ترک دنیااں است کہ لباس پوشد، طعام بخورد و آنچه می رسد  
 دو ابدارو و لجمع او میل نکند و خاطر را متعلق چیز سے مدارو؛ (فوائد القوائد)  
 ترجمہ: ترک دنیا کا یہ معنی نہیں کہ کوئی آدمی اپنے آپ کو برہنہ کرے اور لنگوٹہ  
 باندھ کر بیٹھ جاتے، بلکہ ہمارے نزدیک ترک دنیا یہ ہے کہ لباس بھی پہنے، کھانا بھی  
 کھاتے اور حلال کی جو چیز دستیاب ہو اسے استعمال بھی کرے لیکن دولت کو جمع  
 کرنے کی طرف راغب نہ ہو اور دل میں اس کو جگہ نہ دے۔“

یہ اعتراض بڑے زور و شور سے تصوف اور صوفیاء پر کیا جاتا ہے اور اس  
 زمانہ میں تو اس اعتراض نے بڑی اہمیت اختیار کر لی ہے۔ اور شخص جو چند سطریں  
 لکھنے کی صلاحیت کا مالک بن جاتا ہے۔ وہ اہل حق پر یہ اعتراض کرنا اپنا فرض  
 منصبی سمجھتا ہے۔ آئیے پہلے معترضین کی بات سنیں اور اس کے بعد حقیقت کی  
 کوئی پراسے پرکھیں۔

معرضین حضرات کہتے ہیں کہ تصوف ایک ایفون ہے۔ اور صوفیاء نے ملت  
 کے قوائے عمل کو مضمحل بلکہ منطوج کر کے رکھ دیا ہے۔ ان کو اس بات پر اصرار  
 ہے کہ ملت کو چاہیے کہ تصوف کی بنائی ہوئی ان روپہلی اور سنہری زنجیروں سے  
 اپنے آپ کو رہا کر انہیں اور تصوف کی پیدا کردہ خواب آلودہ فضا سے نکل کر حقائق  
 کی تلخیوں سے دوچار ہونے کے لیے تیار ہو جائیں۔

بات یہی ہے لیکن معترضین نے اسے نئے نئے جاذب قلب و نظر اسباب

میں بیان کر کے بڑی رنگ آمیزیاں کی ہیں۔

ہم بڑی ذمہ داری اور وثوق کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ یہ الزام سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ان بزرگوں نے ملت کے عروق مردہ میں ہمیشہ نئی روح بھونکی ہے۔ ان کی فیض نگاہ سے حوصلوں میں بلندی، عزائم میں شجستگی، ولولوں میں جولانی، اور قوتِ عمل میں برقِ آسائست اور چمک پیدا ہوتی ہے۔ آپ ذرا تعصب کی پٹی اتار دیجئے۔ اور تبلیغِ اسلام کی تحریک کے جواں مرد، علمبرداروں کے نقوشِ پاک کو دیکھتے ہوئے ان میدانوں تک پہنچنے کی کوشش کیجئے۔ جہاں حق نے باطل پر ابدی فتح حاصل کی۔ برصغیرِ پاک و ہند پر ذرا سرسری نظر ڈالیئے۔ سبھرا ایک درویش، تبلیغِ اسلام کے جذبہ سے سرشار ہو کر اپنے وطن کو چھوڑتا ہے۔ اپنے اقارب و احباب کو الوداع کہتا ہے۔ اپنی منقولہ اور غیر منقولہ املاک سے دست کش ہوتا ہے اور تنہا بت کدہ ہند کا رخ کرتا ہے، یہاں بھی کئی ایسے گوشے تھے جہاں اسلام نے اپنے قدم جمالیے تھے لیکن اس کے حوصلہ کی بلندی اور اس کے عزم کی شجستگی اور اس کے جوش کی جولانی اسے راجپوتانہ کے اس علاقہ میں لے جاتی ہے جہاں کفر کی کالی رات چھائی ہوئی ہے۔ ایک آمر مطلق راجہ وہاں کا حکمران ہے۔ اس ظالم راجہ کی اس ریاست کے کسی دور افتادہ گوشہ کو اپنا مسکن نہیں بناتا بلکہ اس کی راج دھانی میں جا کر اپنا مصلی بچھا دیتا ہے۔ ساری آبادی بت پرست ہے۔ اور اپنے ان مشرکانہ عقائد میں حد درجہ غلو رکھتی ہے۔ وہ اپنے ان معبودوں کے خلاف کوئی بات سننا گوارا تک نہیں کر سکتی۔ جگہ جگہ مندر موجود ہیں۔ بڑے بڑے برہمن ان لوگوں

کے عقائد و نظریات کی حفاظت کے لیے ہر قسم کے علوم و فنون سے مسلح ہیں۔  
 مسند حکومت پر پرتھوی راج جیسا جابر، ظالم اور متعصب ہندو راجہ براجمان ہے۔  
 اس ناسازگار ماحول میں جو شخص حق کی دعوت دیتا ہے اور ہر قسم کے خطرات  
 کے لیے سینہ سپر ہوتا ہے۔ اور پھر اسلام کے پرچم کو یوں لہراتا ہے کہ اسے  
 صدیوں کے انقلابات بھی سرنگوں نہیں کر سکتے۔ وہ شخص کون ہے؟ وہ ایک  
 صوفی ہے تصوف کے رنگ میں اس کا ظاہر اور باطن، اس کا ذہن، اس کا دل،  
 اس کی سوچ اور اس کا نطق سب رنگے ہوتے ہیں۔ کیا ایسے شخص کے بارے میں  
 آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی تعلیمات، قواعد عمل کو منطوق کر دینے والی ہیں۔  
 وہ رزمگاہ حیات سے فرار کا راستہ بتاتا ہے۔ اگر آپ میں یہ جرات ہے تو آپ  
 کہتے اور کہتے رہیں۔ لیکن آپ کے یوں غل مچانے سے حقیقت مسخ نہیں ہو سکتی۔  
 اسی کا خالقہ کہیں یافتہ۔ وہی ہندوستان کے شرق و غرب میں پھیل جانے  
 میں اور کفر و شرک کا اندھیرا جو صدیوں سے یہاں خمیر زن تھا اس کو اپنے نعرہ  
 قلندرانہ سے نیست و نابود کر کے رکھ دیتے ہیں۔ کاش! اس قسم کے نفوس قدسیہ  
 ملت کو ہمیشہ نصیب ہوتے۔

شاید معتز ضیہ کے علم میں نہ ہو کہ جب چنگیزی طوفان نے دنیا سے اسلام کو  
 تہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا، ہزاروں آباد شہر ویران کر دیئے گئے تھے لاکھوں بے  
 گناہوں کو تہ تیغ کر دیا گیا تھا۔ عروس البلاد بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی  
 گئی تھی عقل و دانش کے پرستار اسلام کے مستقبل سے مایوس ہو گئے تھے۔  
 معلوم ہے آپ کو کہ کس نے ان سرکش طوفانوں کا رخ موڑا تھا کس نے اسلام کے

دشمنوں کو اسلام کی شمع کا پروانہ بنا دیا تھا۔ وہ یہی صوفیاء کے گروہ کا ایک فرد تھا جس کی ایک نظر نے ساری فضا کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ ایک خراسانی بزرگ جو سلسلہ عالیہ قادریہ سے نسبت رکھتے تھے اشارہ غیبی کے تحت ہلاکو خان کے بیٹے تگمگودار خان کو دعوتِ اسلام دینے کے لیے تشریف لاتے وہ شکار سے واپس آ رہا تھا اپنے محل کے دروازے پر ایک درویش کو دیکھ کر اس نے ازراہ تمسخر پوچھا: اے درویش! تمھاری داڑھی کے بال اچھے ہیں یا میرے کتے کی دم! اس بیہودہ سوال پر آپ قطعاً برہم نہ ہوئے بڑے تحمل سے فرمایا: اگر میں اپنی جاں نثاری اور وفاداری سے اپنے مانگ کی خوشنودی حاصل کروں تو میری داڑھی کے بال اچھے ہیں ورنہ آپ کے کتے کی دم اچھی ہے جو آپ کی فرمانبرداری کرتا ہے۔ اور آپ کے بیٹے شکار کی خدمت انجام دیتا ہے۔ تگمگودار خان اس غیر متوقع جواب سے بہت متاثر ہوا اور آپ کو مہمان کی حیثیت سے اپنے پاس ٹھہرایا۔ اور آپ کی کوشش سے اس نے درپورہ اسلام قبول کر لیا۔ لیکن اپنی قوم کی مخالفت کے خوف سے اس کا اظہار نہ کیا۔ پھر انہیں یہ کہہ کر نصرت کیا کہ سر دست آپ تشریف لے جائیں میں اپنی قوم کو ذمہ داری طور پر اسلام قبول کرنے پر آمادہ کروں گا۔ چنانچہ آپ واپس آ گئے۔ کچھ عرصہ بعد آپ کا امتحان ہو گیا۔ وفات سے پہلے اپنے بیٹے کو وصیت کی کہ وہ تگمگودار خان کے پاس جائے اور اسے اپنا عہد یاد دلاتے۔ کچھ عرصہ بعد وہ تگمگودار خان کے پاس پہنچے اس کو اپنا تعارف کرایا اور اپنے آنے کی وجہ بتائی۔ اس نے کہا کہ دوسرے تمام سردار اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہیں، لیکن فداں سردار ابھی اسلام قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اگر وہ راہِ راست پر آجائے تو یہ مشکل

آسان ہو سکتی ہے۔ آپ نے اسے بلا بھیجا اور تبلیغ کی۔ اس نے کہا: میری ساری  
 عمر میدان جنگ میں گزری ہے۔ میں علمی دلائل کو نہیں سمجھ سکتا۔ میرا ایک ہی مطالبہ  
 ہے کہ یہ درویش میرے پہلوان سے مقابلہ کرے اگر اسے پھپھاڑ دے تو میں مسلمان ہو  
 جاؤں گا۔ تگودار خان نے آپ کا نحیف و لاغر جسم دیکھ کر اس مطالبہ کو مسترد کرنا چاہا  
 لیکن آپ نے اس کا چیلنج منظور کر لیا۔ مقابلہ کے لیے تاریخ اور جگہ کا تعین ہو گیا۔  
 مقررہ دن بے شمار مخلوقات یہ عجیب و غریب دنگل دیکھنے کے لیے جمع ہو گئی۔ ایک  
 طرف نحیف و کمزور پیر فوت اور دوسری طرف ایک پیل تن گرانڈیل نوجوان، تگودار  
 خان نے بڑی کوشش کی کہ یہ مقابلہ نہ ہو، لیکن وہ درویش مقابلہ کرنے کے لیے  
 مصر تھا۔ جب دونوں پہلوان اکھاڑے میں نکلے تو آپ نے اس زور سے اپنے  
 حریف کو ایک طمانچہ مارا کہ اس کا سر پھٹ گیا وہ غش کھا کر زمین پر آگرا۔ وہ سردار  
 حسب وعدہ میدان میں نکل آیا۔ آپ کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور اپنے مسلمان ہونے  
 کا اعلان کر دیا۔ تگودار خان نے بھی اپنے ایمان کا اظہار کر کے اپنا نام احمد رکھا۔  
 ہلاکو خان کا ایک چچا زاد بھائی تھا۔ جس کا نام برکہ تھا۔ اسے بھی حضرت  
 شیخ شمس الدین بانوری نے مشرف باسلام کیا اس طرح ان پاک نہاد صوفیاء کی  
 جرات ایمانی اور دل آویز اسلوب تبلیغ کے طفیل پاسبان مل گئے کعبہ کو صنم خانے  
 سے فتح قسطنطنیہ، اسلامی فتوحات کی تاریخ کا ایک لافانی واقعہ ہے۔ آپ  
 جانتے ہیں کہ بائیس سالہ سلطان محمد کو کس نے اس کٹھن مہم کو سر کرنے کے لیے  
 براہ کھینچتے کیا۔ وہ ایک صوفی تھے (حضرت عاق شمس الدین) جو سلطان محمد کے  
 مرشد طریقت تھے۔ انہیں کی ترغیب اور بشارت سے سلطان نے یہ بے نظیر

کارنامہ انجام دیا۔

جن صوفیاء کی مساعی جمیدہ کے صدقے دنیا میں اسلام پھیلا، قلعے اور شہر فتح ہوئے۔ قوموں اور ملکوں کے مقدر سنور گئے۔ ان کے بارے میں اسی ملت کے افراد اگر یہ کہیں کہ تصوف ایک افیون ہے۔ یہ غور و فکر کی قوتوں کو شل کر دیتی ہے۔ قوائے عمل کو اپاہج بنا دیتی ہے۔ تو اس زیادتی پر کس سے شکوہ کیا جائے۔

ایسے بیگانوں سے پوچھئے کہ وہ صوفیاء کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

”یورپ کے مستشرق جب اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مسلمانوں کا سیاسی زوال کبھی ان کے دینی نظام کو تباہ نہ کر سکا، بلکہ بقول پروفیسر ہٹی (HITTI) اکثر ایسا ہوا کہ سیاسی اسلام کے تاریک ترین لمحات میں مذہبی اسلام نے بعض نہایت شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔ ہالینڈ کے ایک فاضل لو کے کارونے و بے انداز میں اس بات پر استعجاب کا اظہار کیا ہے کہ گو اسلام کا سیاسی زوال تو بارہا ہوا لیکن روحانی اسلام میں ترقی کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا“ (تاریخ مشائخ چشت ص ۹)

پروفیسر ندکور نے ایک مشہور مستشرق ایچ اے آرگب (GIBB) کی ایک تقریر کا بھی حوالہ دیا ہے۔ جو انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی کی مجلس کے سامنے کی تھی۔

گب نے کہا:

”تاریخ اسلام میں بارہا ایسے مواقع آئے ہیں کہ اسلام کے کلچر کا

شدت سے مقابلہ کیا گیا، لیکن بایں ہمہ وہ مغلوب نہ ہو سکا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تصوف یا صوفیاء کا انداز فکر فوراً اس کی مدد کو آجاتا تھا۔ اور اس کو اپنی قوت اور توانائی بخش دیتا تھا کہ کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔

اسلام کے مخالف اور بدخواہ تو اس طوفانی قوت کا اندازہ کر کے لرزہ برانداز ہیں جو تصوف کے چشمہ شریں سے ملت کو حاصل ہوتی ہے۔ ادھر ہم ہیں کہ اس احساس کمتری میں مبتلا ہیں اور شکوک و شبہات کے خس و خاشاک سے اس چشمہ صافی کو گدلا کرنے کے درپے ہیں۔

تحریک پاکستان میں صوفیاء کرام نے جو شاندار کردار انجام دیا ہے یہ توکل کی بات ہے۔ اس کا کون انکار کر سکتا ہے۔

عصر حاضر مادیت گزیدہ ہے۔ ہر شخص مادی ثروت، مادی لذتوں، اور مسرتوں اور مادی جاہ و منصب کے حصول کے لیے دیوانہ وار مصروف عمل ہے۔ اس دور میں اسے اس کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں کہ پاکیزہ اخلاقی قدیں کس طرح پامال ہو رہی ہیں۔ روحانیت کا رخ زیبا کیوں کر مسخ ہو رہا ہے۔ اور دل کی دنیا طمع و حرص اور حسد و بغض کی آلائشوں سے کس قدر متعفن ہو رہی ہے۔ اگر یہ دیوانگی ہمیں کسی اچھے انجام سے دوچار کر دیتی تو ہم قطعاً اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہ کرتے، لیکن ہم کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ہم بڑی سرعت سے زوال و انحطاط کے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ اور یہ ایسا گڑھا ہے جس میں جو قوم گری ہے پھر اسے ابھرنا نصیب نہیں ہو۔ ملت کے بھی خواہوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی جمہوری، روحانی اور عملی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنی ملت کو اس

گڑھے میں گرنے سے بچائیں اس کا موثر ترین طریقہ یہ ہے کہ ان پاکیزہ فطرت، ہستیوں کی زندگی کا مرقع ریسا پیش کریں جہاں للہیت، خلوص، قناعت، استغناء، عالی حوصلگی، جرات، سخاوت اور ہر انسان سے بے پناہ ہمدردی کے انوار قلب و نظر کو روشنی بخش رہے ہوں۔ اور یہ ساری خوبیاں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ صوفیاء کرام کے سوانح حیات میں ہی دستیاب ہو سکتی ہیں۔

اسی فرض کی ادائیگی کے احساس نے مجھے مجبور کیا ہے کہ اپنے نوجوانوں کی خدمت میں اس یگانہ روزگار درویش، اس فقید المثال مردِ حق، سراپا نور و ضیاء، مرشد و ہادی کی سیرتِ طیبہ کے چند دنوار پہلو پیش کر کے ان وارفتگانِ حسنِ غیر کو یہ کہہ کر بھینچور ٹسکوں سے

اے تماشا گاہِ عالمِ روتے تو

تو کجا بہر تماشا مے رومی

اس کے علاوہ میرے اس اقدام کا محرک ایک اور جذبہ بھی ہے جو میرے نزدیک بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ یہ کہ جو حضرات اس مسلکِ درویشی سے منسلک ہیں انہیں ایک سچے اور سچے درویش سے معاف کراؤں تاکہ انہیں پتہ چلے کہ اس کی اخلاقی بندلیوں، اس کی روحانی رفعتوں، اس کے کردار کی سنگلی اور اس کے حوصلوں کی جولانیوں کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ جب وہ مدید ہوتا تو کس حیرت انگیز لگن، استقامت اور اولوالعزمی سے سلوک کے مدارج طے کرتا ہے۔ اور جب وہ مندارِ شاد کو زینت بناتا ہے تو کس دل سوزی اور یک سوئی سے باویہِ ضلالت میں سرگرداں رہنے والوں کی دست گیری کر کے انہیں واصلِ بحق

لے آپ کا یہ مقالہ ماہنامہ "نیما" سے حرم کے شمس العارفین نے لیا یا یہ جیسے خدمتِ خیر کے شمس العارفین کے ہاتھوں سے لیا گیا ہے۔

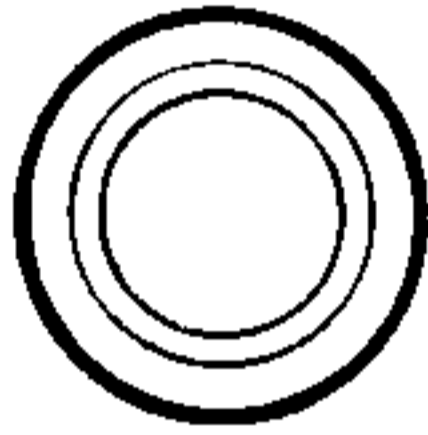


کرتا ہے۔ اس کی پاک زندگی کے دونوں حصے عمل پیہم اور سعی مسلسل سے عبارت ہوتے ہیں۔ سستی اور کاہلی اس کے قریب تک نہیں پھسکتی۔ اس کا ظاہر اور باطن محبت الہی کے رنگ میں رنگا ہوتا ہے اور اس کے قول اور عمل میں تضاد کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ تاکہ اکابر اولیاء کرام کے سجادہ نشین حضرات اپنے اسلاف کرام کے اسوہ حسنہ سے کسب فیض کر کے اسی جواں مہتی، بالغ نظری کا ثبوت دیں اور اپنی تمام توانائیاں اسلام کو سر بلند کرنے کے لیے وقف کر دیں۔

آخر میں ایک ادنیٰ گزارش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ کسی ولی کامل کے سجادہ نشین کی ذمہ داریاں بڑی اہم اور متنوع قسم کی ہوتی ہیں۔ عقیدت مندوں کی اپنے شیخ کے جانشین سے بڑی توقعات وابستہ ہوتی ہیں۔ وہ اپنے نجی اور اجتماعی، مقامی اور ملکی، دینی اور سیاسی جملہ معاملات میں اس سے رہنمائی کی توقع رکھتے ہیں۔ اس لئے صاحب سجادہ کے لیے ضروری ہے کہ علم و فضل میں بھی بلند پایہ رکھتا ہو اور اخلاق و کردار میں بھی مثالی حیثیت کا مالک ہو۔ اس لیے حضرات سے درخواست ہے کہ اپنی صورتی یا معنوی اولاد میں سے جس فرزند کو وہ اپنی جانشینی کے لیے منتخب فرمادیں۔ اس کی تعلیمی اور اخلاقی تربیت کی طرف خصوصی توجہ مبذول فرمادیں۔ وہ قدیم اور جدید علوم کا ماہر ہو۔ مشہور عالم یونیورسٹیوں کا وہ فاضل ہو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا اخلاق اور کردار اتنا بلند ہو کہ کوئی بدخواہ بھی انگشت نمائی نہ کر سکے۔ ایسے ہونہار سپوت ہی اس پرفتن دور میں فقر و درویشی کی شمع کو روشن رکھ سکتے ہیں۔

علامہ اقبال نے یہ فرمایا ہے

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے  
 وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز حیرانہ  
 مخالفین اس سلسلہ کو باوجود بڑی کوشش کے نہ نقصان پہنچا سکے اور نہ آئندہ  
 پہنچا سکیں گے یہیں جو نقصان پہنچایا ہے جاہل اور کمزور کردار کے مالک مستوفین نے  
 پہنچایا ہے۔





# اسلام میں تصوف کا مقام



جنوری ۱۹۷۹ء میں پاک پبلسٹری میں شیخ العالم حضرت  
خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ کے عرس مبارک پر  
مدیر اعلیٰ ماہنامہ "نیما" حرم حضرت پیر محمد کرم شاہ ایچ۔ اے  
الازہر نے مشائخ عظام اور علمائے کرام کے عظیم الشان  
اجتماع میں جو بصیرت افروز تقریر فرمائی وہ  
تدوین کی نیافت طبع کے لیے  
ماتہ خیرت ہے۔





اگلے روز حضرت قبلہ دیوان صاحب سجادہ نشین آستانہ عالیہ کا حکم نامہ ملا جس میں تحریر تھا کہ حضرت شیخ الشیوخ، فرید الحق والدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے عرس مبارک کے موقع پر جمعیت المشائخ کی طرف سے مجالس تصوف کا انعقاد عمل میں آ رہا ہے، نیز اس ذرہ ناپتیر کو بھی ”اسلام میں تصوف کا مقام“ کے موضوع پر مقالہ پیش کرنے کا فرمان تھا۔

اس گرامی نامہ کے مطالعہ سے مجھے دو گونہ مسرت ہوئی۔ ایک اس لیے کہ اس مردِ خود آگاہ اور خدا آگاہ قدس سرہ کے آستانہ عالیہ پر لاکھوں فرزندِ انِ اسلام حاضری دیتے ہیں۔ ان میں ہر شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں اہل نظر بھی، اہل خبر بھی۔ دیوانگانِ عشق بھی اور اقلیمِ عقل و خرد کے تاجور بھی، حاکم بھی اور رعایا بھی، خاص بھی اور عام بھی۔ پاکستان کے ہر صوبہ، ہر صوبہ کے ہر ضلع کے رہنے والے اپنے دلوں میں اُردمانوں اور تمنائوں کی ایک حسین دنیا سمیٹے ہوئے حاضر ہوتے ہیں، لیکن جب وہ واپس جاتے ہیں تو کیا لے جاتے ہیں یہ سوال ہر دل میں کھٹکتا ہے۔ صاحبِ آستانہ کی باطنی توجہ اور روحانی فیضان

میں تو کلام نہیں بسیکن ظاہری طور پر ان کی صحیح راہنمائی کا کوئی اہتمام نہیں ہوتا جس  
 دلربا ہستی کی کشش انہیں کشاں کشاں یہاں لے آئی ہے۔ اس کے کردار اور  
 سیرت کی ایک جھلمک دیکھنے کے لیے ان کی آنکھیں ترستی ہی رہ جاتی ہیں، ملک  
 کے اطراف و اکناف سے آنے والوں کی تشنگی کا درماں کرنے کے بارے میں  
 کچھ کیا جاتا ہے اور نہ سوچا جاتا ہے۔ یہ حالت آستانہ عالیہ کے ہر ذمی ہوش  
 عقیدت مند کے لیے بڑے کرب اور قلق کا باعث تھی۔

حضرت قید سجادہ نشین مدظلہ العالی کی نگاہ دور رس نے اس کسک کو محسوس  
 کیا اور اس سال اپنی نگرانی میں مجالس تصوف کے انعقاد کا اہتمام فرمایا۔ امید ہے  
 اس اقدام سے یہ کمی بہت حد تک پوری ہو جانے کی۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس پروگرام  
 کا آغاز کم از کم میرے لیے بڑا دل خوش کن ہے۔

دوسری خوشی مجھے یہ ہوئی کہ ان بابرکت مجالس میں اس درویش بے نوا کو  
 بسی یاد فرمایا گیا۔ یہ امر میرے لیے صد فخر و مباہات کا باعث ہے۔

خوشیوں کے اس ہجوم میں ایک خلش مجھے مضطرب کر رہی ہے کہ جو اہم و  
 ارفع موضوع مجھے دیا گیا ہے، شاید اس کا حق میں ادا نہ کر سکوں۔ اس کی وجہ اپنی  
 کم بضاعتی بھی ہے اور وقت کی تنگی بھی۔ مجھے ۲ دسمبر دس گیارہ بجے کے قریب  
 یہ والا نامہ موصول ہوا ہے، قلتِ وقت کے پیش نظر میں اس موضوع سے انصاف  
 نہیں کر سکا۔ بہر حال توفیق الہی سے جو کچھ ہو سکا، پیش خدمت ہے۔

آج تصوف پر ہر طرف سے یورش ہو رہی ہے۔ الزام تراشی میں ایسی جدت  
 طرازیوں اور ندرت آفرینیاں برتی جا رہی ہیں کہ انسان حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔

بیگانے تو عرصہ دراز سے تیرا فگنی میں مشغول تھے۔ انھیں ایسا کرنے کا حق بھی تھا۔  
تصوف نے ان کے ظلمت کدوں کے اندھیروں کا خاتمہ کر دیا تھا۔ وہ اندھیروں  
کی مخلوق تھے۔ اس چکا چونڈنے ان کی دنیا تاریک کر دی، ان کی بزم عیش و نشاط  
الٹ دی گئی۔ ان کے ہوا و ہوس کے صنم کدے ویران ہو گئے۔ ان کی عمرانی،  
معاشی اور معاشرتی قدیریں جو انھیں بے حد عزیز تھیں اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھیں۔  
تصوف اور اس کے حاملین کے ہاتھوں جنھیں اتنے پر کے لگے ہوں، ان کی  
برہمی اور ناراضی بے جا نہیں۔ اپنی آتش انتقام کو بجھانے کے لیے اگر انھوں نے  
کذب و افتراء کا سہارا لیا تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں، اور نہ ہمیں ان کا  
شکوہ کرنا زیب دیتا ہے۔ لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اب اپنے بھی تیشہ  
اور کدال لیتے اس حصار محکم کو منہدم کرنے کے درپے ہیں جن کو کئی صدیاں اس  
قلعہ نے حوادثِ دہر کی بے رحم ملیغاروں سے بچایا۔ وہ لوگ بھی اس چشمہ شیریں کو  
بند کرنے میں کوشاں ہیں، جس کے آبِ زلال نے ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی  
کے گلستانوں کو شاداب کیا اور پر بہار رکھا۔ جس قوم کی تاریخ تصوف کے تخلیقی اور  
تعمیری کارناموں سے درخشاں ہے، وہی قوم اب اس سے نالاں ہے۔

یہ صورتِ حال قابلِ برداشت نہیں۔ وہ لوگ جو تصوف کی افادیت کے قائل  
ہیں، جو اس کے دور رس اثرات کا علم رکھتے ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ آگے آئیں  
ذہنی انتشار کی پیدا کردہ ہولناک تاریکیوں میں اپنی تحقیق کے چراغ روشن کریں تاکہ  
ساک راہ حقیقت بہک نہ جائے۔ اور دامانِ خضر اس کے ہاتھ سے چھوٹ  
نہ جائے۔



سب سے پہلے میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ تصوف ہے کیا؟ اس مقصد کے لیے میں فقط ان اولیاء و عارفین کے ارشادات پر اکتفا کروں گا، جو کشورِ تصوف کے تاجدار ہیں، جو بحرِ حقیقت کے ماہرِ غواص ہیں جن کا قول، قولِ فیصل ہے۔ جن کی بات قطعی اور آخری ہے۔ جب تصوف کی صحیح تعریف آپ کے ذہن نشین ہو جائے گی، تو پھر منزل کی طرف آگے بڑھنا آسان ہو جائے گا۔

حضرت معروف کرخی (م ۲۰۰ - ۶۸۱۶) تصوف کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”حقائق کو گرفت میں لانا، وقائق پر گفتگو کرنا اور خلایق کے پاس

جو کچھ ہے، اس سے ناامید ہونا تصوف ہے۔“ (تذکرہ الاولیاء ص ۱۷۲)

حضرت ذوالنون مصری (م ۲۲۵ھ، ۶۸۵۹) سے پوچھا گیا کہ صوفی کون لوگ

ہیں، فرمایا:

”وہ لوگ صوفی ہیں، جنہوں نے تمام کائنات میں سے صرف

اللہ تعالیٰ کو پسند کیا۔“

حضرت سہل بن عبد اللہ تستری (م ۲۸۳ھ، ۶۸۹۶) کا ارشاد ہے:

”صوفی وہ ہے جس کا دل کدورت سے خالی اور تفکر سے پر ہو،

اور قربِ خدا عزوجل میں بشر سے منقطع ہو، اس کی آنکھوں میں خاک اور

سونا برابر ہو۔“

حضرت جنید بغدادی (م ۲۹۷ھ، ۶۹۱۰) کا ارشاد گرامی ہے:

”صوفی وہ ہے، جس کا دل دنیا سے متنفر اور فرمانِ الہی کو ماننے والا

ہو۔ اس میں تسلیم، حضرت اسمعیل علیہ السلام کی طرح، اندوہ حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح، فقر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح، صبر حضرت ایوب علیہ السلام کی طرح، شوق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح اور اخلاق سید الانبیاء والمرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح ہو۔  
(تذکرۃ الاولیاء)

ان تصریحات کے الفاظ میں تفاوت ضرور ہے، لیکن مدعا اور مقصد سب کا ایک ہے۔

حضرت شیخ کامل شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ اپنی شہرہ آفاق کتاب "عوارف المعارف" میں "صوفی کون ہے" کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں،  
"شیخ عبدالواحد سے کسی نے دریافت کیا کہ آپ کے نزدیک صوفی کون ہے، آپ نے جواب دیا کہ میرے نزدیک صوفی وہ لوگ ہیں جو اپنی عقل کے بقدر پیہم سنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر قائم ہیں اور اپنے دلوں کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہیں اور اپنے نفوس کی شرارتوں سے بچنے کے لیے اپنے پیشوا اور سردار کا دامن پکڑے ہوئے ہیں۔"

جب صوفیائے کاملین کے نزدیک تصوف اور صوفی کی یہ تعریف ہے تو اب میں ان مدعیان علم و دانش سے پوچھتا ہوں جو تصوف کو غیر اسلامی نظریات کا مجموعہ عجمی افکار و تصورات کا مظہر کہتے ہوئے نہیں جھبکتے کہ کیا پوری کیسوفی سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع، اس کے حکم کی تعمیل، اس کی رضا کے حصول کے لیے

سارے عالم سے روٹھنا اور اس کے حبیبِ مکرم، نورِ مجسم سے والہانہ عقیدت و محبت اسلام کی تعلیمات کا خلاصہ نہیں، اور وہ شخص جو ان احوال سے بہرہ ور ہو، جو ہر ناشائستہ حرکت سے گریزاں اور تمام محامد و محاسن کا پیکرِ رعنا ہو، کیا وہ اسلامی تعلیمات کا حسین و جمیل نمونہ نہیں؟ کیا ایسے پاک نہاد کی نکھری ہوئی شخصیت اسلام کی حقانیت کی روشن دلیل نہیں؟ اگر آپ ان تعلیمات کو غیر اسلامی گردانتے ہیں اور ایسے نفوسِ قدسیہ کو عجیبی تصورات و افکار کا نمائندہ کہنے پر بضد ہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپ اسلام کو اس کی عظمتوں اور رفعتوں سے محروم کرنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ آپ اپنی ملت کو ان نادردہ روزگار اور فخرِ دہور و اعصار بستوں سے محروم کر دینا چاہتے ہیں جو اسلام کی آبرو اور انسانیت کے لیے وجہ شرف ہیں۔

مؤثر ضمن میں سے کوئی اسلامی تصوف کو مسیحی رہبانیت کا عکس قرار دیتا ہے، کوئی افلاطونیت کے فلسفہ کو اس کا ماخذ قرار دیتا ہے۔ کوئی اس کا رشتہ بدھ مت اور ہندومت سے جوڑتا ہے۔ کوئی مالوئیت اور ایرانی فلسفہ کو اس کا سرچشمہ ثابت کرنے کے درپے ہے۔ تصوف سے پیر رکھنے والے لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں۔ ان میں خود بھی وحدتِ فن مفقود ہے۔ البتہ ایک بات میں سب متحد ہیں کہ تصوف کی پاکیزہ تعلیمات کا تعلق اسلام سے نہیں، میراجی تو چاہتا ہے کہ میں ان تمام غیر اسلامی مصادر و مراجع کا تجزیہ کروں، جن کو مستشرقین اور ہمارے ہاں محققین کہلانے والے تصوف کا ماخذ ثابت کرتے ہیں اور بتاؤں کہ تصوف ان تمام سے الگ، ان تمام تصورات سے جدا، ایک مستقل نظریہ ہے۔

جس کا سرچشمہ صرف قرآن حکیم اور سنت رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہے، لیکن وقت کی کمی اس کی اجازت نہیں دیتی۔

امید ہے حاضرین کے سامنے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ صوفیائے کاملین کے نزدیک تصوف اور صوفی کا کیا مفہوم ہے اور ان کی تصریحات کے سامنے کسی نولڈیکی دان کریم اور نکلسن کے اقوال کی کوئی اہمیت نہیں۔

مسلمانوں میں بھی بعض مدعیان علم و تحقیق ایسے ہیں جو تصوف کو عجیبی تصورات کا مجموعہ سمجھتے ہیں اور تصوف پر تنقید کرتے ہوئے بڑے شد و مد سے یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی موجودہ سیاسی پستی اور معاشی بد حالی کی وجہ صوفیانہ نظریات ہیں۔ تصوف اپنے ماننے والوں کو رہبانیت کی زندگی گزارنے کی دعوت دیتا ہے۔ کش مکش حیات سے الگ تھلگ رکھتا ہے۔ تصوف کے زیر اثر عملی قوتیں مفلوج ہو جاتی ہیں۔ اور انسان کا رگاہ حیات میں اپنا فرض ادا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اپنے اس قول کی تائید کے لیے وہ صوفیا کرام کی چلہ کشی، ریاضات و عبادت اور خانقاہوں میں عزلت گزینی کو پیش کرتے ہیں، لیکن اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو حقیقت اس کے برعکس ہے۔ بے شک شیخ کامل مرید سے چلہ کشی کراتا ہے۔ جہاں وہ علاقہ دنیا سے الگ رہتا ہے۔ ذکر و فکر میں چند روز گزارتا ہے لیکن جب مبتدی ریاضات و عبادات اور چلہ کشیوں سے اپنے کردار اور سیرت کو اسلام کے حسین سانچے میں ڈھال لیتا ہے اور احکام الہیہ کی تعمیل اس کے لیے فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ اور اس کے اخلاق میں بختگی آ جاتی ہے۔ اس وقت وہ شمشیرِ ربہنہ بن کر میدانِ عمل میں قدم رکھتا ہے اور وہ کارنامے انجام دیتا ہے۔

جن کی نظیر ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ اس کی مثال بعینہ ایسی ہے جیسے فوج میں نگرہ کو بھرتی کیا جاتا ہے، اسے کچھ عرصہ کے لیے چھاؤنی میں رکھ کر اس کی عسکری تربیت کی جاتی ہے، تاکہ وہ اپنے بچاؤ کے ساتھ دشمن پر موثر دھاوا بول سके۔ اسے اسلحہ کو استعمال کرنے کی پوری پوری مشق کرائی جاتی ہے۔

اگر کوئی ملک دشمن سے برسہا برس پیکار ہو، اور جنگ کے شعلے بھڑک رہے ہوں اس وقت بھی جن لوگوں کو فوج کے لیے بھرتی کیا جاتا ہے، انہیں فوراً محاذ جنگ پر نہیں بھیج دیا جاتا بلکہ انہیں تربیت کے لیے لامحالہ چھاؤنی میں رکھا جاتا ہے جب وہ ہتھیار چلانے کی مشق کر لیتے ہیں، لڑائی کرنے کے طریقے سیکھ لیتے ہیں تب انہیں دشمن کا سر کھینچنے کے لیے روانہ کیا جاتا ہے۔ اگر انہیں ٹریننگ کے بغیر میدان جنگ میں بھیج دیا جاتے تو وہ دشمن کا نقصان کرنے کے بجائے اپنے لشکر کے لیے وبال جان بن جائیں گے۔

پہلے اکثر علماء تکمیل علوم کے بعد تلاشِ مرشد میں شہر بہ شہر سرگرداں رہا کرتے اور جب کوئی مردِ کامل نظر آتا تو اس کے دستِ حق پرست پر بیعت کرتے اور اس کی خانقاہ میں رہ کر روحانی تربیت حاصل کرتے۔ اور جب ان میں دینی سنجگی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں تو پھر مرشدِ کامل انہیں لوگوں کی رشد و ہدایت کے لیے کسی علاقے میں متعین فرماتا۔ اس طرح اس کا روحانی فیض ہزاروں، لاکھوں کی بگڑھی بنا دیتا۔ اس لیے چلہ کشی اور ریاضت، رہبانیت نہیں، جس طرح ہمارے بعض احباب کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ بلکہ رزمگاہِ حق و باطل میں اپنا صحیح کردار انجام دینے کے لیے یہ تربیت کے لمحے ہیں، جو اس کی زندگی کو کامیاب بنانے

کے لیے از بس مفید ہیں۔

آپ اولیائے کاملین کی سیرت کا مطالعہ کیجئے، ان کی کتاب زیست کا ہر ورق جہاد اور مجاہدے کے رُوح پرور کارناموں سے تابندہ ہے۔ ہم ہندوستان کی تاریخ پر ہی نظر ڈالتے ہیں۔ بے شک حضرت خواجہ غریب نواز معین الحق والدین نے تحصیل علم کے بعد کافی سال اپنے مرشدِ کامل حضرت خواجہ عثمان مارونی کی خانقاہ میں گزارے۔ یہ مدت بے شک خلوت اور عزلت کی تھی۔ اس عرصہ میں ان کی تمام تر توجہ اصلاحِ باطن اور تزکیہ قلب پر مرکوز رہی، لیکن جب سوک کی یہ منزلیں طے کر کے مسندِ ارشاد پر فائز ہوئے تو آپ کے عزمِ محکم ہمت بلند نے کفر و باطل کے جو قلعے سرکئے۔ شرک کے جن صنم کدوں کو پیوندِ خاک کیا۔ دنیا کا کوئی بڑا فاتح اور جرنیل بھی اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتا۔ اس دور میں جب ہر طرف آمریت اور ملوکیت کا دور دورہ تھا۔ یکہ و تنہا، حق و دق صحراؤں کو عبور کرتے ہوئے راہپوتانہ کی مرکزی ریاست اجمیر میں آکر ڈیرا لگانا، کسی راہب کا کام نہ تھا، بلکہ اس مردِ خدا کا کام تھا، جو خطرات کی آندھیوں میں اپنا چراغ روشن رکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا، جو مہلک گردابوں اور تند طوفانوں سے اپنا سینہ سلامتی سے نکال کر لے جاسکتا تھا۔ جو مشکلات کا ہر چیلنج قبول کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار تھا، جس کے نزدیک راہِ حق میں جان دینا حیاتِ جاوید تھی، جس کے دل کی دنیا میں کسی رائے پتورا کے لیے کوئی جگہ نہ تھی، وہ صرف اپنے خدا سے ڈرتا تھا اور صرف اس کے حکم کے سامنے اس کی گردن جھک سکتی تھی۔

جس جرات، بہادری اور ملت سے حضرت خواجہ غریب نواز نے تبلیغ اسلام کا کام کیا، اور لاکھوں برگشتہ قسمت لوگوں کی تفتیر کو سنوار دیا۔ کیا یہ راہبانیست ہے؟ کیا یہ کش مکش حیات سے گریز اور فرار ہے؟ یہ سلسلہ آپ کے خالوادہ میں درجہ بدرجہ چلتا آیا۔ حضرت فرید الحق والدین گنج شکر رضی اللہ عنہ نے اپنے شیخ کی خانقاہ میں مراتب سلوک طے کئے۔ جب ریاضات و عبادات سے آپ کی تربیت مکمل ہو گئی تو اپنے شیخ طریقت کی اجازت سے آپ نے اس مبارک بستی میں اقامت اختیار کی اور زندگی کے بقیہ چند سالوں میں جو نورانی اور ایمان پرور انقلاب برپا کیا۔ جہالت و بربریت کے دلدل میں پھنسے ہوئے لوگوں کو علم و معرفت کی جو روشنی عطا فرمائی۔ اس کی عظمت اور اہمیت کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ جن جنگلی قبائلی لوگوں کو آپ نے نور اسلام سے مشرف فرمایا صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ان کی اولادیں اس سبق کو یاد کتے ہوئے ہیں! اور اگر حضرت باوا صاحب اور دیگر صوفیاء کرام کی مساعی جمیلہ سے یہ خطہ نور اسلام سے منور نہ ہوتا تو پاکستان کا تصور تک بھی کسی ذہن میں نمودار نہ ہوتا۔

اب بھی اس درگاہ عالی کے فیوضات کا یہ عالم ہے کہ لوگ روتے روتے آتے ہیں اور ہنستے ہوتے واپس جاتے ہیں بشکستہ دل آتے ہیں تو ان کی دلداریاں کی جاتی ہیں فسق و فجور سے آلودہ آتے ہیں اور سچی توبہ کر کے پاکیزہ زندگی بسر کرنے کا عزم لے کر جاتے ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آتا کہ سپہ فقر و ولایت کے اس نیر اعظم کی تابانیوں کو دیکھنے کے بعد بھی لوگ یہ کہنے کی جرات کیوں کرتے ہیں کہ تصوف ایفون ہے۔ یہ فوائے عمل کو ناکارہ کر دیتی ہے۔ زندگی کے متلاطم سمندر میں کودنے

کی جرأت سلب کر لیتی ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ وہ عزم جو شکست قبول ہی نہیں کر سکتا وہ دل میں پیدا ہی اس وقت ہوتا ہے، جب کسی مردِ کامل کی نگاہ کرم پڑتی ہے۔

ہندوستان میں نو صدیوں پر پھیلی ہوئی اپنی تاریخ کا آپ مطالعہ کریں۔ آپ کو پتہ چلے گا کہ جن سلاطین کی شجاعت اور بیدار مغزئی کے ہم گن گاتے ہیں، جن سپہ سالاروں کی کشورکشائیوں کا ذکر کر کے ہمارے فخر سے بلند ہو جاتا ہے، جن علماء اور فضلاء کے علمی کارناموں سے ایک دنیا فیض یاب ہوئی، وہ قادر الکلام اور لغز گو شعرا جنہوں نے اپنے کلام معجز نظام سے نیکی اور بھلائی کو فروغ دیا اور برائی اور بدی کی بیخ کنی کی۔ ان میں سے اکثر کسی نہ کسی مردِ کامل کے بسترِ فترت تھے۔ محمود غزنوی سے لے کر شہاب الدین غوری، قطب الدین ایبک، شمس الدین التمش، اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ تک سب اولیا کرام کے فیض یافتہ تھے۔ صرف ہندوستان تک ہی محدود نہیں، جہاں جہاں بھی اسلام کے جرنیوں نے اپنی فتوحات کے پرچم گاڑے ہیں۔ ان کی پشت پناہی کرنے والی کوئی روحانی طاقت تھی۔ قسطنطنیہ کی فتح دنیا نے عرب کا محیر العقول کارنامہ ہے۔ جس کی نظیر تاریخِ عالم میں نہیں ملتی جس ترکی سلطان کو اس شہر کی فتح کی سعادت نصیب ہوئی، اس کا نام نامی سلطان محمد ہے جو فاتح کے لقب سے چاروں عالم میں مشہور ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ اس خطرناک مہم کا محرک کون تھا؟ اور کس نے سلطان محمد فاتح کو یہ سعادت حاصل کرنے کا شوق دلایا؟ وہ اس کے شیخِ طریقت تھے سلطان کی عمر اس وقت صرف بائیس سال تھی۔ ان کے مرشدِ کامل نے کہا کہ تم قسطنطنیہ



پر حملہ کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں کامیابی عطا فرمائے گا۔ اپنے شیخ طریقت کی ترغیب اور تشویق پر سلطان محمد فاتح نے جنگوں کی تاریخ کا یہ مجیر العقول کا نامہ انجام دے کر دانش وران عالم اور ماہرین فن حرب کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ اگر صوفیاء راہبانہ زندگی گزارنے کے خوگر ہوتے، اور تصوف ایون ہوتا، تو آپ کی تاریخ ان نریں کارناموں سے جگمگانہ رہی ہوتی۔

اکبر کے زمانہ میں جب ساری الحادی قوتیں اسلام کو مٹانے کے لیے میدان میں نکل آئی تھیں، آپ کو معلوم ہے کہ اس طوفانِ بلاخیز کا رخ کس نے موڑا تھا۔ وہ ایک مرد درویش تھا۔ جو خواجہ باقی باللہ کی خانقاہ کا تربیت یافتہ تھا جو فقرو درویشی کی آغوش میں پل کر جوان ہوا تھا۔ جسے دنیا مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے یاد کرتی ہے۔

یہ تاریخی شواہد ان لوگوں کے باطل نظریہ کی تردید کے لیے کافی ہیں، جو تصوف پر طرح طرح کے الزام لگاتے ہیں۔

خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ تصوف وہ نظام ہے جو انسان کی صرف جسمانی تربیت کی طرف متوجہ نہیں ہوتا بلکہ اس کی روحانی بالیدگی پر اپنی ساری مساعی کو وقف کر دیتا ہے۔ اس کے مکتب کے طالب علم جب نماز ادا کرتے ہیں تو صرف ان کی زبان ہی تسبیح و تہلیل نہیں کرتی۔ ان کے ظاہری اعضاء ہی قیام اور رکوع و سجود میں مصروف نظر نہیں آتے، بلکہ ان کا دل، ان کی روح، ان کے جسم کا رُوں ان کے ذکر الہی سے سرشار ہوتا ہے۔ ان میں تواضع، انکسار، بربادی، تحمل، ایثار، عفو و درگزر، محبت و مودت کے وہ مکارم اخلاق رونما ہوتے ہیں کہ دنیا ان کے نورانی

چہرہ کی زیارت کر کے ان کا دین قبول کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔  
 حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے جب کسی نے حضور نبی کریم صلی اللہ  
 علیہ وسلم کے خلقِ عظیم کے بارے میں پوچھا تو آپ نے از حد مختصر اور جامع جواب  
 دیا:

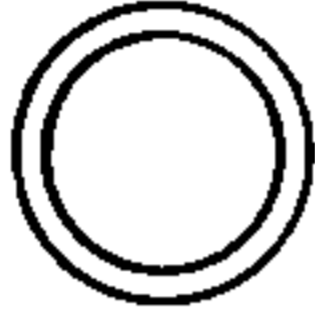
كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ

یعنی حضور کا خلق قرآن کریم تھا۔

اخلاقِ محمدی کا یہی پر تو صوفی کے دل کو منور کرتا ہے اور اس کے ظاہر و  
 باطن کو صبغة اللہ و من احسن من اللہ صبغة کے رنگ میں سے  
 رنگیں بنا دیتا ہے۔ کسی انسان کو صحیح انسان بنانا سب کاموں سے زیادہ  
 اہم اور زیادہ مشکل کام ہے۔ اور جو ہستیاں ایک نہیں، لاکھوں کو درندگی اور وحشت  
 کی آلودگیوں سے پاک کر کے راقیت و رحمت کا پیکر بنا دیتی ہیں۔ ان سے بڑھ  
 کر انسانیت کا محسن اور کون ہو سکتا ہے۔

تصوف کی تاریخ اور صوفیاء کرام کی پاکیزہ زندگیوں کو دیکھ کر ایک منصف  
 مزاج محقق اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اسلام میں تصوف کا وہی مقام ہے، جو  
 روح کا جسم میں، خوشبو کا پھول کی پتی میں اور روشنی کا مہتاب میں ہے۔  
 جب سے تصوف کی طرف ہماری رغبت کم ہوئی ہے، عبادات کے گلشن میں  
 جو پھول کھلتے ہیں، وہ اس مہک سے عاری ہیں۔ اعمال کے جو درخت ہیں،  
 وہ پھل سے محروم ہیں۔ جسم تو بارگاہِ الہی میں جھکتا ہے، لیکن روح کو خبر تک

نہیں ہوتی۔ زبان تسیح و تہلیل میں مصروف ہوتی ہے، لیکن دل کسی اور صحرا  
 میں بھٹک رہا ہوتا ہے۔ نہ عبادات میں لطف رہا ہے اور نہ ان اعمال کی  
 نورانیت کے جلوے نمایاں ہوتے ہیں۔



حضرت خواجہ

شمس العارفین  
رحمۃ اللہ علیہ

افصحا

ان کا عہد







صحیح روایات کے مطابق قدوۃ العاشقین حضرت قبلہ شمس الحق والدین سیالوی  
 قدس سرہ العزیز کی ولادت باسعادت ۱۲۱۲ھ میں ہوئی اور ۸۴ سال کی عمر میں  
 ۱۳۰۰ھ میں وصال فرمایا۔ عیسوی سن کے مطابق یہ انیسویں صدی کا دور بنتا ہے۔  
 جو لوگ تاریخ ہندوستان سے واقف ہیں۔ ان پر مخفی نہیں کہ یہ دور امت مسلمہ  
 کے لیے کتنا جانکاہ اور صبر آزما تھا۔ وہ قوم جس نے تعداد کی قلت کے باوجود اپنی  
 جرات، سیاسی بصیرت، عملی برتری، اخلاقی بلندی اور قوت ایمانی کے باعث  
 ہندوستان پر اٹھ سو سال تک حکومت کی تھی۔ آج وہ حوادث و ہر سے خوفزدہ  
 اور ہراساں تھی۔ محمود، شہاب الدین، التمش، بابر، اورنگ زیب علیہم الرحمۃ کے  
 وارث اپنے عظیم اسلاف کی صفات سے یکسر محروم ہو چکے تھے۔ ہمیشہ کوشی،  
 سہل انکاری، جاہ طلبی اور سیم و زر کی محبت نے انہیں ناکارہ کر کے رکھ دیا تھا۔  
 اس صدی میں مغلیہ سلطنت کا آفتاب غروب ہونے والا تھا۔ ہندوستان کی  
 وسیع و عریض اسلامی مملکت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ کر رہ گئی تھی۔ فرنگی استعمار

اسلام کے ان قلعوں کو یکے بعد دیگرے بڑی آسانی سے مسمار کرتا ہوا فخر البلا و دہلی کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔

پنجاب کی حالت سب سے زیادہ خستہ تھی۔ مرکز سے کٹ جانے کے بعد اس کی حیثیت بے جان لاش کی سی تھی۔ جسے چیلین، گدھ اور کتے آپس میں بانٹ رہے ہوں۔ ہر علاقہ میں ایک خود مختار حکومت قائم تھی۔ ہر قابل ذکر شہر کسی نہ کسی طالع آزما رئیس کی راجدھانی بن چکا تھا۔ ان کے درمیان رقابتوں کی آگ ہر وقت بھڑکتی رہتی تھی۔ ایک دوسرے سے برا فروختگی اور برہمی کا یہ عالم تھا کہ وہ مشترکہ خطرہ کے مقابلہ میں بھی متحد ہونے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان حالات میں سکھوں نے اپنی قلیل تعداد کو منظم کر کے ان کمزور اور باہم برسر پیکار رئیسوں کو تارنا شروع کر دیا۔ اور ایک ایک کر کے ان کے علاقوں پر قبضہ کرتے چلے گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی سکھ بستیوں روٹا ہوا ہو گئیں۔ ان خود غرض اور عاقبت ناندیش نوابوں اور رئیسوں کی سزا مسلم راجا کو مل رہی تھی۔ مسلمانوں کے دل آزاری اور ان کی تذلیل سکھوں کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ سارا ملک لاقانونیت کی زد میں آ گیا۔ تمام مظالم کا تختہ مشق مسلمان تھے۔ انہی کے گھر لوٹے جاتے، انہی کی بستیاں تاراج کی جاتیں، انہی کے گھر جلاتے جاتے، انہی کی مساجد اور عبادت گاہوں کو اصطبلوں میں تبدیل کر دیا جاتا۔

افغانستان اپنی داخلی خانہ جنگی میں اس قدر مصروف تھا کہ اس کے حکمران نہ دہلی کے مغل بادشاہ کی کوئی امداد کر سکے اور نہ ہی پنجاب کے مظلوم مسلمانوں کی فریاد سن کر ان کی مدد کو پہنچ سکے۔ جن حکمرانوں نے برصغیر کے حالات کو درست کرنے

کے لیے اقدامات کئے وہ ادھر وہاں اور نا کافی تھے۔ ادھر وہ پنجاب میں سکھوں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے کابل سے روانہ ہوتے پیچھے سے ان کے دشمن بغاوت کا پرچم لہرا دیتے چاروناچار اس حاکم کو پھر واپس لوٹنا پڑتا سا رہندوستان طوائف الملوک کی کا شکار تھا۔

تاریخ کی بوجیبیوں پر جب نظر پڑتی ہے تو انسان حیران و ششدر رہ جاتا ہے ۱۷۹۹ء ہی وہ سال ہے جس سے دنیا سے اسلام کے بطل جلیل سلطان ٹیپو اس ملک کو انگریزوں کے ناپاک تسلط سے بچانے کی مجاہدانہ کوششوں میں جام شہادت نوش کرتا ہے۔ ۱۷۹۹ء ہی میں رنجیت سنگھ لاہور پر قبضہ کرتا ہے۔ آپ اندازہ فرمائیے کہ یہ لمحے امت مسلمہ کے لیے کتنے کرب ناک اور مایوس کن ہوں گے، لیکن رحمت الہی نے مایوسیوں کے گھپ اندھیروں میں امید کا چراغ روشن کرنے کے لیے اسی سال ۱۷۹۹ء میں سیال کی ایک چھوٹی سی بستی میں حضرت شمس العارفین رحمۃ اللہ علیہ کو پیدا فرمایا۔ حضرت کے آباؤ اجداد پشہتاپشت سے دنیاوی و جاہلیت اور علم دونوں میں بڑے ممتاز تھے۔ حضرت کے جد اعلیٰ حضرت شیر کرم علی رحمۃ اللہ علیہ سلسلہ قادریہ کے ایک شہباز لامکانی حضرت موسیٰ پاک شہید ملتانی قدس سرہ کے خلیفہ تھے۔ آپ نے پشاور میں ایک فاضل روزگار سے علم کی تکمیل کی۔ وہاں سے اپنے استاد کی معیت میں حج بیت اللہ شریف کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے پھر محبوب رب العالمین رحمۃ اللہ علیہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے آستانہ اقدس پر حاضر ہوئے۔ بارہ سال تک نعمتِ حضوری اور شرفِ عقبہ بوسی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ بارگاہِ نبوی سے بغداد جانے کا حکم ملا۔ کچھ عرصہ حضرت غوث اعظم محبوب سبحانی رضی اللہ عنہ



کے در کرم پر محو ریاضت رہے۔ حضرت غوث اعظم نے عالم خواب میں آپ کا ہاتھ حضرت موسیٰ پاک شہید کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہاں سے ملتان پہنچے۔ مرشد کامل پہلے ہی شدت سے انتظار فرما رہے تھے۔ فوراً سینہ سے لگا لیا۔ شرف بیعت بخشا حرقہ خلافت مرحمت فرمایا؛ عرصہ تک مجاہدہ و ریاضت میں مشغول رہے۔ اس وقت آپ کی عمر مبارک نوے سال تھی۔ پیر کامل نے وطن واپس جانے اور شادی کرنے کا حکم دیا۔ ایک عظیم المرتبت فرزند کی بشارت دی۔ آپ اپنے آبائی وطن قصبہ دھول پہنچے وہاں آپ کا کوئی پہچاننے والا موجود نہ تھا۔ عزیز واقارب فوت ہو چکے تھے۔ نئی نسل کو آپ کے متعلق خبر تک نہ تھی۔ چنانچہ وہاں سے رخصت ہو کر ایک جنگل میں قیام فرمایا اور وہاں سیال نامی بستی آباد کی جس کے مقدر میں اس علاقہ کی تاریخ کو نیا عنوان بخشا رقم تھا۔

چنانچہ اس فرخندہ روزگار کی نسل پاک سے اقلیم معرفت کا تاجدار میدانِ وجود عطا کا شہسوار کاروانِ عشق و مستی کا قافلہ سالار مطلع ہدایت کا نیر تاباں خضر گم کردہ راہاں بیجا نفس تاج الاولیاء فخر الاتقیاء خواجہ خواجگان محمد شمس الدین ادا م اللہ تعالیٰ برکاتہ سمعت فیوضہ کا تولد ہوا۔ حضرت کے والد بزرگوار کا اسم گرامی میاں محمد یار ابن میاں محمد شریف ابن میاں برخوردار ابن میاں تاج محمود بن میاں شیر کرم علی علیہم الرحمۃ والغفران ہے۔ حضرت والا گھر کا سلسلہ نسب پچاس واسطوں سے حضرت عباس علمدار شہید کربلا رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے

آپ کی والدہ ماجدہ کا اسم گرامی حضرت جنت بی بی تھا رحمۃ اللہ علیہا۔ آپ پوئلہ گاؤں کی تھیں جو سیال شریف سے ایک میل کے فاصلہ پر ہے۔

آپ قرآن کریم کی حافظہ تھیں۔ عبادت و ریاضت میں شب و روز مصروف رہیں۔ آپ نے ایک درس قرآن جاری کر رکھا تھا جس میں بچیاں قرآن کریم یاد کرتی تھیں۔ آپ خود تدریس کے فرائض انجام دیا کرتیں۔ آج بھی موضع پوہلہ میں عورتیں بکثرت حافظہ قرآن ہیں۔ یہ آپ ہی کا فیضان ہے جب اس نور ولایت کی امانت آپ کے بطن مبارک میں منتقل ہوئی تو ذکر و عبادت کے معمولات میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ شب و روز بکثرت درود شریف زبان پر جاری رہتا۔ سونے سے پہلے ہر شب اکتالیس بار سورۃ یسین تلاوت فرماتیں۔ تین ہمیشہ گان کے بعد حضرت میاں محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں وہ آفتاب طلوع ہوا جس نے ان گنت تیرہ بختوں کو بلند اقبال کیا۔ جس نے بے شمار غافل دلوں کو ذکر الہی کی لذت سے بہرہ ور کیا۔ جس کے یمن و برکت سے ہزاروں سالکان راہِ محبت کو منزل و صل تک سائی نصیب ہوئی جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے نور باطن سے نوازا تھا جب وہ اس خورد سال نو نہال کو دیکھتے تو دست بستہ سر پا ادب بن کر کھڑے ہو جاتے۔

آپ کے چچا حضرت میاں احمد یار صاحب کی شادمی لالی قوم کی ایک خاتون سے ہوئی تھی۔ ان محترمہ کے والد روشن ضمیر درویش تھے۔ ان کا اسم گرامی میاں نور نبی تھا۔ ایک دفعہ وہ اپنی بچی سے ملنے کے لیے سیال شریف آئے اس وقت حضرت کم سن تھے مگر آنکھوں میں گھٹنوں کے بل چل رہے تھے۔ آپ کی جبین سعادت پر جو نہی نگاہ پڑی ازراہ ادب کھڑے ہو گئے۔ کسی نے پوچھا: اس طفل صغیر کے سامنے ایسی تعظیم بجالانے کا کیا مطلب؟

اس درویش نے کہا کہ تم اس بچے کی شان کو پہنچاتے نہیں اس کی پیشانی پر

اسمِ عظیم لکھا ہے۔ جب یہ اپنے مرتبہ کمال پر فائز ہوگا تو اپنے روحانی فیوض و کمال سے ایک عالم کو سیراب کر دے گا۔ اور اس کے دروازے پر صد ہا کمال دست بستہ کھڑا ہونا باعثِ سعادت سمجھیں گے۔

میاں نور نبی صاحب نے اپنی بیٹی کو کہا، میں نے دعا مانگی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بھی عطا فرمائے۔ تم اپنی بچی کا رشتہ اس کو دینا تا کہ قیامت کے روز میں بھی اس مردِ کامل کے رشتہ داروں میں اٹھایا جاؤں۔

میاں محمد اکرم صاحب لغاری جو موضع دین پور کے بزرگ تھے، ان کا واقعہ آپ ابھی پڑھیں گے۔ آج دوسرے رسائل فلمی ایکٹریسوں کے ہیجان خیز تصاویر سے اپنے صفحات کو منور کرنا وقت کی اہم ضرورت سمجھتے ہیں۔ لوگ سیاسی لیڈروں ہر پارٹی دار صفت کاروں کے گن گاتے ہیں۔ ضیائے حرم ارباب و فا کے تذکروں سے قلب کی پاکیزگی نفس کی طہارت اور سیرت میں پختگی پیدا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ آج ان مردانِ پاک باز کی للہیت و اخلاص راہِ حق پر استقامت و ثبات کی یادوں کو تازہ کرنا از بس ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس اہم ترین کام کی توفیق دے آمین

حضرت میاں محمد یار علیہ الرحمۃ کا یہ اکلوتا فرزند ارجمند جمال ظاہری میں بھی فرید روزگار تھا، چمکتا ہوا چہرہ، زرگیں آنکھیں، خمدار ابرو، خوبصورت ناک، کشادہ پیشانی گلاب کی پتیوں کو شرمادینے والے پتلے پتلے ہونٹ اور اس پر جمال ربانی کا پرتو دل کو دیکھے بغیر قرار نہ تھا اور آنکھ کو یارانے دیدار نہ تھا۔ جب آپ کی عمر مبارک ساڑھے چار سال ہوئی تو تعلیم قرآن کریم کے لیے مکتب میں بٹھاتے گئے۔ سات سال کی عمر میں قرآن کریم حفظ کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد مزید علم حاصل کرنے کے لیے دوردراز

کا سفر اختیار کیا۔ علاقہ پنڈی گھیب کے ایک گاؤں میکی ڈھوک میں ایک مدرسہ تھا۔ اپنے ماموں میاں احمد دین صاحب کی معیت میں پہلے وہاں گئے۔ فارسی کی ابتدائی کتب وہاں پڑھیں لیکن استاذ صاحب کی زندگی نے وفات کی ان کے انتقال کے بعد مکھڑ شریف پہنچے۔ اس وقت وہاں حضرت مولانا محمد علی صاحب علیہ الرحمۃ نے علم کی شمع روشن کر رکھی تھی اور طالبان علم جوق در جوق اس چشمہ فیض سے سیراب ہو رہے تھے۔ آپ نے تیرہ سال تک اپنے استاد گرامی کی خدمت میں رہ کر کسب فیض کیا۔ اس عرصہ میں مکھڑ کے ایک تاجر میاں محمد امین جو مولانا موصوف کے بڑے عقیدت مند تھے۔ انھوں نے تجارتی مقاصد کے لیے کابل کے سفر کا قصد کیا۔ ان کی درخواست پر مولانا نے اپنے اس تلمیذ ارشد کو ان کی معیت میں کابل روانہ کیا۔ تاجر موصوف کو اپنے کاروباری مشاغل کی وجہ سے وہاں کافی عرصہ رکنا پڑا۔ حضرت نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کابل کے مایہ ناز اور تبحر عالم حضرت مولانا حافظ دراز صاحب کے درس سے استفادہ شروع کیا۔ ہدایہ شریف وہاں پڑھی۔ اور حدیث شریف کی سند بھی آپ سے حاصل کی۔ کابل کے قیام کے دوران میں جو بروایت حضرت ثالث غریب نواز رحمۃ اللہ حضرت خواجہ فخر الدین سیالوی مدظلہ نے یوں بیان فرمائی :

آپ حافظ صاحب کے درس میں اکتساب علم فرما رہے تھے بلکہ کے لیے رہائش کا خاطر خواہ بندوبست نہ تھا۔ ایک روز افغانستان کے حکم ان امیر شیر علی کی سواری شاہی تازک و احتشام کے ساتھ گذر رہی تھی۔ آپ نے آگے بڑھ کر اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور پر جلال لہجے میں فرمایا :

برائے اقامتِ ماجا دہی یا نہ دہی  
یعنی ہمارے رہنے کے لیے کوئی جگہ دو گے یا نہیں۔ امیر ایک درویش کی جرات  
اور بے ساختہ پن سے بڑا متاثر ہوا اور اپنے کاہلی لہجے میں کہا:

چرا نہ دہم بہ سرد چشم مے دہم  
کیوں نہیں دوں گا سر آنکھوں پر دوں گا۔ حضرت کے استاد صاحب کی کوئی  
نرینہ اولاد نہ تھی صرف ایک صاحبزادی تھی اس نوجوان شاگرد میں صوری اور  
معنوی خوبیوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد دل میں طے کر لیا تھا کہ انھیں دامادی کا  
شرف بھی بخشیں گے۔ اور اپنی مسندِ ارشاد و تدریس کا وارث بھی بنائیں گے۔ اپنے  
اس عزم کا اظہار آپ سے بھی کر دیا۔ ہونہار شاگرد ادب سے بر ملا انکار نہ کر  
سکا لیکن آپ نے میاں محمد امین صاحب جن کے ہمراہ آپ کا بل آتے ہوتے  
تھے یہ ماجرا بیان کر دیا اور اپنی پریشانی کا اظہار بھی کیا۔ میاں محمد امین نے تسلی  
دی۔ چنانچہ کابل سے روانہ ہونے سے پہلے میاں صاحب استاد صاحب کی  
خدمت میں حاضر ہوئے اور اس مؤثر انداز میں حالات بیان کئے کہ انھوں نے  
بخوشی حضرت کو واپسی کی اجازت دے دی۔

جب میاں محمد امین اپنے مشاغل سے فارغ ہوئے تو حضرت ان کی معیت  
میں پھر اپنے مشفق استاد کی خدمت میں پہنچ کر تحصیل علم میں مصروف ہو گئے۔  
حضرت مولانا محمد علی اگرچہ علم و فضل میں بے نظیر اور زہد و ورع میں منفرد  
اور مرجعِ خلائق تھے لیکن دل ابھی کسی ایسے صاحب کمال کے لیے تڑپ رہا  
تھا جو ایک نگاہ میں گھائل کر دے اور اپنی توجہ باطنی سے حریم ذات کے

دروازے کھول دے۔ کئی بزرگوں کی شہرت سنی، گئے، دیکھا اور لوٹ آئے۔ دل کی تسکین کا سامان کہیں نظر نہ آیا۔ ایک روز کسی راہ نور نے حضرت پیر سچچان قبلہ عالمیان شاہ محمد سلیمان تونسوی قدس سرہ کا تذکرہ اس انداز سے کیا کہ سنتے ہی دل بے چین ہو گیا۔ اور تونسہ مقدسہ کا سفر اختیار کیا۔ اس سفر ہمایوں اثر میں اپنے اسی تلمیذ ارشد کو اپنے ہمراہ لیا۔ جب کشتی دائرہ دین پناہ کے مضافات میں پہنچی آپ اترے اور ملاحوں کو رخصت عطا فرمائی۔ وہاں ایک گدھا کرایہ پر لیا، اور قبلہ عالمیان شہنشاہ اقلیم ولایت حضرت شاہ محمد سلیمان رحمۃ اللہ علیہ کے در اقدس پر پہنچے۔ حضور نے پوچھا کہاں سے آئے ہو۔ عرض کی: مکھڑ سے۔ مزید استفسار فرمایا، مولوی صاحب بخیریت تھے۔ عرض کی وہ خاکسار میں ہی ہوں۔ حضور نے اٹھ کر گلے سے لگا لیا۔ اور بڑی عزت و تکریم کی رہائش کے لیے انہیں ایک الگ حجرہ مرحمت فرمایا۔ مولانا تو اپنی اقامت گاہ پر فرودکش ہو گئے، لیکن شمس معرفت حضرت پیر سچچان کو دیکھتے ہی ہزار جان اور ہزار دل سے فریفتہ ہو گئے اور اتنا یارائے صبر بھی نہ رہا کہ اپنے استاد محترم کا انتظار کریں۔ موقع ملتے ہی بارگاہ ناز میں حاضر ہوتے اور بیعت کے لیے گزارش کی مرشد کامل نے ازراہ غایت بندہ نوازی شرف بیعت سے سرفراز فرمایا، اور نماز مغرب کے بعد نفل اوابین اور حفظ الایمان اور ہر نماز کے بعد دس دس مرتبہ درود پاک پڑھنے کا حکم دیا اور فرمایا سر دست تمہارے لئے اتنا وظیفہ کافی ہے جب تحصیل علم سے فراغت پا کر آؤ گے۔ اس وقت مزید کرم فرمایا جائے گا۔ اس سعادت ازلی سے بہرہ اندوز ہو کر اپنے استاد محترم کے پاس حاضر ہوتے

اور آرام فرمایا۔

مولانا نے چند روز توقف کے بعد بیعت کے لیے عرض کی حضور نے فرمایا :  
 آپ بہرہ و جہ افضل و اکمل ہیں۔ آپ کا علم و فضل مشہور عالم ہے۔ آپ کو اس فقیر سے  
 بیعت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ حضرت مولانا نے بعد ادب و نیاز عرض کی۔  
 قبلہ میں نے علم اس لیے تو نہیں پڑھا تھا کہ یہ میری محرومی کا باعث ہو۔ اور میں اس  
 نعمت سرمدی سے بے بہرہ رہوں۔ میں نے تو علم ہدایت پذیرمی کے لیے پڑھا،  
 اس لیے حضور اس خاکسار پر نظر کرم فرمائیں اور مجھے اپنی غلامی کی عزت سے محروم  
 نہ رکھیں۔ علم و فضل کے باوجود مولانا کی اس ادائے نیاز مندی کو حضور نے بہت  
 پسند فرمایا۔ اور کچھ اور اد پڑھنے کی تلقین فرمائی۔ ان وظائف کے پڑھنے سے مولانا  
 کے دل کی پہلی صفائی بھی جاتی رہی۔ ذوق و شوق کی جو چنگاری سلگ رہی تھی وہ  
 پھر سرد ہو گئی۔ آپ اس صورت حال سے بڑے غمزدہ ہوتے اور اپنی کیفیت عرض  
 کی۔ حضرت پیر سچپان نے اپنی زبان میں فرمایا کہ (بابا ایک لڈکتے بیا آوے)  
 یعنی ایک رخصت ہو تو دوسرا آوے آپ کے پہلے واردات رخصت ہوں گے  
 تب نئی کیفیات کا ورود ہوگا۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد مولانا کے دل میں درد و سوز اور  
 ذوق و شوق کی وہ کیفیت پیدا ہو گئی جس کا بیان زبانِ قلم سے ممکن نہیں۔

مولانا نے چھ ماہ تک شہباز لاکھانی کے آستانہ عالیہ پر قیام کیا۔ نعمت دیدار  
 توجہ باطنی اور کرہائے بے پایاں سے محفوظ ہوتے رہے۔ چھ ماہ بعد حضور نے  
 آپ کو طلب فرمایا بیعت بھی کیا۔ اور نعمت باطنی سے مالا مال کر کے خرقہ خلافت  
 بھی مرحمت فرمایا اور واپس کھڈ جانے کی اجازت دی۔ مولانا ہمراہی سر و گلبن صورت

مراجعت فرمائے مکھڑ تشریف ہوتے۔

حضرت شمس العارفین کو طالب علمی کے زمانہ میں بھی جس صاحب کمال نے دیکھا حیرت زدہ ہو کر رہ گیا۔ کبھی کبھی آپ مکھڑ سے اپنے والدین کی ملاقات کے لیے تشریف لایا کرتے تو دین پور کے قصبہ سے گذر ہوتا۔ وہاں ایک باکمال بزرگ میاں محمد اکرم صاحب رہا کرتے تھے جب اس محبتہ خصال نوجوان کو دیکھتے تو تعظیماً کھڑے ہو جاتے اور رخصت کرنے کے لیے کافی دور تک دین پور سے باہر آتے آپ کے کسی خادم نے اس تکریم پر حیرت کا اظہار کیا۔ اور کہا کہ شاید آپ اس نوجوان طالب علم کی اس لیے عزت کرتے ہیں کہ یہ میاں شیر کرم علی صاحب کی اولاد میں سے ہے۔ میاں صاحب نے فرمایا کہ تم درج ولایت کے اس گوہر تاباں کی قدر نہیں پہچانتے ایک دن آئے گا جب یہ نوجوان اقلیم فقر کا فرمانروا ہوگا۔ اس کی عظمت کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بجے گا۔ بڑے بڑے ارباب کمال یہاں حاضر ہو کر اپنی منزل مراد کو پائیں گے۔ میاں کرم علی صاحب جیسے بزرگ اور میرے جیسے لقمہ خوار ہزاروں ہزار اس کے آستان پر دربان ہوں گئے

استاد محترم نے نجابت و شرافت اور سعادت ازلی کے آثار اپنے اس فرشتہ سیرت شاگرد میں ملاحظہ فرمائے تھے۔ ان کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ انھوں نے خیال فرمایا کہ اپنے شاگرد رشید کو جانشین بنائیں گے تاکہ ان کی وفات کے بعد اس کے دم قدم کی برکت سے یہ سلسلہ فیض جاری و ساری رہے۔ اس چیز کا علم جب آپ کے والدین کو ہوا تو وہ ہجر و فراق کا تصور کر کے ٹرپ اٹھے۔ تو انسہ تشریف حاضر ہو کر حضرت شاہ سلیمان قدس سرہ کی خدمت میں اپنا ماجرا عرض کیا۔ مجھے جیساں



نے مولانا کو تحریر فرمایا کہ آپ نے اس فقیر کو اسیر کر رکھا ہے اس کو اپنے باپ کے ساتھ روانہ کرو۔ لوگوں کے فرزندوں کو قید نہیں کر لیا کرتے۔ نیز شمس العارفین کو حکم نامہ تحریر فرمایا کہ وہ اپنے والد کے ساتھ جائیں اور سنت نکاح ادا کریں۔

حسب فرمان مرشد اپنے گھر واپس تشریف لاتے اور حسب ہدایت اوراد و اذکار پوری پابندی سے انجام دیتے رہے۔ فرصت کے وقت تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ سال میں کئی کئی بار پیادہ منزل جانا کی زیارت کرنے کے لیے آتے اور کم سے کم چالیس روز قیام فرماتے۔ جب بتفاصلاً عمر ظاہری قوتوں میں اضمحلال آشکارا ہوا۔ تو پھر بامرجبوری سوار ہو کر تونسہ شریف حاضر ہوئے۔

اپنے مرشد کی خدمت اور غلامی کو سرچشمہ سعادات و برکات یقین کرتے۔

چودہ مرتبہ حضرت پیر بیچان کی معیت میں تونسہ مفت در سے مہار سدا بہار کا سفر کیا اس شان سے کہ حضور ایک تیز گھوڑی پر سوار ہوتے۔ یہ پیکر صدق و وفا اپنے مرشد کا قرآن کریم مع رحل بغل میں لیے بادۂ محبت سے سرشار ہو کر حضرت کی گھوڑی کے آگے آگے دوڑتے۔ لوگ اس حسین در عنایوان کے جسم نازک اور اس پر یہ مشقت، جفاکشی، پھر شوق و مستی کا عالم اور ہمت کی بلندی کا مشاہدہ کر کے دنگ رہ جاتے۔ دیکھنے والا ایک نظر سے پہچان جاتا، کہ یہ کس منزل کا مسافر ہے۔ اور اس کی منور آنکھیں کس کے در و محبت کی غازی کرتی ہیں۔

تونسہ شریف سے مہار شریف ایک سو کو س یعنی ایک سو پچاس میل کی مسافت ہے۔ اس زمانہ میں تقریباً سارا علاقہ جنگل بیابان یا چٹیل ریگستان تھا۔ پانی نایاب، آبادیاں خال خال، سڑکیں اور شاہراہیں مہقودہ۔ ایک دفعہ حضرت

پیر سٹپان قدس سرہ دیار محبوب کی طرف روانہ ہوئے گرمی کا موسم تھا۔ نوجوان سیال بڑے ذوق و شوق سے وجد کناں اپنے مرشد کی گھوڑی کے آگے آگے دوڑتے جا رہے تھے۔ آپ برہنہ پاتھے۔ ریشم سے نرم و نازک پاؤں کے تلوں میں کانٹے چبھتے آبلے بنتے رہے اور دھوپ قیامت ڈھا رہی تھی، زمین تپ رہی تھی۔ اس کے باوجود اس بلند اقبال اور اولوالعزم نوجوان کے ذوق و شوق میں ذرا فرق نہیں آ رہا تھا۔ اچانک مرشد کامل نے آپ کو اس حالت میں دیکھا تو کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ اپنی پاپوش مبارک اتار کر آپ کو دہی کہ انھیں پہن لو تاکہ گرم ریت، راہ میں کھڑے ہونے کانٹے اور سنگریزے نہ چھبیں۔ آپ نے اس تحفہ کو بصد شکر یہ قبول کیا۔ اور چوم لیا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد پھر حضرت پیر سٹپان نے آپ کو حسب سابق ننگے پاؤں دیکھا اور پوچھا: جوتے کہاں ہیں۔ عرض کیا، جوان کا صحیح مقام تھا۔ میں نے انھیں وہاں سجایا ہے۔ حضرت اس جذبہ نیاز مندی پر از حد مسرور ہوئے۔ اپنی گھوڑی سے نیچے اترے اور اپنے جوان بخت مرید کو اپنے سینے سے لگایا اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ اسرار و معارف کے کتنے خزینے بخش دیئے۔

حضرت پیر سیال فرمایا کرتے کہ میں نے اپنے مرشد کی خدمت میں چودہ سال کا طویل عرصہ اس انتظار میں گزارا کہ کوئی رحمت کی گھڑی آئے اور لطف خروانہ ابر کرم بن کر برسے اتنے عرصے میں مجھے دو بار یہ خصوصی لمحے نصیب ہوئے اس وقت آپ ایک اسی واقعہ کا ذکر کرتے اور دوسرا زیارت خضر کا واقعہ جس کا بیان ابھی آ رہا ہے۔

پر سچ تو یہ ہے کہ جب تک اپنے مرشد کے ساتھ اتنی والہانہ عقیدت نہ ہو۔

افادہ اور استفادہ کا دروازہ نہیں کھلتا۔ طالب کو گوہر مقصود ہاتھ نہیں آتا۔ اپنے شیخ سے کامل درجہ کی محبت نے باطن کو تو ہم رنگ کر ہی دیا تھا۔ ظاہری شکل و صورت میں بھی ایسی مماثلت پیدا ہو گئی تھی کہ حضرت کو دیکھنے والا یہ سمجھتا تھا کہ اس نے حضرت خواجہ شاہ محمد سلیمان تونسوی کی زیارت کی ہے۔ آپ اپنی زندگی کے آخری حصہ میں جب تونسہ شریف حاضر ہوتے تو آستانہ عالیہ کے تالاب پر تشریف فرما تھے۔ جس نے دیکھا یہی سمجھا کہ خود حضرت پیر پٹھان تشریف فرما ہیں کسی خادم نے دوڑ کر حضرت خواجہ کریم تونسوی کی خدمت میں گزارش کی کہ قبلہ! میں اپنی آنکھوں سے حضرت پیر پٹھان کو تالاب پر بیٹھے دیکھ کر آیا ہوں۔ حضرت خواجہ کریم نے سن کر فرمایا۔ پتہ چلتا ہے کہ مولوی صاحب سیالوں والے آگئے ہیں۔

ایک دفعہ حضرت پیر پٹھان کے پوتے حضرت خواجہ خیر محمد صاحب سیال تشریف لاتے اور حضرت باوجود ضعف پیری اور نقاہت کے اپنے شیخ کے پوتے کی خدمت میں دن میں کئی بار حاضر ہوتے اور کافی دیر زانو شکستہ دست بستہ بیٹھے رہتے۔ اس اثناء میں حضرت صاحبزادہ صاحب نے ارشاد فرمایا کہ جب سے ہمارے جد امجد خواجہ محمد سلیمان صاحب کا انتقال ہوا ہے تب سے حضرت خواجہ سیالوی کی زیارت سے ہمارے دل کو اطمینان نصیب ہوتا ہے، کیونکہ ہمارے جد امجد اور خواجہ سیالوی کی صورت اور سیرت میں ایک بال کا فرق نہیں۔

بعض حضار مجلس نے یہ کلمات طیبات اعلیٰ حضرت سیالوی کی خدمت

میں عرض کئے، لیکن حضرت نے ازراہ کسبِ نفسی فرمایا مورچہ (چینیوٹی) کو سلیمان کے ساتھ  
کیا نسبت ہے؟

خاکِ دہلیز سلیمان پر یہ پیشانی ہے

چشمِ اس مور کی بر لطف سلیمانی ہے

میاں حفیظ ماہی صاحب ساکن سور کی شریف، حضرت مولانا سلطان محمود صاحب  
ساکن تاڑہ۔ دونوں حضرت پیر پٹھان کے جانشین مرید تھے۔ حضرت پیر پٹھان کے  
انتقال کے بعد ان کی دنیا تاریک ہو گئی۔ نہ رات کو آرام نہ دن کو قرار۔ ہجرِ محبوب  
میں ہمہ وقت رویا کرتے ایک رات حضرت پیر پٹھان نے میاں حفیظ ماہی صاحب  
کو خواب میں ارشاد فرمایا کہ تم روتے کیوں ہو۔ میں تو اب تمہارے نزدیک سیالوں  
میں رہتا ہوں۔ آپ بیدار ہوتے۔ اسی وقت بستر باندھا سر پر رکھا اور سیال شریف  
کی طرف چل پڑے۔ راستہ میں ہی اپنے پیر بھائی مولانا سلطان محمود صاحب کے  
پاس سے گزرے دیکھا وہ بھی بستر باندھے بیٹھے ہیں اور آمادہ سفر ہیں۔ آپ نے  
پوچھا حضرت کہاں کی تیاری ہے۔ فرمایا: رات کو میرا دل از حد سوگوار تھا۔ روتے  
روتے آنکھ لگ گئی۔ حضرت پیر پٹھان نے شرفِ زیارت بخشا اور فرمایا: مولوی  
صاحب آپ اتنا کیوں روتے ہیں۔ میں تو اب تمہارے بالکل قریب سیالوں  
میں آ گیا ہوں بعینہ ہی خواب حفیظ ماہی صاحب دیکھ کر روانہ ہوئے تھے۔  
انہوں نے بتایا: بخدا مجھے بھی آج رات یہی حکم ملا ہے۔ چنانچہ دونوں حضرت  
پیر سیال کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ کے روتے تاباں کی زیارت سے  
ان کے غمزدہ دلوں کو قرار آ گیا اور پھر ساری عمر حضرت پیر سیال کی محبت کا

دم بھرتے رہے۔ حضرت نے ان کو خلافت عطا فرمائی۔

جب حضرت پیر سیال کی عمر مبارک چھتیس برس ہو گئی زہد و ریاضت سے سینہ گنجینہ نور بن گیا تو شاہ شاہان نواحہ محمد سلیمان قدس سرہ نے خرقہ خلافت ارزانی فرمایا اور ساتھ ہی ہدایت کی کہ میں تجھے گم کردہ راہوں کو راہ ہدایت پر لانے کے لیے آوارگان و شنت محبت کو منزل محبوب تک پہنچانے کے لیے بیعت اور خلافت کی اجازت دیتا ہوں۔ آپ نے بصد نیاز عرض کی کہ مخدوم! میں اس بارگراں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ مجھے اس سے معذور سمجھا جائے۔ حضرت نے فرمایا کہ ”تو کہاں ہے جب تو میں ہو گیا تو پھر تو کہاں رہا۔ تیرے ہر کام کا میں ذمہ دار ہوں۔ اپنے آپ سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے تجھے اس کا مجاز کرتا ہوں۔ چنانچہ ظاہری و باطنی العامات سے سرفراز فرما کر گھر رخصت کیا۔ اور روانگی کے وقت سخت تاکید کی کہ جس فیض کا تمہیں امین اور جس خزانہ سعادت کا تجھے قاسم مقرر کیا گیا ہے اس سے کوئی محروم واپس نہ جائے۔ جو بیعت کا خواہش مند ہو کر آئے اس کی دستگیری ضرور کی جائے۔“

جب دوبارہ اپنے مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دریافت فرمایا کہ کیا کسی کو بیعت کیا ہے۔ عرض کی صرف میرے والدین نے میری بیعت کی ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی بیعت نہیں ہوا۔ حضرت پیر پٹھان نے جلال میں آکر فرمایا کہ میں نے تو تجھے شاہباز بنایا ہے۔ سارا عالم تیرا صید زبوں ہے۔ اپنی ہمت خدا داد کو مخلوق خدا کی رشد و ہدایت میں صرف کر۔ ایک دفعہ حضرت پیر پٹھان تشریف فرما تھے۔ مشتاقان دید کا ہجوم تھا۔ اس اشارہ میں ایک نورانی پیکر بزرگ حاضر ہوتے،

اور کچھ دیر جو گفتگو ہو کر رخصت ہو گئے۔ جب وہ تھوڑا سا دُور گئے تو حضرت نے حاضرین مجلس کو کہا کہ جس شخص کے دل میں حضرت کی زیارت کا شوق ہو، وہ جائے اور زیارت کرے یہی حضرت تھے۔ جو یہاں سے اٹھ کر گئے ہیں، لوگ دیوانہ وار حضرت کی زیارت کرنے کے لیے دوڑ پڑے لیکن حضرت پیر سیال وہیں بیٹھے رہے۔ حضور نے فرمایا: مولوی صاحب! کیا حضرت کی زیارت کرنے کا اشتیاق نہیں عرض کی میں تو اس کی زیارت کروں گا، جس کی زیارت کے لیے خضر آتا ہے۔ حضرت پیر سیال حضور کی اس سعادت مندی اور خلوص پر بڑے خوش ہوئے اور دعا فرمائی: "اللہ سائیں میرے سیال نول رنگ لائیں"۔ اے اللہ تعالیٰ! میرے اس مرید باصفا کو ابدی عزت و سعادت سے سرفراز فرما۔ اس دُعا کا یہ اثر ہوا کہ شرق و غرب سے لوگ کسب فیض کے لیے پروانہ وار سیال شریف آنے لگے۔ آپ کو اپنے شیخ کا اتنا احترام ملحوظ تھا کہ تونسہ شریف کی حدود میں قضا حاجت نہیں کی تین میل دور تشریف لے جاتے۔

ایک دفعہ آپ سیال شریف سے تونسہ مقدرہ زیارت شیخ کے لیے جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک جنگل سے گذر ہوا۔ وہاں ایک نورانی شکل بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے فرمایا: درود کبریت احرر پڑھا کرو۔ آپ نے جواب دیا کہ میرے پیر کا فرمان کافی ہے۔ تونسہ شریف حاضر ہوتے تو مرشد کریم نے فرمایا کہ راستہ میں تمہیں ایک آدمی ملا تھا۔ اس نے جو وظیفہ بتایا ہے وہ پڑھا کرو وہ حضرت پیران پیر غوث الاعظم تھے۔ یہ درود پاک (کبریت احرر) اس سے پہلے طریقہ چشتیہ کے اوراد میں شامل نہ تھا۔ حضرت پیر سیال کے ذریعہ یہ نعمت عظمیٰ چشتیہ سلسلہ کو

نسیب ہوتی۔

اعلیٰ حضرت سیالوی پھر اس کی تلاوت پر مدامت فرمایا کرتے اُن والا مژبت نے معہودہ طریقہ کے مطابق اس کی زکوٰۃ بھی دی اس کے اختتام پر بارگاہ رسالت سے آپ پر جو خصوصی کرم ہوا اس کے ذکر سے قارئین ”ضیائے حرم“ کو محروم رکھنا بہت بڑی زیادتی ہے۔

میری خصوصی درخواست پر شیخ الاسلام حضرت خواجہ محمد قمر الدین سجادہ نشین سیال شریف نے یہ واقعہ اپنی زبان مبارک سے یوں بیان کیا۔

مجھے مولانا محمد امین صاحب چکوڑوی نے بتایا کہ حضرت مولانا معظم الدین صاحب مردلوی کبریت احمر کی زکوٰۃ کے ایام میں خدمت عالی میں حاضر رہا کرتے۔ اور ہر طرح کی خدمات بجالاتے۔ انہوں نے اپنا چشم دید واقعہ یوں بیان کیا کہ اعلیٰ حضرت نے سیال شریف سے باہر مغرب کی طرف ایک جگہ کو کبریت احمر شریف کی زکوٰۃ کے لیے مقرر فرمایا؛ میری ڈیوٹی یہ تھی کہ میں کسی کو اس خلوت میں داخل نہ ہونے دوں چنانچہ جس روز زکوٰۃ کا اختتام تھا۔ چاشت کا وقت تھا آپ تلاوت میں مصروف تھے میں کافی پیچھے ہٹ کر بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک ایک اندھیرا سا ہوا جیسے صبح صادق کا وقت ہوا اسی اثناء میں چند گھوڑ سوار آسماں کی طرف سے اترے۔ حضرت نے آگے بڑھ کر ایک شاہسوار کی قدم بوسی کی یہ حضور نور مجسم نور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات تھی۔ حضور کے دست مبارک میں ایک دبتا تھی جو آپ کے سر پر باندھی گئی اس عزت سے مشرف کر نیکی بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم روپوش ہو گئے۔ میں نے حاضر خدمت ہو کر اس عزت افزائی پر مبارک باد عرض کی۔ اعلیٰ حضرت نے دریافت فرمایا کہ آپ نے بھی زیارت کی ہے۔

میں نے عرض کیا: آپ کے صدقے مجھے بھی یہ عزت نصیب ہوئی ہے حضرت نے مجھے تاکید کی کہ میں اس واقعہ کا کسی کے سامنے ذکر نہ کروں۔

جب تک حضرت پیر سیال اس جہانِ فانی میں جلوہ افروز ہے مرید صادق نے اس راز کو افشا نہیں کیا۔ لیکن اُن جناب کے وصال کے بعد آپ نے مناسب نہ سمجھا کہ اپنے مرشد کے اس کمال کو مخفی رکھیں اس لیے آپ نے احباب سے اس کا تذکرہ فرمایا۔

حضرت کا انداز تبلیغ و ارشاد بالکل زلال تھا۔ اسوۂ نبوت کا کامل نمونہ مناظرہ مجادلہ بحث و تکرار کا تو وہاں گذر ہی نہ تھا جو بات فرماتے محبت و پیار کے رنگ میں رنگی ہوتی اور بڑے سے بڑا جھگڑالو مد مقابل بھی خلوص کی مہک سے از خود رفتہ ہو کر سر نیاز قدموں میں رکھ دیتا بڑے بڑے علماء و فضلا مناظرہ کرنے کے لیے حاضر ہوتے لیکن ناوک نگاہ کی تاب نہ لا کر ہمیشہ کے لیے غلام بے دام بن کر رہ گئے۔ بے شمار ایمان افروز واقعات سے ایک دور روح پرور باتیں آپ بھی سن لیجئے تحصیل خوشاب میں انڈیا ایک مشہور قصبہ ہے۔ قاضی سلطان محمود صاحب کا زمانہ تھا۔ آپ کے علم و فضل کی شہرت دور دراز علاقوں میں پہنچ چکی تھی آپ کے تبحر علمی کے باعث علماء عصر آپ کو استاد کل کہا کرتے ان کے فضل و کمال کی بلند می کا اندازہ لگانے کے لیے صرف یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ حضرت قبلہ سید مہر علی شاہ صاحب آپ کے شاگرد تھے۔ حضرت کئی سال تک انکے میں قیام پذیر رہے۔ اور آپ کے چشمہ علوم و معارف سے سیراب ہوتے رہے۔

قاضی صاحب مذکور کو پتہ چلا کہ ان ہی کے ضلع شاہ پور میں سیال کے مقام



پر ایک فقیر ظاہر ہوا ہے۔ جو سماع سنتا ہے اور لوگ جوق در جوق اس کے مرید بنتے جا رہے ہیں۔ قاضی صاحب کی تحقیق کے مطابق سماع شریعت میں ناجائز تھا۔ ان کی ایمانی غیرت یہ گوارا نہ کر سکی کہ ان کے علاقہ میں خلاف شریعت فعل کو اتنا فروغ نصیب ہو۔ پنانچہ ایک گدھے پر اپنی کتابوں کے انبار لادے اور مناظرہ کرنے کے ارادہ سے سیال شریف روانہ ہوتے وہاں اپنے معتقدین اور سازو سامان کے ساتھ ایسے وقت پہنچے جب حضرت شمس العارفین اپنی مجلس آراستہ کئے ہوئے معرفت کے موتی لٹا رہے تھے۔ قاضی صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ آداب مجلس کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کہنے لگے کہ میں نے سنا ہے کہ آپ شریعت کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور ایسے کام کرتے ہیں جو شرعاً ممنوع ہیں۔ حضرت نے قاضی صاحب کی بات سن کر بڑے تحمل سے فرمایا: قاضی صاحب! میری گردن بلکہ میری سات پشتوں کی گردن شریعت کے سامنے جھکی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے خلاف شریعت کام کرنے سے بچائے۔ یہ جواب سننے کے بعد قاضی صاحب تھوڑی دیر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر وضو کرنے کے لیے شرقی کنواں پر تشریف لے گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد حضرت نے قوالوں کو اشارہ کیا تو انھوں نے پنجابی کے ان بولوں سے محفل سماع کا آغاز کیا۔

جھنگ کنوں دل تنگ پیو سے بچھاں ہزارے دیاں داٹاں

میرے ماہی دیاں مٹھیاں باٹاں جیویں کھنڈ شکر نباتاں

قاضی صاحب سماع کی آواز سن کر غصتے سے دوڑے ہوتے آئے۔ بار بار کہہ رہے

تھے: پھر بھی آپ باز نہ آئے۔ پھر بھی آپ باز نہ آئے۔

جب قاضی صاحب قریب پہنچے تو حضرت نے ایک بازنگاہ بھر کر دیکھا ان پر  
وجد کی کیفیت طاری ہو گئی اور غش کھا کر گرے ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔  
اور قوال برابر ان بولوں کو دہرا دہرا کر قاضی صاحب کی آتش شوق کو بھڑکا رہے تھے۔  
قاضی صاحب بہت بڑی دستار باندھا کرتے تھے جو ان کے علم و فضل کی  
گواہی دیتی تھی۔ اس مستی و شوق میں اپنی دستار سر سے اتاری اور قوالوں کو جا کر  
دی۔ اس محفل پر کیف و مستی کا جو رنگ چڑھا ہو گا۔ اس کی ماہیت کیونکر بیان کی  
جاسکتی ہے۔ قوال جب اس بول کا تکرار کرتے تو آپ تڑپتے اور یہ نعرہ لگاتے۔

حق او یارو! حق او یارو!

حضرت ثانی غریب نواز اس محفل پاک میں حاضر تھے۔ جب قاضی صاحب  
نے اپنی دستار قوالوں کو جا کر نذر کی تو آپ چپکے سے اٹھ کر گھر تشریف لے گئے  
گھر میں سونے چاندی کے جتنے زیورات تھے سب اٹھا کر لاتے اور قوالوں  
کو پیش کر کے ان کے خوش قاضی صاحب کی دستار ان سے لے لی اور فرمایا:  
یہ عالم کی دستار ہے اور اسی کے سر پر زیب دیتی ہے۔ پھر قاضی صاحب کے  
سر پر وہ دستار باندھ دی۔ اعلیٰ حضرت غریب نواز اپنے فرزند دل بند کی اس  
اداشناسی پر بڑے مسرور ہوئے اور آپ کو دعاؤں سے نوازا۔

مردانِ خدا مناظرہ کے اکھاڑوں کو یوں اپنی چشم کرم سے عشق و محبت کے  
خیابان میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے واقعات شاذ و نادر ہی نہیں بلکہ ہر  
روز کا معمول تھا۔ خدنگ ناز کی زد میں جو آیا جانے نہیں پایا۔

حضرت کی خدمت اقدس میں ہر قسم کے لوگ آیا کرتے تھے۔ فقیر بھی امیر بھی

گدا بھی، نواب بھی، سالک بھی قلندر بھی، عالم بھی اور ان پڑھ بھی، اور اس کریم کے دروازے سے ہر شخص اپنی استعداد اور اپنے ظرف کے مطابق بہرہ ور ہوا کرتا۔ ہر شخص کی اصلاح اور تربیت کے لیے ایسا انداز اختیار فرماتے جو اس کی نفسیات کے عین مطابق ہوتا۔

ضلع جھنگ میں شاہ جیونہ ایک مشہور قصبہ ہے جہاں حضرت محبوب عالم جو شاہ جیونہ کے نام سے مشہور ہیں، کا مزار شریف ہے آپ سلسلہ چشتیہ صابریہ کے بزرگ تھے۔ آپ کی اولاد میں سے ایک مشہور ہستی سید محمد غوث شاہ صاحب گذرے ہیں۔ آپ کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ آپ علاقہ کے رئیس اعظم تھے۔ سات سو مربع زمین کے مالک تھے۔ پیرانہ سالی کا آغاز ہو چکا تھا۔ حضرت پیر سیال غریب نواز کی شہرت سن کر آستانہ عالیہ کی طرف روانہ ہوئے اور اپنی داستانِ غمِ مردِ خدا کی خدمت میں بصد ادب و نیاز پیش کی۔ حضرت نے ارشاد فرمایا شاہ جی غم نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دو بچے دے گا۔ ایک کا نام صالح شاہ اور دوسرے کا نام راجہ شاہ رکھنا۔ اس مژدہ جانفزا کو سن کر شاہ صاحب نے حضرت کے دستِ اقدس پر بیعت کی اللہ تعالیٰ نے مردِ کامل کی زبان سے نکلی ہوئی بات کو پورا فرمایا۔ اور پیرانہ سالی میں دو لڑکے عطا فرمائے جن کو صالح شاہ اور راجہ شاہ کے ناموں سے موسوم کیا گیا۔ دوسرے سادات کو جب پتہ چلا کہ سید محمد غوث شاہ صاحب نے ایک جٹ کی بیعت کی ہے تو ملامت کرنے لگے کہ تم اتنے رئیس اعظم اور ایک دلی کی اولاد اور پھر سید تمہیں اگر کسی کو مرشد بنا تھا تو کسی سید کو بنایا ہوتا۔ ایک جٹ کا مرید بننا قطعاً آپ کے شایانِ شان نہیں۔

سید محمد غوث شاہ صاحب نے ان ملامت کرنے والوں کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ میں نے جٹ کے کھیت کو سرسبز دیکھا ہے۔ تب ہی اس کا فیصلہ کیا ہے۔

ضلع جھنگ کے ایک دوسرے سید صاحب جو ٹھٹھہ محمد شاہ کے واحد مالک تھے۔ انھوں نے جب سنا کہ شاہ جیونہ صاحب کے سجادہ نشین نے سیال شریف بیعت کی ہے تو ان کے دل میں بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا شوق پیدا ہوا اور دل میں یہ طے کیا کہ اگر میری یہ تین شرطیں پوری ہوتیں تو بیعت کروں گا۔ ورنہ واپس چلا آؤں گا۔ ایک شرط یہ تھی کہ میری جب آپ سے ملاقات ہو تو مغرب کی طرف سے آرہے ہوں۔ دوسری شرط یہ تھی کہ بتائے بغیر آپ مجھے پہچان لیں اور تیسری شرط یہ تھی آپ مجھے کلاب کا پھول عطا کریں۔ دل میں یہ طے کرنے کے بعد سیال شریف پہنچے۔ حضرت کے بارے میں پوچھا تو بتایا کہ حضرت قبرستان شریف لے گئے ہیں۔ یہ قبرستان سیال شریف سے مغرب کی سمت میں واقع ہے۔ میں ادھر ہی چل پڑا راستہ میں دیکھا کہ اعلیٰ حضرت قبرستان سے شہر کی طرف آرہے ہیں۔ میں نے دل میں کہا کہ میری ایک شرط تو پوری ہو گئی لیکن دیکھتا ہوں کہ دوسری دو شرطیں کیسے پوری ہوتی ہیں۔ میں ادھر سے جا رہا تھا۔ حضرت قبرستان کے مغربی سمت سے شہر کی طرف آرہے تھے۔ راستہ میں ساہیوال کا ایک خادم حاضر ہوا اور ایک پھولوں سے بھرا ہوا لٹا حضرت کی خدمت میں پیش کیا۔ اتنے میں میں بھی قریب پہنچ گیا۔ حضرت نے پھولوں میں سے ایک پھول اٹھایا اور مجھے مخاطب کر کے فرمایا لو شاہ صاحب یہ پھول لے لو۔ میں اپنی تین شرطوں کو اس حیرت انگیز طریقہ پر پورا ہوتے دیکھ کر اس مرد خدا کی عظمت کا قائل ہو گیا۔ اور عرض

کی کہ حضرت مجھے ابھی بیعت فرمائیے پچنانچہ حضرت نے وہیں راستہ میں مجھے شرف بیعت سے سرفراز فرمایا۔

ملک شیرخان مرحوم، بندیاں کے رئیس اعظم تھے۔ اور حضرت کے نیازمند بھی روتسا کی طرح یہ بھی کتوں کے بہت شوقین تھے۔ اعلیٰ نسل کے کتے پال رکھے تھے اور سفر میں بھی انھیں اپنے ساتھ رکھا کرتے۔ ایک دفعہ اپنے مرشد کی زیارت کرنے سیال شریف حاضر ہوتے۔ کتوں کو حویلی میں باندھ دیا، شام کی آذان ہو گئی تھی اس لیے نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں چلے آئے۔ ایک پستہ کتا چکے چکے پیچھے آگیا انھیں اس کی خبر نہ ہوئی۔ کتا جو توں کی جگہ بیٹھ گیا۔ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرض باجماعت ادا کر کے مسجد سے اپنی عبادت گاہ کی طرف جانے لگے ایک خادم ہمراہ تھا جب باہر نکلے اور پستہ کتا بیٹھے ہوئے دیکھا۔ حضرت نے اپنے خادم کو حکم دیا۔ ملک شیرخان آیا ہے یہ کتا اسی کا معلوم ہوتا ہے۔ تم یہاں ٹھہرو اس کی حفاظت کرو۔ مبادا عبداللہ سبز پوش اسے مارے ملک کو اپنے کتے بڑے پیارے ہیں (عبداللہ ایک درویش تھا جو آستانہ عالیہ پر کسی کتے کو آنے نہیں دیتا تھا۔ جو کتا اس کے ہتھے چڑھ جاتا تو اس کی خوب پٹائی کرتا۔)

ملک شیرخان کہتا ہے کہ میں نے حضرت کا یہ ارشاد سنا تو مارے شرم کے پانی پانی ہو گیا۔ دوڑ کر آیا اور اس درویش سے کہا کہ تم حضرت کے ساتھ جاؤ۔ میں اب اس کی رکھوالی کر لوں گا۔ ملک صاحب لوگوں کو اپنے مرشد کا یہ واقعہ سناتے اور آب دیدہ ہو جاتے۔ حضرت نے مجھے ڈانٹا نہیں، ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا بلکہ میرے پاس خاطر کے لیے اس کی حفاظت کا اہتمام فرمایا۔ وہ کہا کرتے

اگر نبوت ختم نہ ہو گئی ہوتی تو آپ کو ضرور ملتی۔ اس کے بعد انھیں کتوں سے اس قدر نفرت ہو گئی کہ انھیں رکھنا ہی چھوڑ دیا۔

آپ کا وجود مسعود سراپا کرامت تھا۔ آپ کی شہادت و برخواست، گفتار و کردار میں دلوں کو لوٹ لینے والا بانک پن تھا۔ اس کے باوجود آپ انتہائی ضبط سے کام لیتے تھے۔ اور کرامات کے اظہار کو پسند نہیں فرمایا کرتے۔ اور اگر کسی درویش سے کرامات کا ظہور ہوتا تھا تو اسے سخت سرزنش فرماتے۔ اس ضمن میں سید عباس علی شاہ کا واقعہ بڑا بصیرت افروز ہے۔ حضرت خواجہ غلام فخر الدین سیالوی مدظلہ کی روایت سے ہدیہ ناظرین ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں ایک مرتبہ لاہور گیا مجھے کسی نے بتایا کہ بلال گنج میں ایک درویش حافظ شفیق احمد قادری رہتے ہیں ان کی زیارت کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس ساتھی کو لے کر میں حافظ صاحب کے مکان پر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا، دروازہ کھلا۔ ایک درویش نے بڑے تپاک سے ہمیں خوش آمدید کہا اور پہلے سے ایک آراستہ مسند پر مجھے بٹھایا۔ یہی حافظ شفیق احمد قادری تھے۔ انھوں نے کہا کہ میرے مرشد نے مجھے بتایا کہ آج تیرے پاس ایک مہمان آنے والا ہے۔ میں صبح سے آپ کے لیے چشم براہ ہوں۔ اور یہ مسند میں نے اسی ہدایت کے مطابق بچھا رکھی ہے۔ ابتدائی رسمی گفتگو کے بعد انھوں نے اپنا قصہ بیان کرنا شروع کیا۔ بتایا کہ میں موسیٰ زنی شریف میں بیعت تھا میرے مرشد کا انتقال ہو گیا۔ میں اس مراقبہ میں سرگردان تھا وہ حل نہیں ہو رہا تھا۔ دن بدن میری پریشانی میں اضافہ ہونے لگا۔ میں روزانہ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے آستانہ عالیہ پر حاضری دیا کرتا۔ کافی عرصہ کے بعد مجھے حضرت داتا صاحب

نے خواب میں فرمایا کہ جموں میں سید عباس علی شاہ کے پاس جاؤ وہ تمہاری یہ مشکل حل کرے گا۔ میں گوہر مراد کی تلاش میں جموں پہنچا۔ تلاش بسیار کے بعد میں نے سید عباس علی شاہ کو پایا، لیکن ان کی ہیبت کذائی دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی۔ میں نے سوچا کہ جس کے لیل و نہار ایک برہمن کی نوکری میں گزرتے ہیں وہ میری مشکل کیا خاک حل کرے گا۔ چنانچہ اظہار کیے بغیر میں واپس آ گیا۔ ایک بار پھر داتا صاحب نے خواب میں شرف دیدار بخشا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اسی جموں والے درویش کے ہاتھ میں دے دیا۔ اور ان کے پاس جانے کی تاکید فرمائی۔ میں پھر جموں پہنچا۔ جب گاڑی پلیٹ فارم پر رکی تو میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہی درویش پلیٹ فارم پر ٹہل رہا ہے۔ مجھے دیکھا اور جلدی سے آ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجذوبانہ انداز میں کہا کہ اب داتا صاحب نے بھی لوگوں کی پھلی کھانی شروع کر دی ہے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر اس برہمن کے مکان پر لے گئے جس کی گائیں چرایا کرتے۔ کافی دن انھوں نے مجھے اپنے پاس رکھا پھر ایک روز مجھے اپنے ساتھ جنگل میں لے گئے اور خلوت میں ایسی توجہ فرمائی کہ میرا عقدہ حل ہو گیا۔ چشم زدن میں وہ مرحلہ طے ہو گیا جس میں میں عرصہ سے سرگردان تھا۔ اس کے بعد انھوں نے مجھے اپنے بارے میں بتایا کہ میں سید ہوں اور پنڈی گھیب کے ایک نواحی گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ حضرت خواجہ شمس العارفین کا مرید ہوں۔ آپ کی خدمت میں ہی رہا کرتا تھا مجھ سے کرامات کا بکثرت ظہور ہونے لگا۔ تو حضرت نے بطور سزا تیس سال کے لیے مجھے یہاں گائیں چرانے بھیج دیا۔ اب میری سزا ختم ہونے والی ہے میں عنقریب گھر چلا جاؤں گا۔ تم فلاں ماہ کی فلاں تاریخ میرے گاؤں میں آنا۔ جب تم وہاں پہنچو گے

تو مسجد میں چند آدمی قتل کے لیے بیٹھے ہوں گے وہ تمہیں بتائیں گے کہ ایک شاہ صاحب جن کا نام عباس علی شاہ تھا ساری عمر باہر رہے چند روز ہوئے واپس آئے وہ انتقال کر گئے ہیں۔ آج تیسرا دن ہے شاہ صاحب نے مجھے کچھ روپے دیئے کہ وہاں جا کر کھانا پکا کر میری فاتحہ پڑھ کر تقسیم کر دینا۔

میں واپس آ گیا جب وہ مقررہ تاریخ آئی تو وصیت کے مطابق میں ان کے گاؤں پہنچا جس طرح انھوں نے بتایا تھا لوگ مسجد میں جمع تھے میرے دریافت کرنے پر انھوں نے بعینہ وہی بات بتائی جو شاہ صاحب نے بتائی تھی میں نے ایصالِ ثواب کے لیے کھانا پکایا اور تقسیم کیا۔ ان کی قبر پر حاضری دی۔ سلام عرض کیا اور واپس چلا آیا۔

اعلیٰ حضرت کی کرامات جو سورج کی کرنوں کی طرح از خود صادر ہوا کرتی تھیں بے حد بے حساب ہیں ان کے احاطہ کے لیے تو دفاتر بھی ناکافی ہیں۔ یہاں صرف دو واقعات عرض کرتا ہوں جن میں اپنے مریدین کی جان و مال کی حفاظت کے لیے آپ کے روحانی تصرفات کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔ یہ دو واقعات اتنے سچے اور متقی لوگوں سے مروی ہیں جن کے بارے میں غلط بیانی اور مبالغہ آرائی کا گمان تک بھی نہیں کیا جاسکتا۔

پہلے واقعہ کے راوی حضرت مولانا معظم الدین صاحب مروی قدس سرہ ہیں جن کو بارگاہِ عالی میں طویل حاضری کا امتیازی شرف حاصل ہے۔ یہاں واقعہ حضرت شیخ الاسلام سجادہ نشین سیال شریف کی زبان مبارک سے سن کر لکھ رہا ہوں۔ حضرت نے فرمایا کہ ایک روز اعلیٰ حضرت سیالوی قدس سرہ ظہر کی نماز کے لیے



وضو فرما رہے تھے اور خادم نیاز وضو کر رہا تھا۔ اچانک حضرت نے اس کے ہاتھ سے کوزہ جھپٹ کر کسی غیر مرئی چیز پر دے مارا۔ خادم پریشان ہو گیا کہ مجھ سے کون سی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ چنانچہ وہ افسردہ خاطر ہو کر مولانا مرد لوی کی خدمت میں حاضر ہوا جو قریب ہی ایک حجرہ میں مقیم تھے اور یہ ماجرا بیان کیا۔ مولانا نے اسے تسلی دی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ فقیر کا کوئی کام حکمت کے بغیر نہیں ہوا کرتا۔ تم اس کوزہ کی ٹھیکریاں سنبھال کر رکھ لو واپس آیا تو ٹھیکریاں بھی موجود نہ تھیں صرف چند ٹکڑے پڑے ہوتے تھے۔

جو اس نے سنبھال کر رکھ لیے۔ چند ماہ بعد ایک بخارا کے علاقہ کا آدمی وہاں پہنچا جو فارسی زبان بولتا تھا۔ جب سیال شریف پہنچا اور حضرت کی زیارت کی تو زور سے کہنے لگا: ”ہمیں بود، ہمیں بود“ یعنی یہی وہ شخص ہے یہی وہ شخص ہے۔ ہم نے اس سے ماجرا پوچھا تو اس نے بتایا کہ میں بارگاہِ الہی میں دعا مانگا کرتا تھا کہ الہ العالمین مجھے غوثِ زمان کی زیارت کی سعادت نصیب فرما۔ مجھے حضرت کی زیارت کرائی گئی اور سیالوں کا نام بھی بتایا گیا۔ میں اپنے علاقہ سے ہندوستان کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں ایک جنگل سے گزر رہا تھا کہ ایک شیر گرجتا ہوا مجھ پر حملہ آور ہوا میں نے پکارا: ”اے سیالوں کے غوث! میری مدد کریں، کیا دیکھتا ہوں کہ شیر کے ماتھے پر ایک کوزہ آکر لگا۔ اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا میں نے اس کوزے کی ٹھیکریاں اپنے پاس حفاظت سے رکھ لیں جب پشاور سے آگے آیا تو سیالوں کے بارے میں دریافت کیا۔ کسی نے مجھے سیالکوٹ کا پتہ دیا۔ میں وہاں پہنچا آپ کی گلی گلی کوچے کوچے تلاش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی وہاں سے مجھے کسی نے جنگِ سیال کا پتہ بتا دیا وہاں پہنچا لیکن جس کی تلاش تھی وہ نہ ملا میں حیران و پریشان تھا کہ اس شہر کا سراغ کیسے لگے کسی نے مجھے ساہیوال

جانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ اس طرح میں پوچھتا پوچھتا سیال حاضر ہوا۔ جب اس نے وہ ٹھیکریاں پیش کیں اور ہم نے ان کو جوڑا تو وہ ہو ہو حضرت کا کوزہ تھا حضرت چند جگہ سے کچھ ٹھیکریاں غائب تھیں ہمارے پاس جو تھیں وہ ہم نے وہاں جوڑیں مکمل کوزہ بن گیا۔

یہ واقعہ حضرت کی ظاہری زندگی کا ہے۔

دوسرا واقعہ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے اور حضرات اولیاء کرام کے تصرفات پر برہان قاطع ہے۔ اس کی تفصیل تو آپ ضیاء حرم کے شمس العارفین نمبر میں حضرت صاحبزادہ حافظ محمد عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کے قلم معجز رقم سے مطالعہ کریں گے۔ یہاں اس کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

ضلع مظفر گڑھ کے ایک گاؤں کھیرے میں ایک سادات کا خاندان ہے اس کے ایک بزرگ حضرت سیدالہ بخش شاہ صاحب بڑے عالم و فاضل تھے اور اعلیٰ حضرت سیالوی کے نیاز مند تھے۔ حضرت بھی ان پر خصوصی لطف و کرم فرمایا کرتے تھے۔ حضرت کے وصال کے بعد سیال شریف میں ان کی حاضری پہلے کم ہوتی بعد ازاں آمد و رفت کا سلسلہ بالکل منقطع ہو گیا۔ حضرت قبلہ ثانی صاحب کے عہد میں یہ اطلاعیں آنے لگیں کہ شاہ صاحب نے اپنے گاؤں میں الگ کعبہ بنا لیا ہے۔ اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ اور اسی کے گرد طواف کرتے ہیں۔ حضرت ثانی صاحب سنتے تو بصد افسوس فرماتے بچارے شاہ کو کوئی مغالطہ لگ گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرماتے ان کی یہی حالت رہی۔ حقیقت کہ حضرت ثانی صاحب نے رحلت فرمائی اور حضرت خواجہ ضیاء الحق والدین مسند آرائے

سیال شریف ہوتے۔

ایک دفعہ حضرت ثمانی صاحب کے عرس مبارک پر یہ غل برپا ہوا کہ کعبہ بنانے والے شاہ صاحب آتے ہیں۔ ہم (حضرت صاحبزادہ عبداللہ صاحب) بھی ان کے دیکھنے کے لیے گئے اور ان سے اس واقعہ کے بارے میں استفسار کیا۔ انھوں نے پہلے تو اظہارِ حال سے معذرت چاہی لیکن پھر ہمارے شدید اصرار پر یوں گویا ہوتے:

میرے حضرت کے وصال کے بعد کچھ عرصہ تو میں ان وظائف و اوراد کو پابندی سے ادا کرتا رہا جو میرے شیخ نے مجھے بتائے تھے۔ پھر مجھے غیب سے آواز سے آنے لگے کہ اے اللہ بخش تو میرا محبوب ہے میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تو خود کعبہ بنا اور سنتِ خلیلی کو زندہ کر۔ میں حیران تھا کہ مجھ سے پہلے بھی کئی اولیاء کرام کو خلعتِ محبوبیت عطا ہوئی لیکن کسی نے نیا کعبہ نہیں بنایا میں یہ جسارت کیسے کر سکتا ہوں۔ ایک سال تو میں اپنے موقف پر ڈٹا رہا لیکن اس کے بعد غضب ناک لہجہ میں دھمکیاں ملنے لگیں جن کی میں تاب نہ لاسکا اس طرح میں ایک کوٹھا بنا کر اس کے گرد طواف کرنے لگا گیا۔

کچھ مدت گزری تو غیبی آوازوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا مجھے کہا جاتا کہ سنتِ خلیلی تو تم نے ادا کر دی۔ اب سنتِ اسماعیلی ادا کرو۔ اور ذبح اللہ کے مقام پر فائز ہو جاؤ میں نے سوچا کہ یہ تو خود کشتی ہے جو حرام ہے۔ میں اس کا ارتکاب ہرگز نہیں کروں گا۔ کافی عرصہ میں اپنی ضد پراڑا رہا لیکن پھر تو جھپٹکیوں اور زرنشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا کہ تو کیسا محبوب ہے کہ اپنے مالکِ حقیقی کے حکم پر جاں بھی

نہیں دے سکتا۔ تجھ سے تو وہ ہندو زن بہتر ہے جو اپنے خاوند کی اترھی پر بیٹھ کر خاکستر ہو جاتی ہے۔ اگر تو ہمارے حکم کی تعمیل نہیں کرے گا تو کیا تو ہمیشہ کے لیے زندہ رہے گا۔ روز حشر کیا منہ لے کر ہمارے روبرو حاضر ہوگا۔ آتے روز کی ان جھڑکیوں نے مجھے بے بس کر دیا اور میں اپنا گلہ کاٹنے پر آمادہ ہو گیا۔ ایک روز تیز استرا لے کر اپنی گردن پر چلا دیا۔ فوراً میرے شیخ حضرت خواجہ شمس العارفین مجھم ظاہر تشریف لے آئے۔ میرے ہاتھ سے استرا اچھین کر دوڑ پھینک دیا فرمایا۔ خیر وار! اے اللہ بخش یہ رحمانی آواز نہیں شیطانی ہے۔ پھر آپ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔

یوں میں اپنے مرشد کامل کی دستگیری سے دوزخ کا ایندھن بننے سے بچ گیا۔ شاہ صاحب نے گردن پر استرے کا وہ زخم بھی دکھایا جو ابھی پوری طرح مندمل نہیں ہوا تھا وہ اڑھائی انچ کے برابر تھا۔ بے شک عارف رومی نے سچ کہا ہے :

دست پیر از غائبان کوتاہ نیست

حضور سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث طیبہ اس کی تصدیق کے لیے کافی ہے :

لا يزال العبد يتقرب الي بالنوافل حتى اکون سمعه الذی

یسمع بہ وبصره الذی بیصر بہا

ایک روز حضور پیر سیال، سیال شریف میں تشریف فرما تھے ہزاروں لوگ جمع تھے صبح کا وقت تھا۔ حضور اپنے حجرہ میں اپنے اور وظائف پڑھ رہے تھے۔

اور قوال الگ الگ جگہ درود سوز سے محبت بھرے اشعار سنا کر لوگوں کے ایمان کو تازہ کر رہے تھے۔ قوالوں کی آواز جب حضور نے سنی تو دل میں ان کے سننے کا شوق پیدا ہوا۔ وظائف سے فراغت پا کر حضور حجرہ سے نکل کر مجلس میں تشریف لے آئے۔ قوال حضرت کے عظمت و جلال کے باعث خاموش ہو گئے حضور نے فرمایا:

چو در خسرو آمدی در سبب نماز

حضور کے ایک خادم مولانا حفیظ ماہی صاحب نے جب یہ سنا تو عرض کی کہ عالیجاہ! ابھی حکم کی تعمیل کی جائے گی۔ چنانچہ قوالوں نے اپنے درود بھرے انداز سے یہ غزل پڑھنی شروع کی سے

شراب عشق کا نذر جام کر دند  
نصیب عاشق بد نام کر دند  
شانے زلف رخسار تو اسے ماہ  
ملائک در صبح و شام کر دند

قوال یہ غزل گارہے تھے۔ اور حضور انور پر وجد و کیف کی ایک عجیب کیفیت طاری تھی ضبط اور وقار کا یہ پہاڑ جو بڑے سے بڑے واردات کو برداشت کرنے کی ہمت رکھتا تھا۔ اس نے اپنے دلی جذبات کو کبھی ظاہر ہونے کی اجازت نہ دی تھی۔ آج فرط ذوق و شوق سے بے تاب ہو گیا۔ حضور کی چشم پر نم سے ایک رنگین آنسو ٹپکا اور دایاں زانو اٹھا اور دوسرے کو دبایا۔ اس وقت ساری فضا میں کیف و مستی کا ایک عجیب سماں تھا اور محبوب کی محبت میں مرغ بسمل کی طرح تڑپ

رہا تھا۔ بڑے بڑے خواص اپنے ضبط و ہوش سے محروم ہو چکے تھے معلوم نہیں اس  
مخفل میں محبت و عشق کی دولت کس فیاضی سے تقسیم ہوئی کہ ہر شخص اپنے دامن مراد  
کو محبت خداوندی اور عشق رسالت پناہی سے مالا مال پارہا تھا۔

اعلیٰ حضرت فقط کشور فقر و درویشی کے تاجدار ہی نہ تھے بلکہ ظاہری علوم و فنون  
میں آپ کا درجہ بہت بلند تھا۔ قرآن کریم کی آیات طیبات کی تفسیر نبی رحمت صلی اللہ  
تعالیٰ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کی تشریح اور اکابر علماء ربانیین کے اقوال کی توضیح  
جب آپ اپنی زبان فیض ترجمان سے کرتے تو بڑے بڑے علماء رنگ رہ جاتے۔  
ثنوی کے پہلے دو شعروں کی جو توضیح حضرت نے اپنی مخفل میں ایک روز فرمائی۔  
مولانا امام دین صاحب مرآة السالکین کی زبان سے سماعت فرمائیے۔

بشنواز نے چون حکایت می کنند

وز جدائی ہا شکایت می کنند

بشنو کا امر حق سبحانہ و تعالیٰ ہے۔ مولوی معنوی کی زبان حق ترجمان پر اور  
مامور اس کا طالب ذات باری تعالیٰ اور نے سے مراد عموماً انسان کامل اور خصوصاً  
ذات مقدس مولوی معنوی۔ اور جدائی سے مراد مجبوری اور دوری روح کی مرتبہ  
احدیت اور بے رنگی اور لائین، سے ہے اور شکایت سے مراد روح کا ابتلاء  
کثرت اور ناسوتی کے رنگ میں یعنی نزول و وجود مطلق کا بیج مراتب تنزلات کے  
طرف موجودات کا مقید ہے۔ جیسا قولہ تعالیٰ رَفَعُ الدَّرَجَاتِ ذٰی الْعَرْشِ  
میں تنزلات ششگانه کی طرف اشارہ ہے اور نائی نے سے مراد عشق کے سالک  
کا دل ہے۔ وہ گویا عین ذات حق تعالیٰ کی ہے۔ جب مفردات کے معنی معلوم ہوتے۔

پس حاصل مطلب یہ ہوا کہ مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ منصب میرا سخن سرائی مثنوی میں نے سے زیادہ نہیں ہے جو کچھ میں کہتا ہوں۔ عشق کے نے کی آواز ہے میری آواز نہیں۔

از وجود خود چونے گشتم تھی  
نیت از غیر خدایم آگہی  
بالب و ساز خویشم کرد جنت  
مے نیارم بر لب الا آن چه گفت  
از نیتاں تا مرا بس بدیدہ اند  
از نفیریم مرد و زن نالیدہ اند

نیتاں سے مراد ارواح کا ذات اجتماع صفات کے ساتھ پردہ غیب میں ہے۔ اس لیے کہ ارواح بلکہ تمام عالم اس مرتبہ میں ذرے میں مندرج تھے ، کاشجر فی البنات مثل درخت مع شاخ و برگ و گل و ثمر وغیرہ کے جو تخم میں پوشیدہ اور مندرج ہوتا ہے یعنی ذات اسباب کی قابلیت رکھتی تھی کہ جس صورت میں چاہے اپنے آپ کو ظاہر کرے اور نفیر سے مراد جدائی اعتباری جو اسماء و صفات کے ظہور میں پیش آتی اور مرد سے مراد اسماء و صفات فاعلی اور زن سے مراد اسماء و صفات انفعالی ہے۔ (ص ۵۴-۵۵۔ مرآة السالکین)

ہم دیکھتے ہیں کہ معقول و منقول کے یکتاے روزگار علماء آپ کے نیاز مندوں کی صف میں بعد ادب و احترام سر جھکائے بیٹھے ہیں اور حضرت کے علم و فضل سے اس قدر مرعوب ہیں کہ لب کشائی کی جرأت مفقود ہے۔ اپنے نورانی عہد میں جس



کثرت سے علماء نظام حضرت کے آستانہ قدسی پر حاضر ہو کر فیض یاب ہوئے اس پائے کے علماء اتنی بڑی تعداد میں ہیں اور کہیں نظر نہیں آتے۔ حضرت قبلہ سید پیر مہر علی شاہ صاحب جو بجا طور پر نابغہ تھے وہ آپ کے چشمہ فقر و درویشی سے بھی سیراب ہوئے اور اس کے ساتھ ساتھ آپ کے دسترخوان علم و فضل کے سامنے دم بخود نظر آتے ہیں۔ اپنے بے نظیر علمی کارناموں کو محض اپنے پیرو مرشد کا فیض اور روحانی تصرف سمجھتے ہیں۔ اور بار بار اس کا برملا اعتراف بھی کرتے ہیں۔ یہاں ہم مہر منیر سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔

”رجب ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء میں حضرت لاہور میں قادیانی معرکہ سے منظر و منصور ہو کر واپس آئے تو جناب حضرت ثانی صاحب سیالوی کا مبارک نامہ پہنچا اس کے جواب میں لکھا :

کہ یہ مبارکیں عالمگیر خطہ خاک پاک سیال شریف کو شایاں ہیں۔

ازرہ گزرے خاک سر کوئے شما بود

ہر نافہ کہ در دست نسیم سحر افناد

اپنے شیخ کریم حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ کی شان اور فیضان میں بے ساختہ یہ بیس اشعار وحدت وجود کے رنگ میں قلمبند فرمائے ہیں اور انھیں ظاہر کیا ہے کہ مجھ سے جو کچھ ہو سکا ہے وہ اسی شمس نورانی کے نور مطلق کی بدولت ہوا ہے۔ جو میرے اندر کار فرما تھا۔ حضرت نے سیف چشتیانی میں بھی ایک جگہ تحریر فرمایا ہے کہ اس وقت میں محسوس کر رہا ہوں کہ گویا میرے شیخ میرے پاس موجود ہیں اور اپنی توجہ سے مدعی قادیان کے جواب میں یہ دلائل میرے قلب میں

القافر ہے ہیں اس خط کے آخر میں آپ نے اپنے مرشد برحق کی شان میں ایک قصیدہ لکھا ہے جو مکمل کسی دوسرے مقام پر ملاحظہ فرمائیے۔ یہاں اس کے چند اشعار ذکر کئے جا رہے ہیں۔

شمس نورانی کہ نور مطلق است

درہاں آفاق نورش مطبق است

گم زادے نام یاکت دست را

کس ندیدے درجہاں این مست را

ہر دو عالم در ہواشس بانختہ

پائے از دیدہ برابشس ساختہ

سیماں سر و بستان خدا

شاہباز قدس، آن شمس العلی

حضرت کے سوانح نگاروں نے حضرت کے چند اشعار بھی اپنے تذکروں میں

نقل کئے ہیں۔ جن سے حضرت کے ذوق رفیع، قادر الکلامی اور جذبہ عشق و محبت

کی طغیانوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک دفعہ آپ کے استاد حضرت مولانا محمد علی

صاحب نے ایک غزل لکھ کر اپنے مرشد کی خدمت اقدس میں روانہ کی جس

کا پہلا مصرعہ یہ تھا

شہید تیراں ترکم کہ از ابرو کمال دارد

مولانا نے اپنے شاگرد رشید کو بھی فرمایا کہ تم بھی اس زمین میں غزل کہو آپ

فرماتے ہیں کہ اگرچہ میں نے پہلے کبھی شعر نہیں کہا تھا، لیکن استاد محترم کے حکم کی

تعمیل میں یہ غزل موزوں ہو گئی۔

مقیم کوئے آن شاہم کہ اعلیٰ آستان دارد  
ملوکش جملہ مفتون و ملائک پاسبان دارد  
مثال عشق با آن شہہ خوباں عبرانی  
چوں آن ز اے کے کو درست تیندہ ریشاں دارد  
چہ طاقت بندہ عاجز را کہ با مولا سخن راند  
وے از لطف و رحم او نظر بر فیض آن دارد

آپ سے پنجابی کے چند اشعار بھی منقول ہیں جو حضرت نے اپنے مرشد کامل کی وفات کے موقع پر فرمائے تھے۔

ت تا نگ ت سا دی دی سا نگ مینوں میری چانگ آسمانوں تے جاری اے  
برہوں تیر فراق دا چیر گیا، مارو پیر کلی پڑے دی کھاری اے  
بھکھ، مکھ ت سا ڈے دتے، دیکھنے دی خوش چین سو مینوں بھارتی اے  
شمس روگ لگاتن بھوگ میرے ملاں ہو رطبیب سجھارتی اے

اس مختصر مقالہ میں اتنی وسعت کہاں کہ فیض و عطا کے اس بحر بیکراں کے حالات کا احاطہ کر سکے۔ اس ناچیز کے پاس نہ وہ آنکھ جو جمال شمس الہدیٰ کو دیکھنے کی تاب رکھتی ہو۔ نہ وہ دل جو عالم محبت کی ان لطافتوں اور نزاکتوں کا آشنا ہو نہ اتنا علم کہ اس فیاض جہاں کے کارناموں کو تفصیلاً بیان کر سکے۔ اور نہ ہی وہ قلم جو نوک زبان پر ان اسرار و معارف کو لاسکے۔ دیکھنے والے اور پہچاننے والے حضرت پیر سیال کے فیض یافتگان میں سے کسی کو دیکھ لیں۔ خود ہی استاد کامل

کے کمال کا پتہ چل جائے گا۔ انیسویں صدی کے تاریک ماحول میں اس محبوب الہی نے جو شمعیں روشن کیں۔ ان ایام میں جب کہ خزاں کی چیرہ دستیاں انتہا کو پہنچ چکی تھیں۔ جس کی مسیحا نفسی نے خزاں زدہ گلشن کو آشنا سے بہا کر کیا۔ اس کی عظمت کا ذکر کیوں کر کیا جاسکتا ہے۔

حضرت سے فیض یافتگان کا شمار تو کہاں۔ حضرت نے جن طالبانِ حق کو اصل بحق کر کے خلافتِ نبوی ان کا شمار بھی ممکن نہیں۔ جلالپور، گولڑہ، خواجہ آباد، مرولہ، بھیرہ، لاہور، ڈیرہ غازی خاں میں چشتی خانوادوں کی جو خانقاہیں دیں کی عظیم تر خدمات انجام دے رہی ہیں۔ وہ کسی سے مخفی نہیں۔ یہ سب اسی مرشدِ کامل کی نگاہِ کرم کا فیض ہے جس کے چشمے یہاں بھی اور عرب و عجم میں برسے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس شمس الہدیٰ کی تابناک کرنوں سے اپنے تاریک دل منور کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

جس طرح آپ پڑھ چکے ہیں کہ اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی ولادت باسعادت ۱۲۱۴ھ ہجری میں ہوئی چھتیس سال کی عمر میں یعنی ۱۲۵۰ھ میں آپ کو اپنے شیخ طریقت نے خلافت عطا فرمائی۔ چنانچہ آپ نصف صدی تک مندرشد و ہدایت پر جلوہ افروز رہے۔ اپنی صوری اور معنوی رعنائیوں سے دلوں کو فریفتہ کرتے رہے اپنے روحانی تصرفات اور باطنی توجہات سے بندگانِ خدا کا ٹوٹا ہوا تعلق اپنے رب سے جوڑتے رہے۔ سینکڑوں کی تعداد میں آپ کے باکمال خلفاء ملک کے طول و عرض میں پھیل گئے اور بڑے سوز و گداز سے دعوتِ حق میں مشغول ہو گئے۔ افسردگی و غفلت نے جہاں ڈیرے جارکھے تھے وہاں ذکر و فکر کی محفلیں

ذہنوں کو جلا اور دلوں کو ضیاء بخشنے لگیں۔ ویران مسجدیں آباد ہو گئیں۔ گوشے گوشے سے اللہ اکبر کی دلتواز صدائیں اور حی علی الصلوٰۃ کی روح پرورد عوتیں فردوس گوش بننے لگیں۔ آپ کے خلفاء نے اپنے اپنے مقام پر خانقاہیں قائم کیں۔ ساتھ ہی قرآن و سنت کی تدریس و تعلیم کے لیے مدارس معروض وجود میں آگئے۔ ہر خانقاہ حال و حال کا ایسا حسین امتزاج پیش کرنے لگی کہ عقول اور قلوب دونوں سیراب ہونے لگے۔

آپ کے دستِ حق پرست پر جس نے بھی بیعت کی اس کا دل فسق و فجور کی آلائشوں سے متنفر ہو گیا۔ ذکر الہی کے بغیر اسے قرار ہی نہیں آتا تھا۔ نثر لیت کی پابندی اس خانوادہ کا امتیازی نشان ہے۔

پچاس سال یہ شمس منیر مطلع رشد و ہدایت پر نور افشانیوں کرتا رہا اور جس کا بھی بلا واسطہ یا بالواسطہ اس تاجدار فقر و معرفت کے ساتھ قلبی ربط قائم ہوا اس کی دنیا بدل گئی۔ اس کا بخت نختہ بیدار ہو گیا۔

## انتقال پر ملال

جب ۱۳۰ھ کا آغاز ہوا۔ محرم الحرام کی پندرہ تاریخ تھی۔ اعلیٰ حضرت نے اپنے ولی عہد اور فرزند ارجمند حضرت خواجہ محمد الدین صاحب (جو حضرت ثانی صاحب رحمۃ اللہ کے لقب سے معروف ہیں) کو اپنے خاص حجرہ میں بلا کر اپنے سامنے بٹھایا اور ارشاد فرمایا، اے فرزند! دنیا کے حالات ہر وقت بدلتے رہتے ہیں کبھی خوشحالی، کبھی تنگدستی، ہمارے دادا صاحب کئی گاؤں کے مالک تھے اور دولت و

ثروت کی فراوانی تھی۔ اس طرح والد ماجد بھی خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ جب میرا زمانہ آیا۔ میں نے تحصیل علوم کے لیے سفر اختیار کیا بعد ازاں خواجہ خواجگان محمد سلیمان تونسوی رضی اللہ عنہ سے بیعت کی۔ دن بدن معاشی حالت بگڑنے لگی یہاں تک کہ فاقہ کی نوبت آنے لگی اور کبھی کبھی تو سات سات دن فاقہ میں گذر جاتے، لیکن میں نے یہ راز کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اور خواجہ تونسوی کی برکت سے کسی چیز کی کمی نہیں، لیکن اس دنیا سے فانی کی کسی چیز کے ساتھ مجھے قطعاً کوئی الفت نہیں۔ البتہ دو چیزوں سے مجھے پیار ہے، کیونکہ یہی دونوں چیزیں پیرانِ عظام سے مجھے مرحمت ہوئی ہیں۔ اول محبت درویشاں، دوم اطاعت پیر و مرشد تم توکل تسلیم اور صبر و قناعت کو اپنا معمول بنانا۔ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے پیش آنا۔ درویشوں اور عالموں سے محبت رکھنا۔ صاحبزادہ صاحب (ثانی صاحب) نے حضور سے التماس کی کہ یا حضرت دولت ظاہری کی حاجت نہیں ہے۔ نعمت باطنی جو پیرانِ عظام نے آنحضرت کو عطا فرمائی ہے اس سے عنایت فرمائیے۔ حضور نے ارشاد فرمایا :  
 ”املاک ظاہری قبول کرو۔ املاک معنوی باطنی سے اللہ تعالیٰ تم کو مال مال فرمائے گا۔“  
 صاحبزادہ صاحب نے پھر گزارش کی میری تمنا ہے کہ حضور چالیس برس تک اور سلامت رہیں تاکہ اس چشمہ شہیریں سے پیاسے سیراب ہوتے رہیں۔ یہ سن کر حضرت خاموش ہو گئے۔ پھر فرمایا : اسے فرزند! ہم کو چالیس روز تک جینے کا بھی اعتبار نہیں، کیونکہ میں نے اپنے پروردگار سے یہ التجا کی ہے کہ میری عمر میرے پیر و مرشد خواجہ تونسوی کی عمر کے موافق ہو معلوم ہوتا ہے کہ میری عمر کا پیمانہ لبریز ہو چکا،

ماہ صفر میں میرے مرشد نے انتقال فرمایا تھا۔ شاید ہماری رحلت بھی اس ماہ صفر میں ہووے۔

جدائی کی یہ خبر حضور ثانی کے خرمین صبر و ضبط پر بجلی بن کر گری اور آپ نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ صاحبزادہ صاحب کی آہ وزاری اور بے چینی کو دیکھ کر اعلیٰ حضرت نے فرمایا، اے نور چشم! میں چاہتا تھا کہ اسرار یزدانی سے تم کو آگاہ کروں مگر تم تھوڑی سی بات سے بے خود ہو گئے ہو۔ دنیا کی زندگی کا اعتبار نہیں بکل نفس ذائقۃ الموت، کے مطابق ہر شخص نے موت کا شربت پینا ہے۔ پھر آپ نے دوسرے صاحبزادوں، جناب حافظ فضل الدین صاحب، جناب صاحبزادہ شعاع الدین صاحب کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ اگر مندوبات اور مستحبات تم سے ادا نہ ہو سکیں تو فرائض کو مت ترک کرنا، بلکہ تم پر لازم ہے کہ پیرانِ عظام کی متابعت اور حق تعالیٰ کی یاد میں مصروف رہو۔

ایک روز حضرت صاحبزادہ محمد دین صاحب کو فرمایا کہ آپ تونسہ شریف میں حضرت خواجہ کریم کی خدمت میں حاضر ہوں۔ مگر یاد رکھنا، جلدی واپس آنا، دیر مت لگانا۔ چنانچہ حسب ارشاد قبلہ صاحبزادہ صاحب تونسہ شریف روانہ ہوئے۔ ۱۸ ماہ صفر کو نماز تہجد سے فارغ ہونے کے بعد اعلیٰ حضرت قدس سرہ کو بخار کا عارضہ لاحق ہوا۔ حکما و اطباء نے بڑی کوشش کی، لیکن فائدہ نہ ہوا۔ صاحبزادہ صاحب ۲۱ ماہ صفر کو منگل کے دن تونسہ شریف کی حاضری سے واپس آئے حاضری خدمت ہو کر مزاج پرسی کی آستانہ عالیہ کے حالات سے آگاہ کیا۔ اور جو ادویہ آپ واپسی کے وقت لیبہ کے کسی حاذق طبیب سے لے آئے تھے، ان کا استعمال شروع ہوا

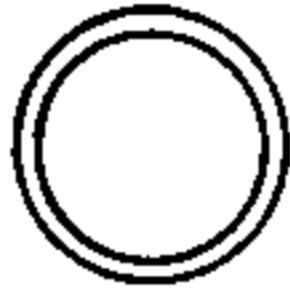
آخری عمر میں سماعت کم ہو گئی تھی۔ اس لیے لوگ اپنے حالات لکھ کر خدمت بابرکت میں پیش کیا کرتے تھے۔ حضرت صاحبزادہ فضل الدین صاحب نے وظائف کی اجازت طلب کی حضور نے ارشاد فرمایا اے فضل الدین! ہمارے تمام وظائف کی تم کو اجازت ہے۔ ۲۲ ماہ صفر حضرت خواجہ نے مولانا مروومی کو فرمایا کہ تم بھی کچھ لکھو۔ مولانا نے صاحبزادوں کی طرف سے ایک درخواست پیش کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ آنجناب کے آستانہ عالیہ سے سعادت دارین اور مطالب کو نبین کے حصول کے لیے بے شمار لوگ آتے ہیں۔ کسی صاحبزادہ صاحب پر نظر شفقت فرمائیے تاکہ خاندانِ حشمت کا یہ فیض ہمیشہ جاری رہے۔ حضور نے درخواست کا مطالعہ فرمایا لیکن خاموشی اختیار کی تھوڑی دیر کے بعد مولانا نے پھر درخواست پیش کی۔ اعلیٰ حضرت نے ملاحظہ فرما کر دعا کے لیے دست مبارک اٹھائے اور زبان مبارک سے بھی کچھ فرمایا جو سمجھانہ جاسکا۔ نقاہت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ صفر کی چوبیسویں رات تھی۔ حضور حاضرین سے بار بار دریافت فرماتے کہ فجر طلوع ہوئی ہے یا نہیں۔ پھر پوچھا: آج کونسا دن ہے۔ اور کیا تاریخ ہے؟ کسی نے عرض کیا: اے جانِ عالم! آج جمعہ کا دن ہے۔ اور ۲۲ ماہ صفر حضور نے دست مبارک میں تسبیح لے کر چند بار درود شریف پڑھا پھر ذکر پاک الفاس میں مشغول ہو گئے۔ حاضرین کی طرف محبت بھری اور الوداعی نگاہوں سے دیکھا اور قبلہ رو ہو گئے۔ اور آیات وصال آپ پر ظاہر ہوئیں۔ اس طرح شمس مطلع ہدایت و محبت نصف صدی تک محبت اور عشق کی دولت لٹانے کے بعد اپنے محبوب حقیقی سے جا ملا۔

انا لله وانا اليه راجعون۔

ہر سال ماہ صفر کی ۲۲، ۲۳، ۲۴ تاریخ کو آستانہ عالیہ سیال شریف پر عرس مبارک



منعقد ہوتا ہے۔ جس میں آج بھی ملک اور بیرون ملک سے بے شمار مخلوق فیضیاب ہونے کے لیے حاضر ہوتی ہے۔ اور حضرت کے آستانہ عالیہ کے موجودہ سجادہ نشین شیخ الاسلام و المسلمین علامہ حافظ محمد قمر الدین مدظلہ الاقدس کی ذات گرامی اپنے علمی کارناموں، دینی عظمت، سیاسی اور ملکی خدمات جلیلہ کے باعث فخر روزگار ہے۔ مولا کریم اس عظیم ہستی کو تا ابد سلامت باکرامت رکھے اور حضرت کے سارے خاندان اور صاحبزادگان والانتبار کو ان روحانی علمی، اخلاقی عظمتوں کا وارث کرے جو ان کے اسلاف کا حصہ تھیں۔ آمین!



سہ، ضیائے عرم کا شمس العارفین نمبر شائع ہونے کے موقع پر حضور خواجہ شیخ الاسلام رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ظاہری زندگی کے ساتھ موجود تھے۔

مَوْلَانَا الشَّاهُ

محمد شاکر خان بریلوی  
قدس اللہ سرہ العزیز







بوشمنس برسنیر پاک وہند کی ماضی قریب کی تاریخ سے واقفیت رکھتا ہے، اسے خوب معلوم ہے کہ یہ عرصہ کتنا پُر آشوب اور ہنگامہ ہاتے رستا خیر سے معمور تھا۔ انسان کی سیرت و کردار کی تشکیل میں اس کے عصری حالات جو فیصلہ کن اثر ڈالتے ہیں وہ اہل علم سے مخفی نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض لوگ اپنے عصر کے تقاضوں سے منفعل اور متاثر ہوتے ہیں، اور بعض لوگ خود ان پر اثر انداز ہوتے ہیں اس لیے کسی کی زندگی کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے زمانہ کے احوال سے صرف نظر قطعاً مستحسن نہیں۔ اس لیے اعلیٰ حضرت عظیم البرکت امام اہلسنت حضرت مولانا احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ کی ذات ستودہ صفات کو سمجھنے کے لیے آپ کے عہد کے مزاج کو سمجھنا اور ان تاریخی عوامل کا جائزہ لینا از حد اہم ہے جو اس وقت کار فرما تھے۔

ذرا چشم تصور کو دیکھتے اور دیکھتے کہ افق ہند پر ایک ہزار سال تک درخشاں رہنے کے بعد اب مسلمانوں کا آفتاب اقبال غروب ہوا چاہتا ہے۔ بارہ اور رنگ زیب کی اولاد اب شمشیر و سناں سے راہ و رسم توڑ چکی ہے، اور طاؤس و رباب بر

فریفتہ ہونے لگی ہے۔ جہاں جوانوں کا خون گرمانے کے لیے رجز پڑھے جاتے تھے وہاں اب عصمت فروش رقاصائیں اپنی پائیلوں کی جھنکار سے غیرت و حمیت کے جذبات کو لوریاں دے رہی ہیں۔ جہاں مائیں بچوں کو خالد و طارق کے قصے سنا کر پروان پڑھاتی تھیں، وہاں اب عشق و حسن کی بد مستیوں کی کہانیاں و جہ تسکین خاطر اور باعث گرمی محفل بن گئی ہیں۔ روضوں کی پاکیزگی، حوصلوں کی بلندی اور عزائم کی سنجگی کو عیش و عشرت کی دیمک نے چاٹ کر کھوکھلا کر دیا ہے، جن کے آباؤ اجداد کے نام سن کر اغیار کے دل لرز لرز جایا کرتے تھے۔ آج لال قلعہ کی مضبوط اور سنگین دیواریں اور گہری خندقیں بھی دشمنوں کی یلغار سے انھیں پناہ نہیں دے سکتیں بلکہ کے طول و عرض میں ہر طرف فتنہ و فساد کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ طوائف الملوک کا دور دورہ ہے۔ ایک مملکت سینکڑوں چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ چکی ہے۔ کہیں مرہٹوں کی بربریت نے کھرام مچا رکھا ہے اور کہیں سکھوں کے وحشیانہ مظالم سے قیامت برپا ہے۔ مغل اقتدار اس کماری اور درۃ خیبر سے سمٹ کر قلعہ معلیٰ میں محصور ہو گیا ہے۔

انگریز اڈرونی خلفشار سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان پر اپنی گرفت دل بدن مضبوط کرتے جا رہے ہیں۔ یکے بعد دیگرے ایک ایک صوبہ اور ایک ایک ریاست ان کے زیر نگیں ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ان المناک حالات میں اسلامی حمیت نے پھر جھر جھری لی۔ حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی کے نعرۂ جہاد سے سارا ہندوستان گونج اٹھا۔ فرنگی استعمار کا مقابلہ کرنے کے لیے علماء حق کفن بدوش، سرکف میدان عمل میں اتر آئے۔ ہندوستان کا ہر قابل ذکر شہر میدان کارزار بن گیا اور شمع آزادی کو

روشن رکھنے کے لیے مسلمانوں نے بے دریغ قربانیاں دیں، لیکن جاہ طلب اور مصلحت اندیش امراء کی غداری اور صحیح فوجی قیادت کے فقدان کے باعث ملک و ملت کے سرفروش مجاہدین کی یہ کوشش برآور نہ ہو سکی۔ فاتح انگریز کی آتش انتقام بھڑک اٹھی اور جنگ آزادی کے سپاہیوں کو چن چن کر تہ تیغ کیا جانے لگا۔

چونکہ آزادی کا صور اسرافیل بھونکنے والے، جہاد کے نثار پر پہلی چوٹ لگانے والے میدان جنگ میں کفر و باطل کو لٹکانے والے اکثر و بیشتر علماء اہل سنت اور ان کے پیروکار تھے، اس لیے انتقام کے شعلے، انھیں کی طرف لپکے۔ انگریز کی آتش غضب انہی کے نثر من امن و عافیت کو خاکستر بناتی رہی۔ حریت کیش مجاہدین کو سزا دینے کے لیے جگہ جگہ فوجی عدالتیں قائم کی گئیں۔ چند سفاک اور خون آشام لوگوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ مروان نثر کو جھجھوں نے نوشی سے غلامی کی بیڑیاں پہننے سے انکار کر دیا تھا، جو چاہیں سزا دیں۔ ان کا سفاک مسلم عدل و انصاف کے سارے تقاضوں کو یکسر فراموش کر دیتا ہے، جلیل القدر فضلا کو، جن کی نظیر ماور گیتی بار بار پیدا نہیں کرتی۔ عبور دریا سے شور کی سزا دی جاتی ہے سینکڑوں کو جلا وطن کر دیا جاتا ہے ہزاروں علماء کرام کو درختوں کے تنوں سے باندھ کر گولی سے اڑا دیا جاتا ہے۔

فطرت بڑی کفایت شعار ہے دیدہ بینا اور عقل رسا کی نعمت ارزاں اور عام نہیں ہوتی۔ برسوں کی تنگ و دو کے بعد کہیں کوئی مرد حکیم بزم آرا ہوتا ہے۔

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات

تاز بزم عشق یک دانائے راز اید برون

ایک عالم ربانی کے اٹھ جانے سے جو خلا پیدا ہوتا ہے، اس کا پرہونا مشکل

ہوتا ہے، یہاں تو سینکڑوں نابغہ روزگار ہستیاں بڑی بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دی گئی تھیں۔ ان کی شہادت اور جلاوطنی سے ایک ناقابل تلافی اور ہولناک خلا کا پایا جانا ایک قدرتی امر تھا۔ قوم اپنے ذہنی ارتقاء، علمی نشوونما، تہذیبی اقدار کی حفاظت اور اپنے عقائد کے تحفظ کے لیے علماء کی محتاج ہوتی ہے جب تک

قوم میں ایسے مردانِ حُر موجود ہوتے ہیں۔ جن کی نگاہیں حقیقت شناس اور زبانیں حق گوئی میں بے باک ہوتی ہیں تو کوئی فتنہ قوم کو گزند نہیں پہنچا سکتا۔ ادھر کوئی فتنہ کھڑا ہوا، ادھر ان کی تلوار بے نیام ہوئی اور بجلی بن کر گری اور اس فتنہ کو خاک کا ڈھیر بنا دیا، لیکن جب ایسے نفوس سے قوم کی بزمِ خالی ہو جاتی ہے تو ہر بہروپتے کو کھل کھیلنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اور وہ اپنی نشاط پرانہ چابکدستی سے لوگوں کو اپنے دامنِ زور میں پھنسا لیتا ہے۔ جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد ملتِ اسلامیہ کو اس قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ اس طوفان نے ان دکھتے ہوئے ان گنت پرائیوٹوں کو گل کر دیا۔ جن سے رشد و ہدایت کی روشنی بھوٹ رہی تھی۔ ہر طرف مایوسی اور اداسی کے اندھیرے چھا گئے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

اہلِ نظر کو ایک بات ذہن نشین کرنی چاہیے کہ انگریز کا ہندوستان پر تسلط فوجی قوت کی بالادستی میں محدود نہ تھا، بلکہ ان کے ہم کاب ان کی مادی ترقی کی مبالغہ آمیز داستانیں بھی تھیں۔ ان کے ساتھ سائنس کے جدید اور تعجب خیز انکشافات بھی تھے۔ ان کے پاس صنعتی اور فنی محیر العقول ایجادات بھی تھیں۔ مزید برآں وہ ایک ملحدانہ فلسفہٴ حیات بھی اپنے ہمراہ لاتے تھے۔ ان میں سے

ہر ایک چیز مفتوح اور مغلوب قوم کے متاع ہوش و خرد کو لوٹ لینے کے لیے کافی تھی دشمن بڑے مہلک ہتھیاروں سے مسلح ہو کر یہاں آیا تھا اور یہاں اس کی دعوت مبارک کو قبول کرنے والے اور اس کی نخوت و رعونت کو خاک میں ملانے کا دم خم رکھنے والے یا تو اپنی پُر انوار مرقدوں میں آرام فرماتھے یا اسیرانِ زندانِ جہاں میدانِ خالی تھا انگریز نے اسلامی حکومت کا چراغ گل کرنے کے بعد انھیں دولتِ دین و ایمان سے محروم کرنے کا بھی عزم بالجبرم کر لیا، کیونکہ ملتِ صالح اور حکیمانہ قیادت سے محروم ہو چکی تھی۔ اس لیے بعض نوجوانوں کو، جن میں حکمت کی متانت کم اور جوش و خروش زیادہ ہوتا ہے۔ انگریز نے اپنے دامِ فریب میں آسانی سے اسیر کر لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایسی کھیب تیار ہو گئی، جن کے قلب و نظر کو اغیار کی عشوہ طرازیوں نے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ وہ بر ملا اسلامی تعلیمات کا استخفاف کرنے لگے دین کے اصول، دین کے مسلمات کا انکار ان کے لیے قطعاً کوئی اہم بات نہ رہی انھیں اپنے اسلامی تمدن سے بھی گھٹنے آنے لگی اپنے تاباں ماضی سے بھی نفرت کرنے لگے اور اپنے اسلافِ کرام سے قطع تعلق کرنے میں ہی اپنی عزت اور توقیر سمجھنے لگے اور خود خوشامد پسند کارسہ لیسوں کے سرخیل ہوتے ہوئے ان پیکر ان استغناء و استقامت پر تعلق پیشگی اور شاہ پرستی کی تہمت لگانے لگے۔ جن کی سیرِ چشمی اور بے نیازی کی قسم فرشتے بھی کھا سکتے ہیں۔

غرضیکہ ہر وہ چیز جو اسلام کے تقدس اور روحانی عظمت کی آئینہ دار تھی اس کو بے توقیر اور بے وقعت کر دینے کی کوشش کو خدمتِ اسلام کا نام دیا جانے لگا۔ عظمتِ اسلام کو ہدفِ طعن بنانے کی خدمت وہ نوجوان انجام دینے لگے، جو ملت کی امیدوں کا مرکز اور خوابوں کی تعبیر بننے کی اہمیت رکھتے تھے۔ شجرِ اسلام کو اکھاڑ پھینکنے



کے لیے وہ لوگ پیش پیش تھے، جن کے آباؤ اجداد نے اپنے خونِ ناب سے  
اسے سینچا تھا۔

غنی روزِ سیاہ پیرِ کنگال را تماشا کن

کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشم زلیخارا

نورِ دیدہ پیرِ کنگال، چشمِ زلیخا کو کیوں روشن کرنے لگا؟ اپنوں سے کٹ کر  
بیگانوں سے محبت کی بیگیں کیوں بڑھانی شروع کر دیں؟ ضروریاتِ دین اور مسلمات  
پر اس کا یقین کیوں متزلزل ہو گیا؟ آیاتِ قرآنی کی بیجا تاویلات بلکہ تحریفیات کی  
جرات اس میں کیوں پیدا ہو گئی؟ یہ سوالات اتنے غیر اہم نہیں ہیں کہ ان سے  
پہلو تہی کر کے انسان اگے گزر جائے، بلکہ یہ ہر مخلص مسلمان کے لیے دعوتِ فکر ہے  
جن پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنا ہمارا فرضِ اولیٰ ہے۔ میرے نزدیک اس کے کئی  
اسباب تھے۔ سیاسی ادبار کے بعد احساسِ کمتری، جدید فاتح قوم کی مادی قوت،  
علمی سر بلندی اور دل و نظر کو مسحور کر دینے والے افکار و نظریات اور ایسے علماء کا  
فقدان، جو ان عوامل و محرکات کی طغیانوں کے سامنے سدِ سکندری بن کر کھڑے  
ہونے کی ہمت رکھتے ہوں۔ ان کے علاوہ ایک ایسی تحریک جس نے مسلمانوں کے  
دل سے حضورِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے نقوش و صندلا دینے کے بعد  
محبتِ حبیب کبریا علیہ الطیب التیہ و النثار کے چشمہ فیاض کو گدلا کرنے کی مساعی  
کو دینِ حق کی صحیح خدمت خیال کر لیا۔ جب آنکھیں خاکِ مدینہ و نجف سے سرگیں  
نہ ہوں تو دانشِ فرنگ کے جلوے اسے برآسانی خیرہ کر لیتے ہیں۔ جب دل محبوب  
رب العالمین کے صہبائے عشق سے مرشار نہ ہو تو نفس کی ہوسناکیاں اسے برآسانی

بدست کر سکتی ہیں۔ جب ذہن کی لوح پر عظمتِ مصطفیٰ کا نقش جلی قلم سے مرقوم نہ ہو تو اس لوح پر آپ کوئی سا نقش بھی کندہ کر سکتے ہیں۔ جب سرورِ عالم و عالمیان سے بندہ مومن کا رشتہ عقیدت ٹوٹ جاتے تو اس کو ہر صیاد اپنا نچیر زبوں بنا سکتا ہے۔ سیاسی اڈار کے ساتھ ذہنی اور فکری اتحاد بھی پارہ پارہ ہونے لگا۔ وہ اساسِ محکم کمزور ہونے لگی، جس کے سہارے فقرِ اسلام حوادثِ دہر کا مقابلہ کرتا رہا یہاں تک کہ ایسی چیزیں بھی ظہور پذیر ہونے لگیں جن کا تصور تک بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ان میں سے ہی ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔

دین کے ایک ایک مقصد سے بر ملا غداری کی۔ جہاد کو حرام کر دیا۔ اتنی جسارت کے باوجود اسی ملت میں سے اسے اپنے حواری تلاش کرنے میں بھی کوئی دقت نہ ہوتی۔ جو سانحہ اسلام کی تیرہ صد سالہ تاریخ میں رونما نہیں ہوا تھا۔ وہ انگریزی اقتدار کی گرفت مضبوط ہوتے ہی وقوع پذیر ہو گیا۔

ان حالات میں بریلوی کے ایک معزز خاندان میں ایک روحِ ارجمند تشریف فرما ہوئی، جس کے مقدر میں ان تمام داخلی اور مذہبی نعمتوں سے نبرد آزما ہونا رقم تھا، اور پیکرِ حسن و جمال، مصدرِ جوہر و نوال، منبعِ فضل و درل اور مرکزِ عشق و محبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملت کا رشتہ عقیدت و نیاز مندی استوار کرنا تھا۔ رحمتِ الہی نے بڑی فیاضی سے انہیں بے نظیر صلاحیت سے بہرہ ور فرمایا تھا۔ بلا کا حافظہ، ذہن و قواد، طبع رسا، اقلیم فصاحت و بلاغ کی سروری، قدرت کے یہ وہ عطیے تھے جن میں سبقت تو کجا، کوئی ہمسر ہی کا وہ فی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی متداول اور غیر متداول علم و فن ایسا نہ تھا، جس میں آپ کی قابلیت کا لوہا نہ مانا جاتا ہو، علومِ دینیہ، فہت

حدیث، تفسیر وغیرہ میں آپ کو جو عدیم النظیر مہارت حاصل تھی، اس میں تو کسی کو کلام نہیں، لیکن ریاضی، تکسیر اور نجوم وغیرہ علوم جن کے مبادیات سے بھی اکثر فضلا بے خبر ہوتے ہیں، ان علوم میں آپ کے تبحر مہارت کا یہ عالم تھا کہ چوٹی کے ریاضی دان مشکل سے مشکل مسائل حل کرنے کے لیے آپ کی بارگاہ کا رخ کیا کرتے تھے اور جن مسائل کو وہ لایحل قرار دے چکے ہوتے، آپ اشاروں اشاروں میں حل کر کے انھیں محو حیرت کر دیتے۔

ڈاکٹر رضیا الدین مرحوم سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اپنے زمانے میں ریاضی کے مسلم ماہر تھے۔ حضرت مولانا شاہ سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ پروفیسر و مبادیات مسلم یونیورسٹی نے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب موصوف ریاضی کے چند مسائل میں متفکر ہیں اور وہ حضرت سے مل کر ان کا حل دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ اجازت ہو تو اشرف باریابی حاصل کریں۔

اعلیٰ حضرت نے بعد مسرت اجازت مرحمت فرمائی۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب چند روز بعد بریلی تشریف لے گئے۔ نماز عصر کا وقت تھا۔ نماز ادا ہوئی۔ اس کے بعد اعلیٰ حضرت اپنی مسند پر تشریف فرما ہوئے اور سلسلہ گفتگو شروع ہوا۔ دوران گفتگو اعلیٰ حضرت نے اپنا ایک قلمی رسالہ جس میں مثلث اور دائرے کے اشکال بنے ہوئے تھے، ڈاکٹر صاحب کے سامنے پیش کیا، جس کو دیکھتے ہی ڈاکٹر صاحب حیرت و استعجاب میں ڈوب گئے اور بولے کہ میں نے اس علم کو حاصل کرنے کے لیے بارہا غیر ممالک کے سفر کئے مگر یہ باتیں کہیں بھی حاصل نہ ہوئیں۔ میں تو اپنے آپ کو اس وقت طفل مکتب سمجھ رہا ہوں۔ مہربانی فرما کر یہ فرمائیں کہ اس فن میں آپ کا استاد کون ہے۔ اعلیٰ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ میرا

کوئی استاد نہیں ہے۔ میں نے اپنے والد ماجد علیہ الرحمۃ سے جمع، تفریق، ضرب، تقسیم کے چار قاعدے اس لیے سیکھ لیے تھے کہ ترکہ کے مسائل میں ان کی ضرورت پڑتی ہے شرح خمینی شروع کی تھی کہ میرے والد ماجد نے فرمایا کہ اس میں اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہو مصطفیٰ پیارے کی بارگاہ سے یہ علوم تم کو از خود سکھا دیتے جاؤ گے۔ چنانچہ یہ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں، مکان کی چار دیواری کے اندر بیٹھا خود ہی کرتا رہتا ہوں۔ یہ سب سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا کرم ہے۔ اس کے بعد سورۃ عشر یہ متوالیہ کا ذکر چل پڑا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا: بس صرف تیسری قوت تک کا سوال حل کیا جاسکتا ہے، اس پر اعلیٰ حضرت نے سید قناعت علی اور سید ایوب علی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ میں نے ان دونوں بچوں کو کچھ قاعدے سکھا دیتے ہیں۔ آپ انہیں جس قوت کا سوال دے دیں، انشاء اللہ تعالیٰ یہ بچے حل کر دیں گے۔ ڈاکٹر صاحب مجھ پر حیرت ہو کر دونوں بچوں کا منہ تیکنے لگے۔

یہ بے مثل فہم و ذکاوریہ بے نظیر علم و فضل اور یہ گونا گوں صلاحیتیں قدرت نے کسی خاص مقصد کی تکمیل کے لیے ارزاں فرمائی تھیں۔ پچنانچہ آپ نے پونے چودہ سال کی عمر میں تمام علوم کی تکمیل فرمائی اور اس کے بعد تدریس و تالیف و تصنیف و عطا و ارشاد، ریاضت و مجاہدات، ان فرائض کی انجام دہی میں مشغول ہوئے اور آخری دم تک بڑی جرأت، ہمت اور بے باکی کے ساتھ اسلام کے دفاع میں مصروف رہے، کوئی فتنہ ہو، اس نے کہیں سر اٹھایا ہو، احمد رضا کا قلم اس پر صاعقہ بن کر گرتا اور اسے خاک سیاہ بنا کر رکھ دیتا۔ مخالفت کی آندھیاں اٹھیں، بہتان تراشیوں کے طوفان اٹھسے، لیکن اسلام کا یہ نڈر اوزبے باک سپاہی حضور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا عاشق صادق بلا خوف لومہ لائم سینہ سپر رہا کسی موقع پر نہ اس میں لچک پیدا ہوئی اور نہ پائے استقامت ڈگمگایا۔ آپ کی ساری زندگی حضرت حسان کے اس شعر کی آئینہ دار رہی۔

فَإِنَّ ابْنِي وَ أَوْلَادِي وَ عِرْضِي

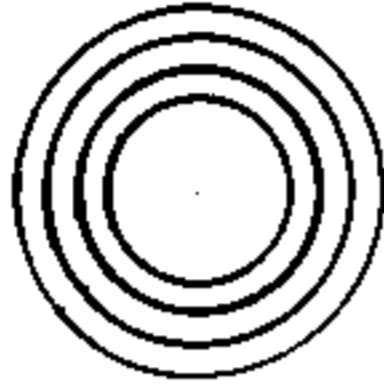
لِعِرْضِ مُحَمَّدٍ عَنْكُمْ وَقَاءِ

یہ درست ہے کہ آپ کا اصل میدان عمل دین اور علوم دین کی خدمت کرنا تھا۔ اور آپ کا طبعی رجحان سیاست کی طرف نہ تھا لیکن آپ کی ایمانی بصیرت اور مومنانہ فراست نے نہ آپ کو بعض لوگوں کی طرح انگریز کا حلقہ بگوش بننے دیا اور نہ کبھی ہندو کا دام زردار انھیں اپنی گرفت میں لے سکا۔ آپ کے قلب مومن نے یہ بھانپ لیا تھا کہ اسلامی غیرت اس ذلت کو برداشت نہیں کر سکتی کہ مومن گدا گروں کی طرح غیر مسلم حکومت سے مراعات اور عطیات کی درپوزہ گری کرے اور نہ اسے یہ گوارا ہے کہ لالہ جی کے مکر و فریب میں اسیر ہو کر ملت اسلامیہ کا مقدر اس بنیا کے ہاتھ میں دے دیں۔

جو شرفِ انسانیت سے بالکل بے بہرہ ہے، لیکن جب قائدِ اعظم علیہ الرحمۃ کی قیادت میں ملت مسلمہ نے پاکستان کو اپنی منزلِ مقصود قرار دیا تو یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ آپ کے مکتبِ فکر سے وابستہ جتنے علماء و مشائخِ اساتذہ و طلباء مدارس و جانفعا ہیں ان میں سب نے بلا استثناء اپنی کوششیں پاکستان کے حصول کے لیے وقف کر دیں۔ اور اس کے لیے کسی بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کیا، جس وقت پاکستان کا نام لینا ہزاروں مشکلات کو دعوت دینے کے مترادف تھا جب کہ میدانِ سیاست کے بڑے بڑے تجربہ کار سپاہی پاکستان کے تصور سے کانپ اٹھتے تھے جب کہ بڑے بڑے روسا اور نواب پاکستان کی حمایت میں ایک لفظ کہنا خودکشی کے مترادف سمجھتے تھے، جب کہ بڑے بڑے مدارس کے فضلا قیامِ پاکستان کو اسلام کے مزاج کے خلاف یقین کرتے تھے۔ اس وقت ایک اعلیٰ حضرت بریلوی کا مکتبِ فکر تھا، جس کے وابستگان نے چٹاگانگ سے پشاور تک اور سلٹ سے کراچی تک پاکستان کی حمایت کا اعلان کیا۔ کیا کوئی اس بات سے انکار کر سکتا ہے کہ یہ آپ کی ایمانی بصیرت کا فیضان نہ تھا؟ یقیناً یہ آپ کے فیضِ نظر کی برکت تھی۔ یقیناً یہ آپ کے نورِ نظر کا اجالا تھا، جس نے شک و شبہ اور تذبذب اور تردد کے سارے پردے چاک کر دیئے۔

آپ کی زندگی کے یہ چند سال، جن کا گوشہ گوشہ علم و عمل کے نور سے منور ہے جن کا لمحہ لمحہ ذکرِ خدا اور یادِ مصطفیٰ علیہ اہل التوحیۃ و التناہ سے معمور ہے، جو دو ہزار تالیفات کی تصنیف سے مشرف ہے، جو پند و موعظت اور ذکر و رشاد کی مفلحوں سے گونج رہا ہے، جو پھیلا تو کائنات کی پہنائیوں کو شرمسار کرنا گیا اور جو سہما تو عشقِ مصطفیٰ بن کر

رہ گیا یہی آپ کا ایمان تھا کہ حُبِ حبیبِ کبریا صلی اللہ علیہ وسلم جان اور روح وین  
 ہے۔ اس کے پرچار میں آپ نے اپنی ساری عمر صرف کر دی۔ اس کے لیے اپنی  
 ساری صلاحیتیں وقف کر دیں۔



کتابت:  
 میاں عبد اللہ  
 نوشہرہ ورکان  
 (گوجرانوالہ)









